مجلہ حقوق محفوظ ہیں

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ۔ سورۂ توبہ آیت ۱۰۵

اور کہہ دو تم عمل کرتے رہو تمہارے اعمال کو خدا اور رسول اور صاحبانِ ایمان دیکھ رہے ہیں

حیاتِ خیر البشر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مُصنّف

محمد مجتبیٰ طاہر

ناشر

سیّد صغیر حیدر صغیر

۵/۱۵۹۴ ڈرگ کالونی کراچی

ہدیہ بیس روپے ۲۰

محفوظ ہیں

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ (سورہ توبہ آیت ۱۰۵)

اور کہہ دو تم عمل کرتے رہو تمہارے اعمال کو خدا اور رسول اور صاحبانِ ایمان دیکھ رہے ہیں

حیاتِ خیرُ البشر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مُصنّفہ

محمد مجتبیٰ طاہر

ناشر

سید صغیر حیدر صغیر

۵/۱۵۹۴ ڈرگ کالونی کراچی

ہدیہ ۲۰ بیس روپے

اِنتساب

سرکارِ دو عالم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے اُن غلاموں کے نام جو صبح و شام گواہی دیتے ہیں کہ "محمّد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم، اللہ کے بندے، اور رسول ہیں"

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا

ترے حیات کے مرکز سے دور رہتا ہے

باسمہٖ سبحانہٗ

عرضِ ناشر

از حاجی سیّد صغیر حیدر صاحب صغیرؔ
نمبر ۵/۱۵۹۴ ڈرگ کالونی کراچی ۲۵

تاریخی مشاہدے میں یہ اَمر ثابت ہے کہ منکرِ اسلام یعنی کفّار، یہودی و نصرانی ہم مسلمانوں کے رسُول مقبول کی توہین اور کردار کُشی کرتے رہے مگر اُس زمانے کے حسّاس اور باعلم اہلِ قلم نے فوراً ان کا مُنہ توڑ جواب دیا اور اُن کی زبانیں بند کر دیں۔ مگر فی زمانہ پاکستان جیسے مُلک میں جسے اِسلام کا قلعہ کہا جاتا ہے، اُمّتِ مسلمہ میں ہی ایک ایسا بدبخت گروہ پیدا ہوگیا ہے جو اسلام اور رسُولِ اسلام کا صریحاً دشمن بن کر اُبھرا ہے۔ جو اپنا زورِ قلم توہینِ رسُول مقبول، توہینِ آلِ رسُول اور آیاتِ قرآنی کی غلط اور مَن مانی تاویلات کر کے عام مسلمانوں کو گمراہ کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ لیکن فی زمانہ اہلِ اسلام کے درمیان نہ معلوم کیوں اَب تک گہری خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ البتّہ ایک مردِ مسلم محمّد مجتبیٰ طاہر سلّمہٗ ہیں جو اُن کی ان بدترین جرأتوں کا جواب ایک عرصہ سے دیتے آرہے ہیں۔ اور یہ کتاب جو آپ کے پیشِ نظر ہے اِسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

محمّد مجتبیٰ طاہر سلّمہٗ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ اس لئے کہ کئی سال سے موصوف کے دینی خدمات کا نمونہ منظرِ عام پر مسلسل آتا رہا ہے۔ موصوف بہت اچھے علمی صلاحیت کے حامل ہیں۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا اندازِ فکر بھی اچھوتا اور دلکش ہے۔ آج کے ہیجانی دَور میں ایسے صاحبِ قلم نوجوانوں کی سخت ضرورت ہے۔

رَبّ العزّت انھیں اس نیک کام پر مستقیم رکھے اور موصوف کو مکمّل صحّت و تندرستی اَور توفیقات کے ساتھ حیات طولانی عطا فرمائے (آمین)۔

اِنتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ آج کے باشعور اَور روشن خیال دَور میں بھی اِسلام اَور اس کے رسُولِ خاتم کے خلاف ویسی ہی مکروہ اَور نازیبا سازشیں ہو رہی ہیں جیسی کہ دَورِ جاہلیّت میں ہو چکی ہیں۔ تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آج بھی منافق اَور دشمنانِ رسُول امّتِ مسلمہ کے درمیان موجود ہیں۔ اور ان بیدینوں کے دِلوں میں کافرانہ جرأت اور موروثی عداوت بعثتِ رسُولِ کریم کے زمانے سے نسلاً بعد نسلاً آج تک چلی آرہی ہے۔ اور اس دن سے اَب تک رسُولِ اکرم سے انتقام لینے کا کافرانہ جذبہ ان کے دلوں میں مارِ سیاہ کی طرح پھنکاریں مار رہا ہے۔

کیا یہ اِنتہائی بدقسمتی نہیں ہے کہ یہ گروہ بظاہر ایک طرف رسُول کا کلمہ بھی پڑھتا ہے، ان کے بتائے ہوئے قانون کو قانونِ الٰہی، صراطِ مستقیم، اُصولِ اِسلام اور ذریعۂ نجات اخروی بھی کہتا ہے اَور دوسری طرف رسُول مقبول کو معاذ اللہ گناہگار، گمراہ، جھوٹا اور مُردہ بھی تصوّر کرتا ہے۔ کیا یہ گروہ منافق، دشمنِ رسُول اَور دشمنِ اِسلام نہیں ہے۔

موصوف نے ان کی ان مُوشگافیوں کا جَواب قرآنِ کریم اَور اَحادیث کی روشنی میں بہت ہی خوب اَور مُدلّل دیا ہے۔ اَور حضوؐرِ پرنُور کی حقیقی حیثیت جو خداوندِ قدّوس کے پیشِ نظر ہے وَاضح کر دیا ہے۔ یقیناً حضوؐرِ اکرم کی ذاتِ گرامی اَرفع و اَعلیٰ ہے۔ اَور اس قدر اَعلیٰ ہے کہ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ع

بعد اَز خدا بُزرگ توئی قصّہ مختصر

مجھے اُمیّد قوی ہے کہ آپ بھی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میرے ہم خیال ہونگے اَور اس دشمنِ دیں گروہ کے خلاف کم اَز کم جہاد بِالقلم کو واجب سمجھیں گے۔ یہ کتاب آپ کے لئے دعوتِ فکر بھی اور دعوتِ جہاد بھی ہے۔ کیونکہ جب دین پر بے دینوں کی یلغار ہونے

لگے تو ہر مومن کا فریضہ ہے کہ دین کی حفاظت کی خاطر نصرت کے لئے مستعد ہو جائے، اور بیدھڑک آگے بڑھ جائے۔ یہ گمراہ طبقہ جس طرح اپنے بیدین افکار کی اشاعت کر کے اُمّتِ مسلمہ کو گمراہی کی طرف لے جانے کی ناپاک کوششیں کر رہا ہے اس سے خدارا اپنا دامن بچائیں اور ان سے نبرد آزما ہو جائیں۔ یہ اسلام کی تباہی کا سامان ہو رہا ہے، خبردار ہو جائیں اور ساتھ ہی اس بات کا عہد کریں کہ :-

ہم — دُنیا کو اِسلام سے روشناس کرائیں گے۔ اور خود اپنے معاشرے میں اِسلام کے صحیح خدوخال کو ترویج کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔

ہم — تعصّب اور تنگ نظری سے بالاتر رہ کر حق اور اسلام کی حمایت کے لئے کام کرینگے اور اسی بنیاد پر مسلمان کے باہمی اِتّحاد کے لئے دِل و جان سے کوشاں رہیں گے۔

ہم — کسی کافر یا مُسلم نما فاسق و فاجر، ظالم و منافق شخص یا طبقے کو مسلمانوں کے درمیان اور اِسلامی مملکت پاکستان میں تفرقہ اور فاسد افکار کو پھیلانے کی ہرگز اجازت نہ دینگے۔

★ خدا ہم لوگوں کو معرفت و محبّتِ رسُول کی صحیح توفیقات میں اضافہ فرمائے اور متّحدہ طور پر عظمتِ اِسلام، عظمت و عصمت نبوی اور اصحاب با وفا کی صحیح سیرت و خدمات اِسلام کی نشر و اشاعت اور ان پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیتوں میں اِضافہ فرمائے۔

آخر میں مَیں تمام قارئین کرام سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ خود بھی اس کتاب کو پڑھیں اور اپنے اعزّاء و احباب کو بھی جو دینی ذوق رکھتے ہیں، پڑھنے کے لئے تحفتہً پیش کریں۔

(ناچیز)

سیّد صغیر حیدر صغیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

اما بعد! فاضل ہمعصر جناب محمد مجتبیٰ طاہر صاحب، جس علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ زیرِ نظر تحریر کے علاوہ بھی موصوف کی کئی تحریریں نظر سے گذریں۔ یہ تمام تحریریں غالباً امیر المومنینؑ کے اس ارشاد کی تعمیل ہیں کہ "پتھر جدھر سے آئے اُدھر ہی لوٹا دو کیونکہ شر کا ازالہ اسی طرح ممکن ہے۔" اِس دَور میں جس طرح رسُول و آلِ رسُول اور اصحاب کرام کی توہین و تضحیک ہو رہی ہے وہ صاحبانِ علم و معرفت سے پوشیدہ نہیں۔ جسے پڑھ کر صاحبانِ دین اور عاشقانِ رسُول انتہائی روحانی کرب و اذیت میں مبتلا ہیں، لیکن اِس امر سے کسی حد تک دین و دیانت اور ایمان و یقین کو تقویت ہے کہ موجودہ حکومت نے نظامِ اسلام رائج کرنے کا عزم راسخ کر رکھا ہے اور ہر فرقہ کو تحریر و تقریر کی مکمل آزادی دے رکھی ہے تاکہ مسلمان کچھ تلخیوں کے بعد کسی مثبت نتیجہ پر پہونچ سکیں۔

محترم محمد مجتبیٰ صاحب نے حیاتِ خیر البشر میں جس انداز سے استدلال کیا ہے اور جس محنت سے اپنی تحریر کو آیاتِ قرآنی کی روشنی میں واضح کیا ہے صاحبانِ علم و فہم خود ہی اس کا اندازہ کر لیں گے۔ قرآنِ حکیم سے جتنے استدلال اس ضمن میں کئے گئے ہیں وہ سب کے سب اپنی جگہ پر محکم ہیں۔ لیکن اس خود پیدا کردہ مرض کا کیا علاج ہے جس کے متعلق قرآن پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ لایعلم تاویلہ الا اللہ و الراسخون فی العلم۔ اسکے باوجود ملت عمداً خود ساختہ اور غلط تاویلات قرآنیہ میں اُلجھ کر گمراہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جیساکہ قرآن خود اس امر کا مُدّعی ہے کہ جہاں اکثر کی قرآن نے ہدایت کی ہے وہیں کثرت ایسے لوگوں کی بھی

ہے جو گمراہ ہو گئے - اور یہ گمراہ ہونے والے وہی لوگ ہیں جو آیاتِ قرآنیہ کی تاویل اپنے ناقص علم سے کرتے ہیں جبکہ اس امر کی نہ ہی انھیں اجازت اور نہ ہی وہ اس کے مجاز ہیں۔

وجودِ پیغمبرِ خاتمؐ کا جہاں تک تعلق ہے تو پروردگارِ عالم نے اسے اپنی صفت عالمیت میں شامل کر رکھا ہے جیسا کہ اپنے بارے میں ارشاد فرمایا کہ میں عالمین کا ربّ ہوں - اور حضور سرکارِ دوعالمؐ کو " رحمۃ للعالمین " عالمین کے لئے رحمت قرار دیا " یعنی جب تک عالمین قائم و دائم ہیں " خداوندِ قدّوس ربّ العالمین ہے " پیغمبرؐ " رحمۃ للعالمین ہیں - اگر بفرض محال یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ رسوؐل کی صرف ۶۳ سالہ ہی حیات تھی تو پھر اس عالم یعنی ۱۱ھ میں کوئی رحمت نہیں تو پروردگار کے قول میں نقص ماننا پڑے گا - اور یہ شانِ ربوبیّت سے بعید ہے کہ ایک ایسی حیات جو صرف ۶۳ سال ہی کے لئے تھی " اسے ہمیشہ کے واسطے رحمت قرار دے دیا - اس لئے یہ قطعی طور پر ماننا پڑے گا کہ جس طرح عالم تکوین کی ابتداء حضور سرکارِ دوعالم سے ہوئی ہے اسی طرح عالمین کا آخری وجود بھی سرکارِ دوعالم ہی ہوں گے۔

چنانچہ حیاتِ پیغمبرؐ کے لئے قرآن مجید کی اس آیت میں غور و فکر کریں کہ (قُلِ اعملوا فسیرالله عملکم ورسوله والمومنون ط سورۂ توبہ " آیت ۱۰۴) تم عمل کرو اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور اس کا رسوؐل تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور صاحبانِ ایمان تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں - ظاہر ہے کہ یہ اعلانِ قرآنی ہر زمانے کے لئے اعمال اُمّت کے بارے میں ہے - اور جس طرح خُدا ہر زمانے میں موجود ہے اور مخلوق کے اعمال کا جائزہ لے رہا ہے - تو جب سے بھی عمل کرنے والوں کا وجود ثابت ہوتا ہے اور جس زمانے تک لوگ عمل کرتے رہیں گے - آیت بتلا رہی ہے کہ پروردگار اکیلا ہی نگران نہیں ہے بلکہ اس کا رسوؐل اور صاحبانِ ایمان بھی خُدا و رسوؐل کے ساتھ ہمارے اعمال کے نگراں ہیں - اور اس آیت سے رسوؐل کی حیات کے ساتھ مومنین کی حیات بھی ثابت ہے - لیکن اگر بفرض محال یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ رسوؐل ہم جیسے بشر تھے اور انھیں موت آگئی (مَعاذ اللہ) تو پھر کلمہ میں تھوڑی سی تبدیلی

ضرور کرنا پڑے گی۔ اور پھر ہم یہ نہ کہہ سکیں گے کہ "نہیں ہے معبود سوائے خدا کے، اور محمدؐ، خدا کے رسول ہیں" بلکہ یوں کہنا ہوگا کہ "محمدؐ، خدا کے رسول تھے" جس کی ابھی تک خارجیوں اور ناصبیوں میں جرأت وجسارت نہ ہو سکی اور یہ دائرۂ اسلام میں رہتے ہوئے ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ ہم جس نظامِ شمسی میں رہ رہے ہیں یہ بھی ایک عالم ہی ہے اور یہ بات خالقِ کائنات جانتا ہے کہ اس نے ایسے ایسے کتنے عالم خلق کئے ہیں۔ اور رسولؐ چونکہ رحمۃ للعالمین ہیں اس لئے تمام عالم آپ کی قلمرو میں شامل ہیں۔ جس طرح ایک حاکم وقت اپنی قلمرو میں واقع ایک شہر سے دوسرے شہر میں آجاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پہلے شہر والے اسے مردہ سمجھ بیٹھیں۔ اور یہ سمجھ لیں کہ چونکہ وہ اب دوسرے شہر میں ہے اس لئے اسے اب ہماری کوئی خبر نہیں اور وہ ہم سے غافل ہے۔ اسی طرح سرکارِ دو عالم ایک عالم سے دوسرے عالم میں تشریف لے جاتے ہیں۔ جیسا کہ معراج کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ نبویؐ حیثیت اور وجود نورانی کے حامل ہونے کے سبب آپؐ کا یہ سفرِ حیات آپکی موت یا بے خبری پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ انتقال نورانیت ہے جس طرح آفتاب ایک افق سے نہاں ہوتا ہے تو دوسرے افق پر نمایاں اور منور رہتا ہے۔ آفتاب کا یہ سفر انتقال منازل ہے موت نہیں۔

میں اس دعا پر اپنی اس تمہید کو ختم کرتا ہوں کہ پروردگارِ عالم جملہ پڑھنے والوں کو اس کتاب سے کماحقہٗ فیضیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور بھائی محمد مجتبیٰ صاحب کی خدمت کو قبول فرمائے اور ان کی توفیقات وصلاحیتِ علمی میں اور اضافہ فرمائے + "آمین ثم آمین"

محتاج الدعاء

ڈاکٹر ظہیر الحسن مرزا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

تاریخِ اسلام یا اقتدارِ سیاسی کی ابتداء

انسان اپنے ارادے اور عقل و فکر کے استعمال میں فطرتاً آزاد اور با اختیار پیدا ہوا ہے۔ انسانی عقل و فکر ہمیشہ سے اس کوشش میں مصروف رہی ہے کہ آج وہ جس منزل و مقام پر ہے کل وہ اس سے بلند و عظیم منزلت و درجات پر فائز ہو جائے۔ انسان اپنی اس خدا داد فطری صلاحیتوں کی بناء پر نہ صرف دُنیا کی مادّی ترقّیوں تک محدود ہے بلکہ مذہبی اور روحانی درجات و منزلت کو بھی وہ علم و عرفان، زُہد و تقویٰ اور ریاضت و کسب کے ذریعہ حاصل کر لینے میں مصروف ہے مگر انسانی عقل و فکر کی یہ بتدریج بڑھتی ہوئی ترقّی کے حدود و منازل اور حقِ تصرّفات و اختیارات میں یقیناً کچھ ایسے مقامات بھی ہیں جو اس کے اختیار اور دسترس سے باہر ہیں۔ اور وہ نمائندگی و سفارتِ الٰہیہ ہے (یعنی نبوّت و امامت و ولایتِ الٰہیہ ہے۔) کہ اپنے بندوں میں سے پروردگار جسے پسند کرتا ہے، عطا کرتا ہے۔ اگر تمام دُنیا کے افراد متّحد و متّفق ہو کر کسی انسان کو نبی، رسول، امام، ولی بنانا چاہیں بھی تو نہیں بنا سکتے اور اگر بنا بھی لیں تو وہ ان کا اپنا حاکم ہوگا، پروردگار کا نمائندہ نہیں۔ وہ نبی و رسول اور ولی و ہادی نہیں ہو سکتا۔ اس کا بنایا ہوا قانون، آئینِ مملکت و سلطنت تو ہو سکتا ہے لیکن اُسے شریعتِ الٰہیہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ پروردگارِ عالم کے نمائندے، اور انسانوں میں خود ساختہ یا منتخب کردہ نمائندے دونوں ہی بشر ہوتے ہیں، جنّ و ملک نہیں۔

جن میں ایک حق پر اور دوسرا باطل پر ہوتا ہے۔ جبکہ دونوں ہی انسانی معاشرے کی اصلاح کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ انہی دونوں نظریات کے تصادم اور باہمی اختلافات و کشمکش کی وجہ سے قومیں اور فرقے وجود میں آئے۔ جن میں ایک طرف تو خدا کے حقیقی بندے ہیں اور دوسری طرف تخت و تاج کے غلام۔ جن کے مابین متعدد معرکہ آرائیاں ہوئیں، اور تاریخ کی کتابیں ضخیم سے ضخیم تر ہوتی چلی گئیں۔ ایک طرف حق پرست تھے، جو حق کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو خلوص دل سے تیار تھے۔ اور دوسری طرف اقتدار پرست گروہ تھا جو اپنے اقتدار، منفعت ذاتی، جاہ و حشم اور دولت و ثروت کی خاطر خانۂ خدا کو بھی منہدم اور مسمار کر دینے پر کوئی حیا و شرم محسوس نہیں کرتا تھا۔

تاریخ انسانیت، انسانی فکر و شعور اور کردار و عمل کا ایک ناقابل انکار مرقّع ہے جسمیں حق بھی ہے اور باطل بھی۔ ہدایت بھی ہے، گمراہی بھی۔ جس میں پروردگار عالم کی اطاعت و بندگی کے تذکرے بھی ہیں۔ اور اس سے بغاوت و سرکشی کے واقعات بھی۔ غم و اندوہ کے آنسو بھی ہیں اور خوشی و شادمانی کے رقص شیطانی بھی۔ انبیاء و مرسلین کے حکمت آمیز کارنامے بھی ہیں۔ اور صاحبانِ اقتدار کی رنگین و ہوش ربا داستانیں بھی۔ اگر انسان صحتمند فکر اور پختہ دینی شعور کے بغیر تاریخ انسانیت کا مطالعہ کرے گا تو اس کا گمراہ ہو جانا یقینی ہے۔ اس لئے کہ صاحبانِ اقتدار نے آئینۂ تاریخ کو اتنا دھندلا کر دیا ہے کہ حق پر کبھی باطل کا گمان ہوتا ہے تو کبھی باطل ہی حق نظر آتا ہے۔ خصوصاً انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کے ہادیانہ کردار اور عمل کو اتنا مسخ کر دیا گیا ہے کہ انکے کردار و عمل سے صحیح دینی نتیجہ بآسانی اخذ نہیں ہو سکتا۔ صاحبانِ اقتدار نے دین اور دین پرستوں کا بھرپور طریقہ پر استحصال کیا ہے۔ اقتدار پرستوں نے دین کے مقدس لبادے کو اوڑھ کر کچھ ایسے انداز میں ملوکیت کا تحفّظ اور اس کو رواج دیا کہ لوگ فرمان شاہی کو شریعت اور صاحبانِ اقتدار کو دینی رہبر سمجھ بیٹھے۔ جبکہ ملوکیت کا وجود ہی دین سے بغاوت کا نتیجہ تھا۔

صاحبانِ تخت و تاج نے تحفّظ اقتدار کی خاطر نہ صرف یہ کہ تاریخ کے روئے زیبا کو مسخ

کردیا بلکہ ہزاروں جعلی حدیثیں اپنے مقصد اور تحفظِ اقتدار کی خاطر وضع کروا ڈالیں۔ اور قرآن کے معنی و مطالب اور مصداق کی من مانی طور پر تاویلیں بھی کروائیں۔ چنانچہ ان بیدین جذبات اور جعلسازیوں سے اُمّت کو محفوظ رکھنے کی خاطر علماءِ اسلام نے فنِّ رجال کی اہمیّت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی بناء ڈالی۔ حق پرستوں اور اقتدار پرستوں کے مابین اختلافات وکشمکش اور جدال و قتال کے سلسلے کی وجہ سے اسلام میں فرقوں نے وجود پایا اور پھر انہیں سر اٹھانے کا موقع ملا۔ لیکن اقتدار پرست ذہنیتوں کی یہ تمام سحر انگیزیاں اور فتنہ سامانیاں اب ریت کی دیوار کی طرح منہدم ہوتی چلی جارہی ہیں۔ جسے انھوں نے تاریخِ اسلام کا نام دیا تھا وہ درحقیقت سلاطین و شہنشاہیت کی تاریخ ہے جو دورِ جاہلیّت سے شروع ہوکر ۱۹۲۴ء میں ترکستان میں ختم ہوگئی۔ جبکہ تاریخِ اسلام مخلوقِ اوّل، نورِ اوّل، عقلِ اوّل سے شروع ہوتی ہے اور اسے عرصۂ محشر تک جانا ہے۔

امام الانبیاء سرکارِ دو عالم کی جس طرح تاریخ و حدیث میں کردار کشی کی گئی اور فی زمانہ کی جارہی ہے اور جس طرح کا کردار حضور سرکارِ رسالتمآب کی جانب منسوب کیا جارہا ہے اس کی مثال تو ملّت کے کسی عام مذہبی پیشوا میں بھی نہیں ملتی۔ ان تمام بے دین اختراعات و تذکرے کا احاطہ میں اس مختصر سے رسالہ میں نہیں کرسکتا۔ کسی اور موقع پر انشاء اللہ سیر حاصل بحث ہوگی۔ فی الحال یہاں پر سورۂ فتح کی ابتدائی آیتوں کا ترجمہ اقتدار پرست ذہنیتوں کی خرافات واختراعات اور ان کی معرفتِ دینی کو ملاحظہ فرمائیں "انّا فتحنا لك فتحًا مبينا ٥ ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تأخر ويتم نعمته عليك ويهديك صراطًا مستقيما ٥ وينصرك الله نصرًا عزيزًا ط (ترجمہ) بیشک میں نے آپ کو روشن فتح دی، تاکہ اللہ بخشدے آپکے اگلے اور پچھلے گناہ اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کردے اور سیدھے راستے کی ہدایت کرے۔ اور خدا تمہاری زبردست نصرت کرے۔ (سورۂ فتح آیات "۱ تا ۳")۔

تاریخِ اسلام کو دورِ جاہلیت سے شروع کرنے کی پُرفریب غرض وغایت تو قارئین کو سورۂ فتح

کی مندرجہ بالا آیات کے ترجمے سے واضح ہوگئی ہوگی کہ (جب رسولؐ خاتم کے ماضی کے اور آئندہ کے ہونے والے گناہ خدا نے معاف کر دیئے۔ تو پھر بنی اُمیّہ اور بنی عباس کے صاحبانِ تخت و تاج اگر فسق و فجور اور گناہوں کے مرتکب ہوئے تو کیا ہوا جبکہ رسولؐ بھی گناہگار تھے معاذ اللہ جیسے پروردگار نے اپنے نبی کے گناہوں کو معاف کر دیا تو پھر یہ صاحبانِ اقتدار کی بے راہ روی اور فِسق و فجور قابلِ معافی کیوں نہ ہوں گے۔ اُمّت کو ان کی گرفت اور ان پر اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں جس طرح رسولؐ اکرم جیسی شخصیت تقاضائے بشری سے مجبور تھی۔ صاحبانِ تخت و تاج بھی تو آخر بشر ہی تھے، کوئی فرشتے تو نہ تھے)۔ یہ ترجمہ عصمتِ انبیاء اور مزاجِ نبوّت سے کتنا مخالف ہے۔ انبیاء کرام جو انسانیت کی ہدایت اور اسے گناہوں سے محفوظ کرنے کی خاطر مبعوث فرمائے گئے۔ خود انھیں ہی اس ترجمہ میں گناہگار ثابت کرنے کی ناپاک جسارت کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالحق محدّث دہلوی صاحب کا ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"بے شک ہم نے تمہارے لئے روشن فتح فرما دی، تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے، تمہارے اگلوں کے اور پچھلوں کے اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دے۔ اور تمہیں سیدھی راہ دکھائے اور تمہاری، اللہ زبردست مدد فرمائے (مدارج النبوۃ جلد ا" صـ ۱۵۳)"۔ (شیعی مسلک کا ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیں:۔ "بے شک ہم نے آپ کو روشن فتح دی، تاکہ بخش دے اللہ تیری (اُمّت کے) گناہ جو پہلے کئے ہیں اور جو بعد کے ہیں، اور تیرے اوپر اپنی نعمتوں کو تمام کرے اور تجھے صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھے اور خدا تمہاری زبردست مدد کرے" (از مولانا فرمان علی صاحب)۔

یہ تینؔ ترجمے ہیں جن میں سے دوؔ تو رسولؐ کریم کی طرف گناہ کی قطعی نسبت نہیں دیتے۔ لیکن پہلا ترجمہ اس اقتدار پرست ذہنیت کا ہے جس کا مورثِ اعلیٰ ابوسفیان تھا جو مرتے دم تک شہنشاہیت اور نبوّت کے فرق کو نہ سمجھ سکا۔ پھر اس کی اولاد اسلام اور نورانیت و روحانیت نبوی کو کیا خاک سمجھ پاتی۔ قارئین نے دیکھا کہ اس خارجیت نے کس جرأت و جسارت بے دینی کے ساتھ اُمّت کے گناہوں کو نبی کے سر تھوپ دینے کی ناپاک کوشش کی ہے۔ چنانچہ اسوقت

جو قرآن کے ترجمے خارجیت کے مسلک سے ہو رہے ہیں اس میں اس آیت کا ترجمہ کچھ اس طرح سے کیا جا رہا ہے (۱) نبوّت سے پہلے (دورِ جاہلیّت کے گناہ)۔(۲) فتح مکّہ سے پہلے اور فتح مکّہ کے بعد کے گناہ۔ (۳) جو ہو چکے اور جو ہونے والے ہیں ان کے متعلق مغفرت کا وعدہ۔ (۴) پچھلے گناہوں سے مراد حضرت حوّا اور حضرت آدمؑ کے گناہ ہیں اور بعد والے گناہ سے حضورؐ کی اُمّت کے گناہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ اسلام تمام انبیاءِ کرام کو معصوم بتاتا ہے اور ہر قسم کے گناہانِ صغیرہ اور کبیرہ سے مبرّا قرار دیتا ہے۔ پھر خارجیت کے اس دعویٰ کو کیونکر تسلیم کیا جائے کہ آنحضرتؐ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے پہلے آپ وہ گناہ تو ثابت کریں جس کی نسبت آنحضرتؐ کی طرف (معاذاللہ) دی جاسکتی ہے پھر گفتگو معافیِ گناہ کی ہوگی۔ اِس ضمن میں عقلی اور قرآنی دلیل تو یہ ہے کہ ہر وہ فعل جو رسُولؐ بجالائے اُمّت کو اُس کی اتّباع و اطاعت کا حکم ہے کہ یہی اطاعتِ خدا ہے۔ تو نبیؐ سے جتنے بھی اعمال و افعال صادر ہوئے وہ سب مرضیِ الٰہی کے تحت تھے جسے شریعت الٰہیّہ کا درجہ حاصل ہے۔ اور بمصداق قرآن، رسُولؐ کی گفتار اور کردار تمام شریعت الٰہیّہ کا درجہ رکھتے ہیں اور ہر حالت میں اُمّت پر رسُولؐ کی اطاعت فرض ہے تو پھر اُمّت کو یہ علم اور اس کا احساس کیونکر ہوا کہ یہاں پر نبیؐ سے (معاذاللہ) گناہ سرزد ہوا۔ جبکہ رسُولؐ کی سیرت، کردار و عمل اور اقوال و ارشاد ہر حالت میں مرضیِ الٰہی کے تابع ہے اور یہی شریعتِ الٰہیّہ ہے۔ لیکن بزعمِ خارجیت رسُولؐ گناہگار رہے۔ تو یہ سارا الزام اور نقص خود پروردگارِ عالم پر عائد ہوتا ہے کہ ایک گناہگار کو ہدایت و رہبری کے منصب پر فائز کر دیا۔ اور پھر اس کے بعد خود دینِ اسلام اور آئینِ شریعت بھی مشکوک و مشتبہ اور ناقابلِ اعتبار ہو کر رہ جائیں گے چنانچہ اس آیت کی تفسیر و تشریح حضرت شیخ محدّث دہلوی صاحب اِس طرح فرماتے ہیں کہ:۔

اِس آیت کے ضمن میں ایک قول یہ ہے کہ اِس سے مراد وہ چیز ہے جو آپؐ کی بعثتِ نبوّت سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں واقع ہوئی۔ امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ قول

مردود ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم کو جاہلیت کی ہوا تک نہیں لگی۔ اور یہ کہ وہ قبل از نبوت اور بعد از نبوت معصوم ہیں۔ دوسرے یہ کہ مجاہد نے جو کہا ہے کہ ماتقدم قضیہ ماریہ میں اور ماتاخر حضرت زید کی زوجہ سے عقد کا ارادہ فرمانے کے بارے میں ہے۔ امام سبکی فرماتے ہیں یہ قولِ باطل ہے۔ اس لئے کہ قضیہ ماریہ اور حضرت زید کی زوجہ کے بارے میں اصلاً ذنب ہے ہی نہیں۔ جو ایسا اعتقاد رکھتا ہے غلطی کرتا ہے۔ زمخشری نے "کشاف" میں اور "تبعیت" میں بیضاوی نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام لغزشیں ہیں جو محلِ عتاب ہیں۔ امام سبکی فرماتے ہیں۔ یہ قول بھی مردود ہے۔ اس لئے کہ انبیاء علیہ السلام کی عصمت ثابت ہے۔ البتہ ایسے صغائر جو اُن کے مرتبے اور شان کو کم نہ کرنے والے ہوں اس میں اختلاف ہے۔ معتزلہ اور بہت سے غیر معتزلہ اس کے جواز کی طرف گئے ہیں اور بعض کے نزدیک مسلکِ مختار ممانعت ہے۔ اس لئے کہ انبیاءِ کرام کے قول و فعل کی پیروی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا ان سے ایسا فعل کیونکر صادر ہو سکتا ہے جو ناشائستہ اور ناسزا ہو۔ اور حشویہ حضرات انبیاء پر جرأت و جسارت کرتے ہیں۔ اور ان پر مطلقاً بغیر کسی قید کے جائز رکھنے کے قائل ہیں۔ اگر حشویوں کی طرف ان کے اس قول کی نسبت صحیح ہے تو یہ مجروح یعنی لائق التفات اور صحت کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ اُمت کا اجماع اس کے خلاف ہے۔ اور جو انبیاء پر صغائر کو جائز رکھتے ہیں انکے پاس کوئی نص ہے اور نہ ہی کوئی دلیل۔ بلکہ وہ صرف اس آیت اور اس قسم کی دوسری آیتوں کو ماخذ ٹھہراتے ہیں اور ان کا جواب بخوبی ظاہر کر دیا گیا ہے۔

صغائر غیر رذیلہ کو جائز رکھنے کے بارے میں ابنِ عطیہؒ فرماتے ہیں کہ آیا صغائر غیر رذیلہ میں سے کچھ حضورِ اکرم سے واقع ہوئے ہیں یا نہیں وہ اس میں اختلاف کرتے ہیں۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ حضورؐ سے ان میں سے کچھ بھی واقع نہیں ہوا۔ اور آپؐ کے اس قول و حال کے برخلاف کوئی گمان بھی کیسے کر سکتا ہے جبکہ آپؐ کی صفت میں حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔ مَا ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحی ط اور جو شخص بھی حضورؐ کے احوالِ مبارک کو اوّل سے

آخر تک جانے گا اور مشاہدہ کرے گا وہ اس قسم کی بات اپنے مُنہ سے حضور کے بارے میں نکالنے یا اپنے دل میں اس قسم کا وہم وخیال تک لانے میں شرم محسوس کرے گا۔ امام سبکی مزید فرماتے ہیں کہ جب میں اس آیت کے معنی و وجہ کے ماخذ کے درپے ہوا تو ابنِ عطیّہ کو بھی اس کا قائل پایا چنانچہ کہا اس آیت کے معنی اس حکم کے ساتھ حضورؐ کی شرافت و بزرگی کا ظاہر فرمانا ہے۔ اور اس میں کوئی گناہ متصوّر نہیں۔ ابنِ عطیّہ نے ایسا خدا کی توفیق پانے سے کہا ہے۔ یہ کلام مجمل ہے اس کی تشریح وتفصیل یہ ہے کہ آقا کبھی اپنے غلاموں کو اپنے خواص اور مقرّبین کے ذریعے نوازتا ہے۔ اور بزرگی بخشتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تمہیں بخشا اور تمہارے اگلے اور پچھلے گناہوں سے درگذر کیا۔ حالانکہ آقا خوب جانتا ہے کہ ان سے آگے پیچھے کسی وقت بھی کوئی گناہ اور غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ لیکن اس کا یہ کلام غلاموں کے لئے باعثِ عزّت و احترام ہے۔ بعض مفسّرین فرماتے ہیں کہ اس جگہ مغفرت کا عصمت سے کنایہ ہے۔ اس صورت میں اس آیۂ کریمہ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ بخشے یعنی اللہ تعالیٰ آپؐ کو آپ کی پچھلی حیات میں بھی اور اگلی حیات میں بھی اپنی عصمت وپناہ میں رکھے، یہ قول انتہائی حسنِ قبول ہے۔

اس آیۂ کریمہ کی تفصیل یہ ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے آپؐ کے لئے پہلے فتح مبین کا اثبات فرمایا اس کے بعد مغفرتِ ذنوب کا ذکر فرمایا بعد ازاں اتمامِ نعمت کا اثبات فرمایا پھر ہدایت صراطِ مستقیم اور نصرِ عزیز یعنی غالب مدد کا ذکر فرمایا۔ لہٰذا ثابت اور متعیّن ہوا کہ مقصود اثبات ذنوب نہیں، بلکہ اس کی نفی ہے۔ چنانچہ علّامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں مفسّرین کرام کے یہ اقوال اور توجیہات اس بناء پر محمول ہیں کہ انھوں نے آیۂ کریمہ میں حرفِ جر" لام "کو تخصیص کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اس" لام "کو اگر بجائے تخصیص کے (تعلیل وسبب) کے معنی میں لیتے تو ان بعید اذکار تاویلات کے جھمیلے سے بچ جاتے، اور" لام "، مسببہ کو (جو حرفِ جر" لام "کے معنی مشترکہ اور خواص میں سے) مان لینے کے بعد حضورؐ اکرم کی عظمت وشان اور رفعت ومقام کی بے نظیر دلیل بن جاتی۔ چنانچہ" لام تعلیل "اور سببہ کو

صاحبِ تفسیر جلالین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اور اس صدی کے مجدّدِ اعظم حضرت مولانا مفتی شاہ احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی نے اپنے ترجمہ قرآن مسمی بہ کنز الایمان میں لام سببیہ ہی مان کر ترجمہ کیا ہے۔ (مدارج النبوۃ جلد ۱" از شاہ عبد الحق محدث دہلوی ص۱۵۴)۔

تاریخ اور حدیث و تفسیر میں حق بھی ہے اور باطل بھی، پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی، ہدایت بھی ہے اور ضلالت بھی۔ اب یہ صاحبانِ علم کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کانٹوں کو ہٹا کر پھولوں کو چن لیں۔ ماضی میں جابر و ظالم سلاطینِ وقت کی مرضی اور سیاسی مصلحتوں کے تحت لکھی جانے والی کتابیں اور ان میں مندرج واقعات و حالات چاہے کتنے ہی دلخوش کن اور دل ربا کیوں نہ ہوں ان پر عقیدت و احترام یا شان و شوکتِ اسلام کا جھوٹا لیبل لگا ہوا دیکھ کر تحقیق و تنقید کے معیار پر پرکھے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر جب بات آنحضرت کی سیرتِ طیبہ، وجودِ نوری اور حیثیتِ نبوی کے سراسر منافی ہو۔ ہمارے لئے صرف وہی تاریخی واقعات اور حدیثیں قابلِ قبول ہو سکتی ہیں۔ جن کی تائید و حمایت آیاتِ قرآنی کر رہی ہوں۔ اس لئے کہ پروردگارِ عالم نے اپنے حبیب و محبوب اور منتخب بندے کی اعلیٰ فکر و حکمت، کمالِ عقل و معرفت، بلندیٔ علم و عمل کے ساتھ وجود و حیثیت روحانیت و نورانیت کو باہمہ وجوہ قرآن میں بالتفصیل بیان کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے جس میں تحریف کرنے کی کسی بھی صاحبِ اقتدار کو جرأت و جسارت اور اختیار و دسترس حاصل نہ ہو سکی۔

فتح مکہ تک ابو سفیان مدینۃ الرسول کی اسلامی مرکزیت کو تباہ و برباد کرنے اور آنحضرت کو قتل کرنے کی غرض سے بار بار مدینہ منورہ پر فوج کشی کرتا رہا اور صدہا صحابیوں کو جامِ شہادت جس کی وجہ سے نوش کرنا پڑا۔ ابو سفیان، بنی ہاشم سے خاندانی دشمنی رکھنے کی بناء پر اسلام کا مخالف ہی رہا۔ وہ آنحضرت کی حیثیتِ نبوی اور وجودِ نورانی کو تسلیم کرنے کی بجائے آپ کو قتل کر دینے کے لئے مستعد رہا۔ اب اسے ملّتِ مسلمہ کا امتحان کہیئے یا ابتلاء و مصیبت کہ وہ خاندان جو صدیوں سے آنحضرت کے خاندان کا دشمنِ جانی تھا۔ اقتدار و حکومتِ اسلامیہ پر قابض

ہو کر اسلام اور مسلمانوں کی گردنوں پر مسلّط ہو گیا۔ جنھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں آنحضرتؐ کی ہر نسبت صحیحہ اور حیثیت و وجودِ نبوی کی کردار کُشی کی۔ سب سے پہلے تو انھوں نے قرآن و احادیث کے مصداق بدلے۔ پھر آپؐ کی نسبت قرابت کو اس طرح سے ختم کیا کہ کربلا میں آپکے بچّوں کو بھوکا اور پیاسہ قتل کر کے آپؐ کی نسل پاک ہی کو ختم کر دینا چاہا۔ آپ کی دوسری نسبت اسلام کی مرکزیت اصحابِ مدینہ کو قتل کر کے حرمت و عظمت مدینہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ اِسکے بعد بنی اُمیّہ نے آپؐ کے آبائی شہر اور جائے مولد مکّہ منوّرہ پر فوج کشی کی اور خانۂ کعبہ پر سنگباری کر کے اسے نذرِ آتش کر دیا اور اس طرح خانۂ کعبہ کی عظمت و حرمت کو بھی پامال کر دیا۔ بدقسمتی سے بنی اُمیّہ کا باطلانہ اور ظالمانہ دورِ اقتدار اسلام اور ملّتِ اسلامیہ پر ۱۳۲ھ تک قائم رہا۔ جس میں انھوں نے بھرپور انداز میں آنحضرتؐ، اہلبیتِ رسُول اور آپؐ کے اصحابِ باوفا کی کردار کُشی کی اور اسلام کو اپنی ہوا و ہوس کا بدترین ہدف بنایا۔ انھوں نے اپنی تمام تر توانائیاں آپؐ کے ذکر خیر، عظمت و تقدّس اور ہادیانہ وجود و حیثیت کو مجروح و پامال کر دینے پر صرف کر دیں۔

پاکستان جیسے اسلامی مُلک میں ایک جماعت بنی اُمیّہ کے بیدین اور سابق حکمرانوں کے اپنے دورِ اقتدار میں سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت رائج کردہ نظریات و رجحانات اور اسلام سے منافی عقائد کے پرچار کرنے اور اُسے پھیلانے میں آج شدّت کے ساتھ مصروفِ عمل ہے کبھی یہ جماعت حیات النبیؐ کا انکار کرتی ہے تو کبھی آنحضرتؐ کی بشری حیثیت کو غلط معنیٰ و مفہوم کے ساتھ پیش کر رہی ہے کبھی یہ لوگ اہلبیتؑ کرام کی ذواتِ مقدّسہ کی اسلام میں وجود کی نفی کر کے آلِ ابوسفیان اور آلِ مروان کی بے جا اور بے بُنیاد مدح و ثنا کرتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ خدا اور رسُول نے حَکَم اور آلِ حَکَم کو ملعون قرار دے کر مدینۃ الرسُول سے خارج البلد قرار دیکر ملّت کو ان کے فتنہ و فساد سے محفوظ فرما دیا تھا۔ ان اقتدار پرست اور دشمنِ اسلام و پیغمبر افراد کے بے دین نظریات و عقائد کو اب پاکستان میں اس انداز سے پیش کیا جا رہا ہے "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ اِلّا اللہ" اس طرح کلمہ اسلام کو عمداً ادھورا کر کے سرکارِ دو عالم کی حیثیتِ نبوی کو

حذف کر دیا گیا۔ اِس لئے کہ ان کے قلب و نظر اور دِل و دماغ حضور پُرنور کی حیثیتِ و روحانیت و نورانیت کو قبول کرنے کو تیّار نہیں۔

کل ابوسفیان مدینۃ الرّسول پر بار بار فوج کشی کرتا رہا تاکہ آنحضرتؐ کو قتل کر کے اِسلام کا قصّہ ہی پاک کر دے اور یہی وجہ تھی کہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت جنگِ بدر میں صرف بنی ہاشم کو قتال کے لئے طلب کیا۔ اس کے بعد جنگِ اُحد میں ابوسفیان اور اس کی بیوی (ہندہ) نے جس درندگی کا مظاہرہ" حضرت حمزہ کی لاش کے ساتھ کیا تھا وہ مسلمانوں سے پوشیدہ نہیں۔ تاریخ عرب تو کُجا، تاریخ آدم و عالم ایسی مثال طبقۂ نسواں میں پیش نہ کر سکی۔ جنگِ اُحد میں جب یہ افواہ پھیل گئی کہ آنحضرتؐ قتل کر دیئے گئے تو اُسکی سب سے زیادہ خوشی ابوسفیان کو ہوئی یہ اس خبر کی تصدیق کے لئے انتہائی بیچینی میں ہر ایک کو آوازیں دیتا رہا۔ جنگِ اُحد کے بعد اس نے تمام قبائلِ عرب کو متّحد و حلیف بنا کر ایک لشکرِ جرّار اکٹھا کر کے مدینۃ الرّسول پر چڑھ دوڑا۔ کہتے ہیں کہ تاریخ عرب میں ابرہہ کے بعد یہ سب سے بڑی فوج کشی تھی (غزوۂ خندق جو مدینہ کے گرد واقع ہوئی) چونکہ باطل کا مقدّر ہی روسیاہی ہے۔ ابوسفیان بھی شکست کھا کر روسیاہی کیساتھ میدان چھوڑنے پر مجبور ہُوا۔ اس کے بعد اس کے پوتے یزید ابنِ معاویہ نے اپنے دادا کے جذباتِ دشمنی اسلام و پیغمبرؐ اور مدینۃ الرّسول کے تباہ و برباد کرنے کے ناپاک عزائم کو بھرپور انداز میں اِسطرح پورا کیا کہ تین۳ روز تک مدینۃ الرّسول میں ہر گناہ جائز تھا مسجدِ نبویؐ پر قبضہ کر کے نمازِ جماعت اور نبیؐ پر صلواۃ وسلام کو موقوف کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہدایتِ انسانی کے مرکز، مسلمانوں کی عظیم عبادت گاہ، خانۂ کعبہ کی حُرمت و تقدّس اور عظمتوں کو تباہ و برباد کیا۔ اِس پر پہلے تو سنگباری کی پھر اسے نذرِ آتش کر دیا گیا۔ کل تک تو بنی اُمیّہ شعائرِ اسلامی، عظمتِ رسُولؐ، آپکیؐ حیات اور حیثیتِ رسالت کو برداشت کرنے کے لئے تیّار نہ تھے۔ عبادت خانوں کی حرمت و تقدّس کو برباد کر کے اِسے نذرِ آتش کرنے میں مصروف تھے، لیکن آج ؟

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔ آج پاکستان میں حضور پُرنور پر صلواۃ وسلام

کی بندشیں، عبادت خانوں پر ناجائز قبضے انھیں نذرِ آتش کرنا۔ حد تو یہ ہے کہ کلام الٰہی کو بھی نذرِ آتش کر دیا گیا ایک مجمع عام جس میں نام نہاد اہلسنّت کے دعویدار ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ ایک عاشقِ رسُول کو صرف اس وجہ سے بیدردی کے ساتھ زدوکوب کیا گیا کہ اس عاشقِ رسُول نے "یا رسُول اللہ" کا نعرہ بلند کیا تھا۔ اور بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ بنی اُمیّہ کے بیدین صاحبانِ اقتدار کے روحانی پیروکار، اسلام بیزار جذبات اور پیغمبرِ خاتم سے انتقامِ طلبی کیساتھ ابوسفیان کے قتلِ پیغمبرؐ کی ناپاک تمنّا کو اب اِس طرح آسودہ کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں کہ کراچی کی دیواروں پر ایک پوسٹر (اشتہار) چسپاں نظر آ رہا ہے، جس کا عنوان ہے "وفاتِ ختم المرسلین صلّی اللہ علیہ وسلّم"، جس کے معنی یہ ہیں کہ رِسالتوں کو ختم کرنے والے کی مَوت۔ جس میں اس آیت انّکَ مَیّت وانّھم میّتون ط کو موضوع قرار دیا گیا ہے۔ اس کے چند یوم بعد اس کا دوسرا ایڈیشن اسی عنوان کے ساتھ سورۂ انبیاء کی تینتیسویں آیت کو عنوان قرار دے کر شائع کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد اسکا تیسرا ایڈیشن بہ عنوان "باب ختم الرّسل صلّی اللہ علیہ وسلّم" شائع ہوا۔ اب اس کے بعد اس کا چوتھا ایڈیشن "وفاتِ انبیاءِ کرام علیہ السّلام" شائع ہوا۔ پہلے امام الانبیاء حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی وَفات کا اشتہار دیا گیا اِس کے بعد تمام انبیاءِ کرام کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا (معاذ اللہ) یہ سرکارِ رسالت کے دشمن ازلی دشمنیِ پیغمبرؐ میں اِتنے سرشار اور مخمور ہو گئے کہ انھیں اتنا بھی ہوش نہیں رہا کہ حضرت عیسٰی اور حضرت خضرؑ بقیدِ حیات اور پیکرِ بشری میں ابھی زندہ اور موجود ہیں۔ ان خرافات کے پس منظر میں انبیاءِ کرام اور رسُولِ خاتم سے دشمنی اور اسلام سے بیزاری کے جو جذبات کارفرما ہیں۔ قارئین کرام اب اس سے بھی باخبر ہو جائیں کہ پہلے تو ذہنوں کو فقط "لا الٰہ الّا اللہ" کے لئے تیّار کیا گیا کہ "محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم" کے حیثیتِ نبوی کی نفی کی گئی اور اب ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا کہ انبیاءِ کرام اور خود سرکارِ دو عالم جو رِسالتوں کے خاتم ہیں (رسُولوں کو ختم کرنے والے نہیں) انھیں بھی فنا کر دیا (معاذ اللہ)۔ اب اس کے بعد یہ جشن عید میلاد النّبیؐ ذکر و فکر کی محفلیں، عُرس شریف،

یومِ عاشورہ اور محرّم کی مجلسیں کیوں۔ اور بڑی بے باکی، پُرفریب جسارت کے ساتھ کہتے ہیں کہ
یہ عید میلادالنبیؐ کس نبیؑ کی سنّت اور کن کن صحابہ کرام کی سیرت ہے۔ جب اس عید کی کوئی شرعی
حیثیت نہیں ہے تو اس کا منانا بدعت و شرک ہے۔ اس لئے کہ مُردوں کا تذکرہ جائز نہیں۔
اور شہداءِ کربلا کا ذکر ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ شہداء زندہ ہیں، زندوں پر رونا جائز نہیں ہے۔
اور جب وہ زندہ ہیں تو پھر ان کا یوم کیوں، وہ تو جی رہے ہیں۔ قارئین نے ملاحظہ فرمایا کہ شہداءؑ
کی یاد اور ان کا ذکر اس لئے بند کردو کہ وہ زندہ ہیں۔ اور رسولِ اکرم کا ذکر اس لئے بند ہوجانا
چاہیئے کہ مر چکے ہیں (معاذ اللہ) لیکن جب یہ خود عظمتِ صحابہ کانفرنس، اور یومِ معاویہ و یزید
مناتے ہیں تو انھیں نہ کسی صحابہ کی سیرت یاد رہتی ہے اور نہ ہی کسی نبی کی سنّت کی کیضرورت لاحق
ہوتی ہے۔ اور نہ ہی ان کا یہ فعل شرک و بدعت دکھائی دیتا ہے۔ ایّامِ محرّم جس میں ہمارے بزرگانِ
دین کی سیرت یہی رہی ہے کہ پہلی محرّم سے عاشورۂ محرّم تک ہم صرف شہداءِ کربلا کا ذکر کرتے ہیں
جنھوں نے بھوک پیاس میں اپنی جانیں دے کر اسلام کو بنی اُمیّہ کی بدترین ملوکیّت کے تسلّط
سے نجات دلایا۔ لیکن شیعہ اور سُنّی دونوں ہی کو دھوکہ دینے کے لئے عظمتِ صحابہ اور سیرتِ
صحابہ کانفرنسوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ جس میں سیرتِ صحابہ کے بجائے ان لوگوں کا ذکر ہوتا ہے کہ
جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت کو اذیّت پہنچائی تھی، یا وہ سرکارِ دوعالم کے دشمنی کے جذبات
میں مبتلا تھے۔ مثلاً سیّد الشّہداء حضرت حمزہؑ کا قاتل (حبشی) جسے آنحضرتؐ نے اپنی قربت سے دُور
کردیا تھا اسے حضرت حبشیؓ کہا جارہا ہے۔ مروان بن الحکم جس کے خاندان کو سرکارِ دوعالم نے ملعون
قرار دے کر مدینہ بدر فرمادیا تھا اب اس ملعون کو امیرالمومنین حضرت مروانؓ کہا جارہا ہے، عبداللہ بن
سرح، جس کے جرائم اتنے گھناؤنے تھے کہ آنحضرتؐ نے اسے جس حالت میں اور جہاں بھی ملے قتل کردینے کا حکم
فرمایا تھا۔ اسے بھی صحابہ کرام کے زمرہ میں شامل کیا جارہا ہے۔ کیا خارجیت کے اس کردار و عمل سے
رسول دشمنی اور اسلام بیزاری کے جذبات ظاہر نہیں ہوتے۔ اسی کو علامہ اقبالؒ نے یوں کہا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ☆ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

سرکارِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی توہین اور بنی اُمیّہ

بنی اُمیّہ کلمہ پڑھنے اور دائرۂ اسلامی میں داخل ہونے کے بعد بھی اسلام کی روحانیت و نورانیت سے واقف نہ ہوسکے۔ پیغمبرِ اکرمؐ اور اسلام کے یہ مخالف ہی رہے مسلمانوں کی کثرت اور ان کے خوف کی وجہ سے بظاہر یہ خود کو مسلمان ہی کہتے تھے۔ لیکن سرکارِ دو عالمؐ کے یہ بدترین دشمن تھے اور یہ اپنی اس دشمنی کو دلوں میں چھپائے ہی رہے۔ اور اپنی اس منافقت کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ سرکارِ دو عالم کی اسلام میں حیثیت و منزلت، عظمت و بزرگی، احترام و تقدس، اور دینی تمکنت و وقار کے ساتھ آپؐ کا ذکر ان کی نگاہوں میں ہمیشہ کھٹکتا ہی رہا۔ انکی مخالفت و دشمنی پیغمبر کا یہ عالم تھا کہ بنی اُمیّہ" آپؐ کے بزرگوں کی ہڈّیوں کو بھی قبر سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے تیّار و مستعد تھے۔ چنانچہ یہ عبرتناک واقعہ مؤرخین تحریر فرماتے ہیں کہ جس سے بنی اُمیّہ کے رسُولِ اکرم سے بدترین جذبات دشمنی کے حامل ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ " جنگِ اُحد کو جاتے وقت ابوسفیان کے لشکر کا گذر مقامِ اَبوَا سے ہوا یہ وہ جگہ ہے جہاں سرکارِ دو عالمؐ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؑ کی قبرِ اطہر واقع ہے۔ قبر پر نظر پڑتے ہی ابوسفیان نے مُشرکینِ عرب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ رسُول اکرم کی مادر گرامی کی قبر کو کھود کر ان کی ہڈیاں نکال لی جائیں۔ اگر محمدؐ نے ہماری عورتوں کو گرفتار کیا تو یہی ہڈّیاں پیش کردی جائیں کہ دیکھو یہ تمہاری ماں کی ہڈّیاں ہیں۔ اگر وہ اپنی ماں سے سچّی محبّت کرتے ہوں گے تو ان ہڈّیوں کو لے کر ہماری عورتوں کو واپس کر دیں گے۔ اور اگر وہ کسی عورت کو گرفتار نہ کرسکے تو ان ہڈّیوں کے عوض ان سے زرِ کثیر

حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ابوسفیان نے بہت چاہا کہ معززین قریش اس امر پر تیار ہو جائیں۔ مگر ان لوگوں نے سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا! ایسی ذلیل باتوں کا تو ذکر بھی نہ کرو" (آفتابِ شہادت ص۱۵۰ بحوالہ واقدی مغازی رسول ص۱۵۸ تا ص۱۶۰)

اس طرح کے جذبات دشمنیِ پیغمبر میں بنی امیہ مبتلا تھے مگر اس کے اظہار اور اس پر عمل کرنے کا انھیں اصحابِ پیغمبر اور آلِ رسول کی موجودگی میں موقع حاصل نہ ہو سکا۔ لیکن حصولِ اقتدار و حکومت کے بعد بنی ہاشم سے بنی امیہ کے جذبات، دشمنی کا نشہ دوآتشہ ہو گیا اور وہ اب کھل کر سامنے آ گئے۔ اسلام کے بارے میں ابوسفیان نے واشگاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ "میں مدت سے اس حکومت کا امیدوار تھا۔ اب یہ حکومت ہماری اولاد میں وراثتاً چلے گی۔ یاد رکھو خلافت ایک سلطنت ہے۔ اس کے علاوہ جنت و جہنم کوئی چیز نہیں" یہ تو اسلام اور اقتدارِ اسلامی کے بارے میں بنی امیہ کے بوڑھے سردار نے اپنے نظریات و عقائد کی وضاحت کی تھی۔ اب بنی امیہ کے پیغمبر خاتم (خاندانِ بنو ہاشم) سے جذباتِ دشمنی کو ملاحظہ فرمائیں۔ "ابوسفیان، سید الشہداء حضرت حمزہ کی قبر اطہر پر گیا اور لاتیں مار کر کہنے لگا! اے ابو عمارہ دیکھو جس حکومت کے لئے تم نے تیغ زنی کی تھی آج وہ حکومت ہمارے بچوں کے لئے کھیل بن گئی ہے" (الاستیعاب جلد ۴ ص۸۷، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱ ص۱۳۶، صوت العدالت جلد ۴ ص۲۰۸ وغیرہ)۔ اس کے علاوہ بنی امیہ، سرکار دو عالم پر صلوٰۃ و سلام اور آپ کی قبر منور کی زیارت میں سختی کے ساتھ مانع، اس کی مخالفت اور اسے شدت کے ساتھ روکتے رہے چنانچہ شیخ عبدالحق صاحب دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ "مروان ابن الحکم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنا روئے نیاز قبر شریف نبوی پر رکھے ہوئے تھا۔ مروان نے اس کی گردن پکڑ کر کہا! تو جانتا ہے کہ کس فعل کا مرتکب ہو رہا ہے، اس نے کہا! خبردار مجھے چھوڑ دے، میں نے اپنا چہرہ پتھر پر نہیں بلکہ تربتِ محمدؐ پر رکھا ہوا ہے اور کہا میں نے پیغمبرؐ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ دین پر اس وقت رونا چاہیئے جس وقت حکومت نا اہل کو پہونچے"

(جذب القلوب صہ ۲۳۲) - جب بنی اُمیّہ کے صاحبانِ اقتدار و حکومت کی یہ پالیسی تھی کہ آپؐ کی زیارت قبر، آپؐ کا ذکر خیر عام نہ ہونا چاہیئے - اور اسے روکنے کے لئے عمّالِ حکومت سختی اور تشدّد پر آمادہ ہوں تو پھر سیرت النّبیؐ کے جلسے اور میلاد النّبیؐ کی نورانی محفلوں کا انعقاد کیونکر ممکن تھا - جب اصحابِ رسُول کو زیارتِ قبرِ نبوی تک کی اجازت نہ ہو تو یہ کیونکر ممکن تھا وہ آنحضرتؐ کی ولادت کے جشن مناتے اور جلوس نکالتے جبکہ حکومتِ وقت اس میں سختی کے ساتھ مانع تھی -

اس کے علاوہ آپ حضرات کو قطعی اندازہ اس امر کا ہو گیا ہو گا کہ بنی اُمیّہ پر نبیؐ اکرم کی تعلیماتِ روحانیہ اور اخلاقِ حسنہ کا کوئی اثر نہ تھا - یہ صرف اقتدار و حکومت کی بھوکی جماعت تھی اور یہ اپنے حیات کے آخری ایّام تک حصولِ اقتدار اور اس کے تحفظ و بقاء کی خاطر ہر اسلامی و انسانی اقدار کو پامال اور اپنے سیاسی عقائد و نظریات، قبیح اعمال و کردار، ذلیل اسلوبِ فکر اور اقتدار کے غلط استعمال کی بناء پر اسلام، آلِ رسُول اور اصحابِ رسُول کے لئے بدترین مصیبت اور ابتلاء و پریشانی کے ساتھ دین و دیانت کی راہ میں ایک فتنۂ عظیم بنے رہے - بنی اُمیّہ، سرکارِ دو عالم کے خاندان (بنی ہاشم) سے اتنی شدید دشمنی میں مبتلا تھے کہ حضرت علیؑ نے بنی اُمیّہ کی دشمنی کو مدّنظر رکھتے ہوئے اپنی قبر کے نشان تک کو مخفی رکھنے کی وصیّت اصحابِ پیغمبر اور اپنی اولاد سے فرمائی - اور آپ کی لحدِ اطہر کو بنی اُمیّہ سے پوشیدہ رکھا گیا - یہاں تک کہ بنی اُمیّہ کا تاریک اور باطلانہ دورِ اقتدار کا نشہ بنی عباس نے ۱۳۲ھ میں ہرن کر دیا - تو دورِ اقتدارِ ہارون الرّشید میں امام علی رضا علیہ السّلام نے حضرت علیؑ کے جائے مدفن کی نشاندہی فرمائی - بنی اُمیّہ کے صاحبانِ اقتدار کا پروپیگنڈہ انبیاء کرام، اولیاء اللہ کے خلاف اتنا شدید اور ہمہ گیر تھا کہ جب حضرت علیؑ کے شہادت کی خبر شام میں پہونچی تو ایک شامی نے عراقی بیٹا مبر سے پوچھا کہ علیؑ تو بہت بہادر تھے وہ کیونکر قتل ہوئے - عراقی نے جواب دیا کہ وہ نمازِ فجر (صبح) پڑھانے کے لئے مسجد میں آئے تھے کہ دورانِ نماز

آپ پر عبدالرحمٰن ابنِ ملجم نے وار کیا' تو اُس شامی نے بے ساختہ کہا کہ کیا وہ ڈاکو نماز بھی پڑھتا تھا۔
تو آپ نے تاریخ کے اُس تاریک رُخ کو ملاحظہ فرمایا کہ رسُولِ اکرم کا جاں نثار بھائی، اِسلام میں صفِ اوّل کا مجاہد، فاتح بدر و حنین، عابدِ شب زندہ دار شامیوں کے لئے ہمہ، ڈاکو، اور تارک الصّلوٰۃ تھا (معاذ اللہ) صرف اس ایک ہی واقعہ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بنی اُمیّہ کا اِقتدار اسلام اور اسلام کی عظیم و پُر وقار دینی شخصیتوں کے لئے کتنی مصیبت اور صبر و اِبتلاء کے ساتھ ان کی آزمائش کا دَور تھا۔ جس میں آنحضرتؐ کی تُربتِ پاک صنم کہی گئی اور حضرت علیؑ جیسی عظیم اِسلامی شخصیت کے دینی کردار و عمل کو کس طرح مجروح اور مشکوک و مشتبہ بنایا گیا۔ وہ علیؑ جس کی زاہدانہ اور متّقیانہ زندگی کے ساتھ عبادتِ الٰہی اور اطاعتِ رسُول میں سرشاری اور آپ کی منصفانہ اور عادلانہ روِش جس کا آج بھی غیر قوموں میں چرچا ہے۔ اِسے بنی اُمیّہ نے قزّاق، رہزن اور تارک الصّلوٰۃ مشہور کر رکھا تھا۔ اور جو واقعی مسلمانوں کے حقوق کے غاصب، اقدارِ انسانیت کے رہزن، اَموالِ مسلمین (بیت المال) کے ڈاکو اور عزّتِ اِسلام و ناموسِ صحابہ کو تباہ و برباد کرنے والے تھے وہ امامِ عادل اور خلیفۃ المسلمین ہی نہیں بلکہ نائبِ خدا و رسُول تھے۔

ایسے ہی جذبات میں مبتلا افراد اور ان کی اولاد اِسلام اور مسلمانوں کی گردنوں پر سینکڑوں سال تک مسلّط رہی تو پھر اسلامی اقدار کے صحیح خدوخال اور پیغمبرؐ اکرم کی نورانیت و رُوحانیت اور اولیاء اللہ کی عظمت و حرمت، درجات و منزلت اور حیثیت صحیحہ اگر تاریخ میں مُشتبہ اور مشکوک دکھائی دے تو اس میں حیرت و پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ حیرت تو اس اَمر پر ہونا چاہئیے کہ سرکارِ دو عالم کی حیثیت و منزلت، وجودِ رُوحانی و نورانیت اور آپ کے وقار و عظمتِ دینی کو پامال کرنے والوں نے آپؐ کے روضۂ اقدس کو کیونکر صحیح و سلامت رہنے دیا حضرت علیؑ کا اپنی قبر کی توہین کے بارے میں فکرمند ہونا کیا بے بُنیاد تھا؟ بنی اُمیّہ کے تاجداروں نے اس پر عمل کر کے حضرت علیؑ کے اس اقدام یعنی قبر کو گمنام رکھنے کی وجہ کو صحیح ثابت کر دکھایا

چنانچہ شیخ عبد الحق دہلوی فرماتے ہیں کہ "صحیح خبروں میں آیا ہے کہ ۴۶ سال بعد جب بعض شہداءِ اُحد کی قبروں کو کھودا گیا تو اسی طرح تر و تازہ مثلِ غنچۂ گل معہ کفنوں کے نکلے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گویا ان کو کل ہی دفن کیا گیا ہے۔ اور بعضوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ زخم پر رکھے ہوئے ہیں۔ جب ہاتھ کو زخم سے علیحدہ کرتے تھے تو اس زخم سے تازہ خون جاری ہو جاتا تھا۔ اور جب ان کے ہاتھ کو چھوڑ دیتے تھے تو پھر زخم کی جگہ پہونچ جاتا تھا۔ امام تاج الدین سبکیؒ نے "شفاء السقام میں لکھا ہے کہ جب معاویہ نے نہر جاری کی تو حکم دیا کہ شہداء اپنی قبروں سے منتقل کئے جائیں۔ ایک پھاوڑا سید الشہداء حضرت حمزہؓ ابنِ عبد المطلب کے پائے مبارک پر لگا یا اس سے خون جاری ہو گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ معاویہ کے عامل نے چشمہ کھودنے کے دن مدینہ میں منادی کرادی تھی کہ امیر المومنین کا چشمہ جاری ہو رہا ہے جس شخص کا مُردہ اُحد میں مدفون ہو وہ آئے اور اس کو یہاں سے منتقل کر کے دوسری جگہ لے جائے" (جذب القلوب صہ ۲۰۳)۔

مَیں اس واقعہ پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا، ناظرین کی صوابدید پر اس کے نتیجہ کو چھوڑتا ہوں۔ سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خدا و رسُول کا حکم ہے اور سرکارِ دو عالم کی سیرتِ پاک بھی یہی ہے کہ شہید کو اس کے مقامِ شہادت اور اسی کے کپڑوں میں دفن کرتے تھے، شہداءِ اُحد کسی معمولی درجہ کے شہید نہ تھے یہ سب صحابیتِ رسُول کے درجے پر فائز، خدا کے محبوب بندے تھے۔ کیا شامی حکومت بغیر ان کی قبروں کے کھودے کسی دوسری سمت سے چشمہ جاری نہیں کر سکتی تھی۔ جبکہ آنحضرت کی سنّت کے خلاف یہ اَمر تھا کہ آپؐ کے حکم و مرضی اور آپؐ کے دستِ مبارک سے مدفون شہداءِ حق کی میّتیں نکالی گئیں اور آپؐ کی پسندیدہ جگہ سے ان کی لاشیں منتقل کر دی گئیں۔

بنی اُمیّہ کے اقتدار و حکومت کے تحت قائم ہونے والے مدارس اور مکتبِ فکر نے اسلام کا رُخ مرکزِ اسلام مدینۃ الرسُولؐ سے موڑ کر اس کا رُخ قصرِ سلطانی (دمشق) کی جانب

کر دیا۔ جہاں اربابِ غرض، بندگانِ ہوا و ہوس، دسترخوانِ شاہی پر مجتمع ہو کر اپنے ظرف، اپنی فکر اور اپنی حیثیتوں کے مطابق شکم سیری میں مبتلا ہو گئے۔ جہاں حدیث سازی کے کارخانے، صاحبانِ حکومت و اقتدار کی نگاہوں اور ان کی منشاء کے تحت قائم ہوئے اور پھر کام کرنے لگے۔ اور پھر سلطنت کے بہیمانہ عزائم، اس کے پیچ و خم، سیاسی اغراض و مقاصد کے تحفظات کے خاطر اس مکتبِ فکر کے فارغ التحصیل علماء و محدثین اور مورخین سرگرم عمل ہو گئے۔ جنھوں نے آخرت پر حصولِ دنیا کو اور اطاعتِ خدا و رسول کی جگہ ملوکیت کی غلامی و خوشنودی پر ترجیح دینے لگے۔ مال و منصب کی خاطر بکے ہوئے ضمیروں نے اسلام کی روحانیت اور انسانی اقدار کو جاہ و حشم، انعام و اکرام کی لالچ میں سلاطینِ شام کے ہاتھوں چند سکوں میں فروخت کر دیا۔

اور جب یہ شامی اقتدار اسلامی اقدار کو پامال کرتا ہوا عبدالملک ابنِ مروان تک پہونچا تو وہ اس وقت کلام پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر قرآن مجید بند کر دیا۔ "اب تجھ سے ملاقات قیامت میں ہوگی۔ اب مجھے کاروبارِ حکومت سے اتنی فرصت کہاں ہے کہ میں تیرا ساتھ دے سکوں"۔ عبدالملک کا چہیتا گورنر اور محبوب سپہ سالار حجاج بن یوسف نے جس طرح مکہ معظمہ پر فوج کشی کر کے خانۂ کعبہ کو تباہ و برباد کیا تھا ناظرین اس کے اس سیاہ کارنامے اور بیدین جسارت سے بخوبی واقف ہوں گے۔ اسلام، رسولِ اکرم، اہلِ بیتِ رسول اور اصحابِ باوفا سے اس کے دشمنی کے جذبات کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ جب حجاج بن یوسف ۷۴ھ ہجری میں گورنر کی حیثیت سے مدینہ میں داخل ہوا تو یزید کے تباہیِ مدینہ کے دوران جو چند صحابیِ رسول قتل ہونے سے بچ گئے تھے ان کی توہین و تذلیل کیخاطر انھیں طلب کیا اور پھر ان کے ہاتھوں، گردنوں اور پیشانیوں پر سیسہ (رانگا) گرم کر کے غلامی کی مہریں لگوا دیں "جن میں جابر ابن عبداللہ انصاری کے ہاتھ پر سیسہ سے مہر لگوائی گئی۔ انس بن مالک (خادم رسول) اور سہیل ابنِ سعد ان کی گردنوں پر مہر لگائی گئی"۔ (انساب الاشراف بلاذری جلد ۵ صفحہ ۳۷۳، تاریخ الامم والملوک جلد ۷ صفحہ ۲۰۶، تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۵)۔

دورِ حاضر میں ناموسِ صحابہ اور عظمتِ صحابہ کا پرچار کرنے والوں کی زبانیں آخر ان اصحابِ پیغمبرؐ پر ظلم و ستم کرنے والوں کے حق میں کیوں خاموش ہیں۔ کیا یہ لوگ عظمتِ صحابیت پر فائز نہ تھے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ان دشمنانِ اصحابِ پیغمبرؐ اور اُن کے قاتلوں مثلاً مروان، عبدالملک ابنِ مروان اور حجّاج بن یوسف جیسے دشمن خدا و رسولؐ اور قاتلینِ اصحابِ پیغمبر کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ لکھا اور کہا جاتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ عظمتِ صحابہ کی کانفرنسیں اور نعرے ایک اسلام دشمن سازش کے تحت لگائے جارہے ہیں تاکہ حضور پُر نور سرکارِ دو عالمؐ کے ذکر اور صلوٰۃ و سلام کی نورانی محفلوں کو پس منظر میں ڈھکیل دیا جائے۔

ایک دن حجّاج بن یوسف نے اہلِ مدینہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "کیا تمہارے اہل و عیال کے لئے تمہارا خلیفہ (عبدالملک بن مروان) زیادہ کریم ہے یا اُس کا رسولؐ"۔ (البدایہ والنّہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۱، مروّج الذّہب مسعودی جلد ۲ صفحہ ۱۰۴)۔ حجّاج بن یوسف کے اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ وہ اقتدار پرست، جابر و ظالم اور سفّاک و درندہ صفت حکمران کو حضرت رحمۃ للعالمین، کریم ابنِ کریم، باعثِ خلقتِ کائنات، سرکارِ دوجہاں سے افضل و اعلیٰ قرار دیتا تھا۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ یہ "بنی اُمیّہ" کے صاحبانِ اقتدار کی رُوحانی اولادیں پیغمبرِ اکرمؐ کے صرف اور صرف بشری حیثیت کو ثابت کرنے اور اسی کا ذکر کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے کیوں ملا رہی ہیں۔ کُجا صاحبِؐ لولاک اور کُجا عبدالملک ابنِ مروان جیسا اقتدار و حکومت کا غلام اور دشمنِ اسلام و پیغمبرِؐ انسان کہ جس کی سیاہ کاریوں اور ظلم و ستم سے تاریخ کے دفتر کے دفتر سیاہ ہیں۔ یہ لوگ صرف اور فقط دُنیا اور اقتدارِ دُنیا کے غلام تھے۔ دولت و اقتدار کے حریص جنہیں اسلام اور اس کی نورانیت و رُوحانیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جو اسلام کو حصولِ اقتدار یا اُس کے تحفّظ و بقا کا صرف ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور بس۔

ایسے ہی قبیح اعمال و کردار اور اسلوبِ فکر کے حامل افراد خلافتِ اسلامیہ پر قابض ہوگئے۔ جو حقّ و دیانت کو تباہ و برباد کرنے کا تہیّہ کئے ہوئے تھے۔ جن کا مشن ہی اسلام اور پیغمبرؐ

دشمنی تھا۔ نہ ان میں اخلاق کا کوئی عنصر تھا، نہ انسانیت کی کوئی عزّت و آبرو۔ اپنے انہی بہیمانہ خواہشات اور سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل کی خاطر اموال المسلمین (بیت المال) کو ذاتی ملکیت و وراثت کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ حدیثیں وضع کروائی گئیں۔ آیتوں کے معنیٰ و مصداق بھی تبدیل کئے گئے۔ بنی اُمیّہ کو اس طغیانی اور سرکشی سے روکنے، ٹوکنے والی کوئی قوت و طاقت نہ تھی۔ ان مطلق العنان حکمرانوں نے آزاد بندگانِ خدا کو غلام کی حیثیت و درجہ میں شمار کیا، صاحبانِ اقتدار و حکومت نے حق پرستوں کو باطل پرست اور اقتدار و حکومت کی غلامی کو حق پرستی قرار دیا۔ فواحش و منکرات کا استعمال عام ہوا۔ سُنّتیں تبدیل ہوئیں۔ اور حلال و حرام کے امتیاز بھی ختم ہو کر رہ گئے۔ عظمتِ رسُول اور اقدارِ اسلامی کا دل کھول کر مذاق اُڑایا گیا۔ اور اس کے بعد اقتدار کے نشہ نے اتنا مدہوش کر دیا کہ بنی ہاشم دشمنی کے جذبات کو علانیہ طور پر ظاہر کیا جانے لگا۔ نہ تو والیوں کو اب کسی پردے اور پاس و لحاظ کی فکر ہے اور نہ ہی پروا اور نہ ہی خدا اور رسُول اور اہلِ اسلام سے کوئی حیاء و شرم۔ حجّاج بن یوسف والیٔ مدینہ منبرِ رسُول پر چڑھتا ہے اور پیغمبرؐ و اسلام سے اپنے جذبات کا یوں اظہار کرتا ہے: ”خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اِس شہر (مدینۃ الرّسُول) سے نکال دیا۔ جس کے رہنے والے بدبودار اور خبیث ترین ہیں یہ لوگ امیر المومنین عبدالملک بن مروان کے ساتھ کھوٹ رکھتے ہیں اور اس کی نعمتوں پر زیادہ حسد کرتے ہیں۔ خدا کی قسم اگر عبدالملک کے خطوط اہلِ مدینہ کے بارے میں نہ آتے رہتے تو میں انھیں گدھے کی کھال جیسی چیز میں بھر دیتا۔ یہ لوگ سوکھی لکڑی (منبرِ رسُول) اور بوسیدہ جسم (جسمِ اطہرِ پیغمبرِ اکرم) کے پاس آکر پناہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ رسُول اللہ کا منبر ہے۔ اور یہ رسُول اللہ کی قبر ہے۔“ (انساب الاشراف بلاذری جلد ”۵“ صـ ۳۷۴)۔

اہلِ اسلام، انصاف سے بتائیں کہ سرکارِ دو عالمؐ، آپؐ کے اصحاب، آپؐ کے شہر مدینہ، آپؐ کے منبر اور آپؐ کے جسدِ اطہر کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو سکتی تھی۔

حجّاج بن یوسف کا یہ کہنا کہ کُہنہ لکڑی اور بوسیدہ ہڈیوں کے پاس آکر یہ لوگ پناہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں رسُول اللہ کا منبر اور رسُول اللہ کی قبر ہے۔ یہ جذبات خوابیدہ اور اسلام کے راز سربستہ اب ہمارے دَور میں کُھل کر سامنے آگئے ہیں۔ آج یہ خارجی حضرات، سرکارِ دو عالم کی قبر کے بارے میں جو عقیدہ ظاہر کر رہے ہیں کہ روضۂ اطہر ان کے عقیدے میں صنم اکبر ہے اور زیارتِ قبر بُت پرستی و شرک و بدعت ہے۔ ان کے یہ تمام عقائد و نظریات درحقیقت خلفاءِ بنی اُمیّہ کے نظریات و عقائد ہیں جنھوں نے اپنے دَورِ اقتدار میں اپنی حکومت و اقتدار کی بقاء کی خاطر رائج کئے تھے۔ اور اب یہ لوگ (یعنی خارجی) حضرات ابوسفیان و مروان و عبدالملک اور حجّاج بن یوسف جیسے دُنیا پرست اور اقتدار کی حریص شخصیتوں کی قے کو چاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے دین و ایمان کو ضائع کر رہے ہیں۔

خلفاءِ بنی اُمیّہ کے یہ بدترین سفّاکی و بربریّت اور درندگی کے سیاہ ترین ادوار جس میں متعدد بار خانۂ کعبہ کی حُرمت و عظمت زائل کی گئی۔ مدینۃ الرّسُول اور اصحابِ رسُول لُٹے اور قتل و بے آبرو کئے گئے۔ اب کچھ بدنصیب ان سیاہ کاریوں کے ایّام کو اسلام کی "نشاۃ ثانیہ" کا نام دے رہے ہیں۔ اور تاجداران بنی اُمیّہ کے بے دین اور انسانیت سوز کردار و عمل کو پردۂ خفا میں لے جانے کے لئے کبھی اولیاء اللہ کی ذواتِ مقدّسہ کو اپنی بے علمی اور خام فکری کے سبب ہدف بنا رہے ہیں اور اپنے زعمِ ناقص میں اسے بہت بڑا دینی کارنامہ سمجھتے ہیں۔ آج جو ہمارے پاس آنحضرت کی حیثیت و عظمت اور آپ کی حُرمت و بزرگی کے درجات اور وجودِ نورانیت کی صحیح حیثیت حدیث و تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ یہ ان اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی جاں نثاری و قربانیوں کی وجہ سے ہے جو خود مٹ گئے لیکن عظمتِ مصطفٰے کی حیثیت و وجودِ نورانی کا تحفّظ کر گئے۔ آج ہمارے پاس جو علمی ذخیرہ ہے۔ اور بنی اُمیّہ کی ہزاروں کد و کاوش کے باوجود نہ مٹ سکا یہ بھی پیغمبرِ اکرم کا معجزہ اور وعدۂ الٰہی ہے کہ "میں اس نور کو منزلِ کمال تک پہونچا کر رہوں گا چاہے اس سے کافر کراہت ہی کیوں نہ کریں۔"

یہ تمام بے دین خرافات و اختراعات، کردار و جذبات اور عمل تو بنی اُمیّہ نے پیغمبرِ اکرمؐ کی دشمنی اور اسلام سے مخالفت کی بنا پر کئے۔ لیکن آج ان کلمہ گویوں اور بہ زعمِ خود مُوحّد گروہ کے افراد کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ پیغمبرِ اکرمؐ کی اُمّت میں ہونے کے بھی دعویدار ہیں اور پھر پیغمبرؐ کو گناہگار، خاطی، سہو و نسیاں کا عادی اور مُردہ بھی تصوّر کرتے ہیں (معاذ اللہ) آخر عصمتِ رسُول، حیاتِ رسُول ان کی طبع نازک اور فکر و فہم پر اس قدر بارِ گراں کیوں ہے؟ اگر بفرضِ محال (نقل کفر کفر نباشد) یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ خاکم بدہن رسُول کو موت آگئی اور فنا ہو گئے تو آپ کو اس قیاس سے کون سا دُنیاوی اور دینی فائدہ پہونچ سکتا ہے؟ تو اس فعل عبث اور عقیدۂ بے سے کیا حاصل جس کا فائدہ کچھ بھی نہ ہو۔ اور اگر اس کی دوسری نسبت یعنی وجودِ پیغمبرؐ موجود ہے اور آپ نے ملّت کو ایک غلط اور بے بُنیاد عقیدے (وفاتِ رسُول) کے گمان میں مُبتلا کر دیا تو یقیناً اس بے راہ اور بد عقیدہ ہونے والوں کے بد عقیدگی کی تمام تر ذِمّہ داری آپ پر ہو گی اور رُوزِ محشر پھر تو نہ آپؐ کی شفاعت کا اِمکان باقی ہے اور نہ ہی مغفرت کا اس لئے کہ مُردے زندوں کے حالات و اعمال سے آگاہ نہیں ہوتے تو وہ سفارش و شفاعت بھی نہیں کر سکتے۔ اگر آج تاجدارانِ بنی اُمیّہ زندہ ہوتے تو شاید وہ آپ کے اس رسُول دشمنی کے جذبات کی قدر و قیمت ادا کرتے اور آپ کو خلعت و انعام سے نوازتے۔ لیکن اس سلطانیٔ جمہور کے دَور میں آپ کے ان نظریات و عقائد پر مسلمان سوائے یہ کہنے کے اور کیا کر سکتے ہیں کہ:-

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا میرود دیوار کج

حیات و ممات بشر

جہاں تک حیاتِ بشری کا تعلق ہے اُس میں حیوان محض اور انسان یعنی بشر برابر اور مُشترک ہیں۔ اِس لئے کہ زندہ رہنے کے لئے آب و غذا اور سانس لینے کے لئے ہوا اور نسل کو قائم رکھنے کے لئے توالد و تناسُل میں بشر اور حیوان محض دونوں ہی مشترک ہیں۔ لیکن اس فطری ضرورت اور احتیاج برآری کے اسباب میں مشترک ہونے کی بناء پر کسی بھی حیوان محض کو بشر نہیں کہا گیا اور نہ ہی اس مماثلت و اشتراک کے سبب کسی اِنسان کو حیوان محض کہا جاتا ہے۔ لیکن پروردگار کی نگاہوں میں اِنسان کا کھانا پینا، چلنا پھرنا، بات چیت کرنا اور سُننا یا قلب و نظر رکھنے کے باوجود صحیح ادراک و فہم سے کام نہ لینا حیوان محض سے بھی بدتر ہے جیسا کہ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوا۔ "اِن کے پاس دِل ہے لیکن یہ اس سے سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر اِس سے دیکھتے نہیں، اور ان کے پاس کان بھی ہیں لیکن ان سے سُنتے نہیں۔ یہ لوگ گویا حیوان ہیں بلکہ اس سے بھی گئے گذرے ہی لوگ غافلین میں ہیں۔" (سورۂ اعراف، آیت ۱۷۹)۔ یعنی ایسے لوگ جو آنکھ رکھتے ہوئے حق کو نہیں دیکھ سکتے، قلب رکھتے ہوئے غور و فکر نہیں کرتے، کان رکھتے ہوئے حق کی بات نہیں سُنتے تو پروردگار کی نگاہوں میں چوپایوں سے بھی بدتر ہیں۔ گویا یہ سانس لیتی ہوئی میّتیں ہیں، کھاتے پیتے مُردے ہیں۔ چلتے پھرتے جنازے ہیں لیکن لوگ انھیں زندہ سمجھ رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے پیغمبرؐ کو ارشاد ہوا کہ آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "اے رسُول! آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں کو سُنا سکتے ہیں۔ جب وہ پیٹھ پھیر کر چلے جائیں۔ اور نہ آپؐ اندھوں کو گمراہی سے بچا کر راہِ ہدایت پر لا سکتے ہیں۔ آپؐ

تو بس ان لوگوں کو سُنا سکتے ہیں جو میری آیتوں پر ایمان لائے اور مسلمان ہیں۔" (سورۂ رُوم آیات ۵۱ و ۵۲)۔ اس سے پروردگارِ عالم کی ہرگز یہ منشاء ظاہر نہیں ہوتی کہ پیغمبرؐ کو قبر میں مدفون مُردوں کو سُنانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ بلکہ ربّ العزّت کی مراد اس سے ان چلتے پھرتے زندہ جنازوں سے ہے جو اسلام اور پیغمبرِ خاتمؐ کی باتیں کان رکھنے کے باوجود نہیں سُنتے۔ آنکھ رکھنے کے باوجود جنھیں حق نہیں دکھائی دیتا۔ قلب رکھنے کے باوجود ہدایت کے راستے کو قبول نہیں کرتے۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ پیغمبرؐ کی آواز مُردوں تک نہیں پہونچتی اور مُردے پیغمبرؐ کی آواز کو نہیں سُن سکتے۔ اس کی قطعی اس اَمر میں نفی نہیں بلکہ مراد اِس سے زندہ لوگ ہیں۔ لیکن کراچی میں ایک پوسٹر اس عنوان کا دِکھائی دیا ہے کہ "اے نبیؐ آپ قبر والوں کو نہیں سُنا سکتے۔" اور سورۂ روم کی ۵۲ ویں آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، مَیں نے سورۂ روم کی آیت ۵۱ و ۵۲ دونوں یہاں درج کر دیں ہیں تاکہ قارئین توہینِ رسُولؐ کے جذبات کو ملاحظہ فرمائیں کہ ذکر زندوں کو سُنانے کا ہو رہا ہے اور یہ بے معرفت اور بدعقل مصنّف اس سے رسُولِ اکرمؐ کے تصرّف و اختیار کی نفی کرنے کی خاطر ترجمہ میں مُبالغہ کر کے مسلمانوں کو گمراہ اور ان کے دِلوں میں وَسوسہ پیدا کرنے کی بدترین اور ناپاک لیکن ناکام جسارت کر رہے ہیں جس طرح بظاہر کھانا پینا، چلنا پھرنا، توالد و تناسُل، باتیں کرنا، قرآن کی نگاہوں میں حیات نہیں موت ہے۔ اسی طرح بظاہر لوگوں کی نگاہوں سے معدوم ہو جانا، کھانے پینے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو کر کسی کا قبر میں دَفن ہو جانا موت نہیں حیات ہے۔ (اَحیاء) یہ اور بات ہے کہ لوگوں کو اس کا شعور نہ ہو۔ لیکن "عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ط اور رزق زندوں کو دیا جاتا ہے، مُردوں کو نہیں۔

حیاتِ اَنبیاء و مُرسلینؑ تو ہماری فکر و عقل سے بہت بلند ہے۔ آپ اس گروہِ بشریّت کے حالات کا مطالعہ فرمائیں کہ جنھیں صفوفِ اَنبیاء میں بھی شامل ہونے کا شرف حاصل نہ تھا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی عقل و فکر کے صحیح اِستعمال اور معرفتِ الٰہی کی بدولت وہ فضل و بزرگی حاصل کر لی کہ جن کا ذکر پروردگار نے قرآن میں فرما کر مسلمان کی عقلوں کے لئے رہبری و عبرت کا

سامان بہم پہونچا دیا ہے۔ اور قرآن میں ایک سورہ ہی (سورۂ کہف) اصحابِ کہف کے ذکر میں مخصوص کر دیا ہے۔ اصحاب کہف وہ گروہ ہے جو خدا کے وجود کا قائل تھا۔ اپنے کافر اور ظالم و جابر بادشاہ کے خوف سے ایمان کو سلامت رکھنے کی خاطر اپنے شہر سے ہجرت کر کے ایک غار میں پوشیدہ ہو گیا تھا۔ بادشاہِ وقت ان کا تعاقب کرتا ہوا غار تک پہونچا۔ جہاں غار کے دہانے پر ایک کُتّے کو بیٹھا ہوا پایا۔ اس کا وزیر غار میں داخل ہوا اور اصحابِ کہف کو مُردہ پاکر بادشاہ کو ان کی موت کی اطّلاع دی کہ یہ سب مر چکے ہیں۔ بادشاہ نے غار کے دہانے کو بند کروا دیا کہ اگر نہ بھی مرے ہوں تو اب بھوک و پیاس کی شدّت سے مر جائیں۔ لیکن اصحابِ کہف کا یہ مُردہ گروہ "۳۰۹" برس کا عرصہ گزر جانے کے بعد پھر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور ان میں کا ایک فرد غار سے نکل کر شہر گیا تاکہ اپنے لئے کھانے پینے کی ضروریات حاصل کرے۔ مگر جب یہ شہر میں داخل ہوا تو لوگ اسے پہچان گئے" اور اس کے زندہ ہو جانے پر انتہائی حیرت کی۔ اس وقت کا بادشاہ (جو صاحبِ ایمان تھا) اس فرد کے ساتھ غار تک آیا تاکہ ان لوگوں کو عزّت و احترام کے ساتھ شہر میں واپس لائے۔ غار کے قریب پہونچ کر اصحابِ کہف کے ساتھی نے بادشاہ سے کہا کہ ہمارے ساتھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سب فقط ایک رات ہی سوئے ہیں۔" ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے فوجیوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جائیں کہ یہ ان کی گرفتاری کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد یہ شخص صرف تنہا غار میں داخل ہوا اور سارا ماجرا اپنے ساتھیوں سے بیان کر دیا۔ ان لوگوں نے کہا اس طرح سے تو اب ہم لوگ تماشہ بن جائیں گے لہٰذا پروردگار سے دُعا کرنا چاہیئے کہ وہ ہمیں پچھلی حالت پر ہی لوٹا دے۔ چنانچہ وہ لوگ دوبارہ زمین پر لیٹ گئے۔ جب کافی دیر ہو گئی اور کوئی غار سے باہر نہیں آیا تو بادشاہ اپنے ہمراہیوں کو لے کر غار میں داخل ہوا تو دیکھا کہ یہ تمام مُردہ پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے اس غار کو بند کروا کر اس پر عبادت خانہ بنوا دیا۔

جو لوگ حیاتِ بشریّت (پیکرِ انسانی) کے قائل نہیں اُن کے لئے یہ واقعہ درسِ عبرت کے واسطے کافی ہے۔ اگر عقلِ سلیم رکھتے ہوں۔ اصحابِ کہف زمرۂ انبیاء و مرسلین میں شامل نہیں

اور جہاں تک ان کی بشریّت کا تعلق ہے تو یقیناً یہ لوگ بھی بشر تھے۔ اس واقعہ سے مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں :۔

(۱) پہلے کافروں نے انھیں مُردہ قرار دیا۔ اور غار کے دہانے کو بند کروا کر اپنی دانست میں انھیں قبر میں بند کر دیا لیکن "۳۰۹" برس کے بعد یہ دوبارہ زندہ ہو گئے۔ جب یہ اُٹھ کر بیٹھ گئے تو ان میں کا ہر ایک باوجود "۳۰۹" برس تک بغیر آب و غذا رہنے کے اپنے جسم میں کسی قسم کی کمزوری و نقاہت محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ ان کی عقل و فکر، بینائی و سماعت اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔

(۲) وہ کون سی قوّت تھی جس نے انھیں بغیر آب و غذا کے تین صدی تک زندہ رکھا۔ باوجود مٹّی سے ملحق ہونے کے ان کا جسم بھی مٹّی نہ بن سکا، اور کیڑے مکوڑے ان کے جسموں کو نقصان نہ پہونچا سکے۔ جب اصحابِ کہف کے ساتھ پروردگارِ عالم نے اپنی قدرت اور عطا و بخشش کا مظاہر فرمایا کہ ان کے جسم بشری ہزاروں سال سے محفوظ ہیں اور فنا نہیں ہوتے تو کیا پروردگارِ عالم اپنے محبوب ترین بندے کے جسدِ بشری کو فنا کر دے گا جسے انبیاؑ و مرسلین کا اسی نے پیشوا اور امام بنایا ہے ؟

(۳) پہلے کافر انھیں مُردہ سمجھ رہے تھے لیکن تین صدیوں کے بعد جب یہ اُٹھ کر چلے پھرے اور پھر لیٹ گئے تو اس وقت کے صاحبانِ حق بھی انھیں مُردہ سمجھ کر ان کی موت کا یقین کر کے ان کے گرد دیوار اُٹھوا کر اس جگہ کو قبرستان بنا دیا۔ جبکہ قرآن ان بندوں کی حیات کا اعلان کر رہا ہے۔ جو ہزاروں سال سے مُردہ پڑے ہوئے ہیں۔ اصحابِ کہف بھی بشر تھے اور انھیں مُردہ سمجھنے والے بھی بشر تھے۔ مگر عالمِ بشریّت کا انھیں مُردہ سمجھنا کیا ان کی موت اور فنا کی سند ہو سکی ؟ قرآن میں کسی بھی واقعہ کا ذکر حکمت و عبرت سے خالی نہیں۔ حیات و موت پروردگار کے ہاتھوں میں ہے۔ جس کی ایک قدرت یہ بھی ہے کہ وہ مُردوں میں زندہ نکالتا ہے۔ اور زندوں میں سے مُردوں کو۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم جسے مُردہ سمجھ رہے ہیں۔

فی الواقع وہ موت ہی ہو۔ موت کے معنی ہے فنا ہو جانا۔ جبکہ اصحابِ کہف روح کے نکل جانے اور قبر میں دفن ہونے کے بعد بھی فنا نہیں ہوئے بلکہ ان پر ایک نیند کی کیفیت سی طاری ہے۔ کافر تو کافر، مومن بھی انھیں مُردہ گمان کرتے رہے۔ لیکن وہ زندہ ہیں اور انکی اس حیاتِ بشری پر شک کرنا درحقیقت خلّاقِ عالم کی صفت اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر پر ایمان و یقین نہ ہونے کے مترادف ہے۔

(۴) اصحابِ کہف گروہ انبیاء و مرسلین میں شامل نہ ہونے کے بعد بھی انھیں پروردگار نے اپنی رحمت سے اس طرح نوازا کہ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی ان کا پیکرِ بشری زندہ ہے (نہ خراب ہوا، نہ بوسیدہ ہوا اور نہ ہی مٹّی میں مل کر فنا ہوا) تو پیغمبرِ اکرمؐ تو خدا کے محبوب و مصطفےٰ بندے، سردارِ انبیاء، امام الاولیاء کرام ہیں۔ اگر آپؐ کا پیکرِ بشری بھی سلامت موجود ہے جسے حوادثِ زمانہ بوسیدہ نہ کر سکیں تو اس میں تعجّب اور بے یقینی کا کون سا مقام ہے اور اس میں حیرت و پریشانی کا کیا باعث ہے۔" ذالك فضل من اللّٰہ یوتیہ من الیشاء" یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرے۔

(۵) کیا اصحابِ کہف کے جسموں سے روح کا نکل جانا ان کے پیکرِ بشری کے فنا ہو جانے کی دلیل ہے؟ یہ سِرِ کمال ایمانی ہے کہ روح تن سے جدا ہونے کے بعد بھی روح اور تن میں رشتہ منقطع نہیں ہوتا جس طرح "۳۰۹" سال تک بظاہر جسم بغیر روح اور بے آب و غذا لوگوں کی نگاہوں میں بے حِس، بے حرکت پڑا رہا اور لوگ انھیں مُردہ بھی سمجھتے رہے لیکن ان کے پیکرِ بشری فنا نہیں ہوئے اور اب بھی ان کے اجسام محفوظ ہیں۔ اور قدرتِ الٰہی نے "۳۰۹" برس کے بعد ان بے روح اجسام کو پھر سے متحرک کر کے اپنی مخلوق کو اپنی قدرت کے عجائب کا مطالعہ کرنے کا موقع عنایت فرما دیا تاکہ لوگ اولیاء اللہ کی حیات و تصرّف کو اپنی ذات اور اپنے حیثیت پر منطبق نہ کریں۔ حیات النّبیؐ تو اس سے بہت ہی بلند و عظیم ہے۔ آپ حضرت امام حسینؑ کی مثال ملاحظہ فرمائیں کہ لشکرِ یزید جب آپ کے سرِ اقدس کو شہادت کے بعد آپ کے جسم سے

علحدہ کر کے یزید ملعون کے دار الخلافہ دمشق کی جانب لے کر روانہ ہوا تو آپ کا کٹا ہوا سر سورۂ کہف کی تلاوت کر رہا تھا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ امام عالی مقام نے قرآن مجید کے سینکڑوں سوروں میں سے صرف سورۂ کہف کا انتخاب فرمایا۔ شاید اِسے آپ نے اپنی موجود حیثیت کی وضاحت کے لئے پسند فرمایا ہو کہ جس طرح اصحابِ کہف، ایک ظالم و جابر اور بےدین بادشاہ کے خوف سے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ آپ بھی یزید کے جور و ستم اور قتل کر دیئے جانے کے خوف سے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے جس طرح اصحابِ کہف نے خالصتہً اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر راہِ خدا میں ہجرت فرمائی۔ امامؑ عالی مقام نے بھی انھیں حالات کے تحت ہجرت فرمائی۔ دوسرے یہ کہ تم جس طرح اصحابِ کہف کے معجزے کو عجائب قدرت کی نشانی سمجھتے ہو۔ میرے اِس کٹے ہوئے سر کے معجزے کو کچھ اور نہ سمجھنا یہ بھی عجائب قدرت کی ایک نشانی ہے۔ دیگر یہ کہ اصحابِ کہف جس بادشاہ کی حکومت سے ہجرت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے وہ حکمراں کافر تھا۔ لیکن جب اُسے اصحابِ کہف کی موت کا یقین ہو گیا تو اس نے ان کی لاشوں کی توہین، ان کے سروں کو تنوں سے جدا کر کے ان کی تشہیر اور بے حرمتی نہیں کی، بلکہ اسی غار میں رہنے دیا اور غار کو بند کر کے اُسے قبر کی حیثیت دے دی۔ لیکن بنی اُمیّہ کو خاندانِ رسُول سے اتنی شدید دشمنی اور نفرت ہے کہ وہ ہمیں قتل کر دینے کے بعد بھی بجائے دفن کرنے کے، ہمارے سروں کو کاٹ کر اور ناموسِ رسُول کو گرفتار کر کے شہر بہ شہر، دیار بہ دیار ذلیل و رُسوا کر کے اپنے اِسلام اور پیغمبرؐ دشمنی کے جذبات کو آسودہ کر رہے ہیں۔

(۶) اگر سرِ حسینؑ نے جسم سے علحدہ ہونے کے بعد متعدّد مقامات پر اپنی کراماتؑ اور حیات کا عملاً ثبوت پیش نہ کیا ہوتا تو آج حیات شہداء کی کوئی عملی مثال پیش نہیں کی جا سکتی تھی چنانچہ اَولیاءِ کرام، شہداء راہِ حق کی حیات تو ثابت ہے لیکن قرآن مجید میں تو ہجرت کرنیوالے اَور اپنے بستر پر فطری موت مرنے والوں کی بھی حیات مثل شہداء ثابت ہے اور مرنے کے بعد بھی

انھیں رزق مل رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ "اور جن لوگوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی، پھر قتل کر دیئے گئے یا اپنی موت مر گئے تو خدا انھیں رزق حسن عطا فرمائے گا۔" (سورۂ حج آیت ۵۸)

سورۂ حج کی اس آیت سے نہ صرف یہ کہ حیاتِ شہداء ثابت ہے بلکہ خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والے، بسترِ مرگ پر اپنی موت آپ مرنے والوں کی بھی حیات ثابت ہے اس لئے کہ رزق مُردوں کو نہیں دیا جاتا، رزق زندوں کو بقائے حیات کے قائم رکھنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ اور مُردے بعض حالات میں گو کہ وہ قبر میں مدفون ہی کیوں نہ ہوں وہ فنا نہیں ہوتے، یہ اور بات ہے کہ لوگ انھیں مُردہ سمجھتے ہوں۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں :-

"۱۳۵۲ھ ہجری میں تھانہ کرک فلسطین میں مزاری نام گاؤں ہے جہاں جعفرؑ طیّار کے نام سے معنون ایک مسجد اور سرائے ہے جس کو "سرائے مزور" کہتے ہیں۔ کھدائی کے سلسلے میں ایک سُرنگ برآمد ہوئی جس میں ایک کمرہ تھا، کمرے میں برابر سے سو لاشیں سپردِ خاک تھیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لاشیں جنگِ موتہ کے شہداء جناب جعفرؑ طیّار اور ان کے ساتھیوں کی ہیں سروں پر عمامے اور زخم تازہ تھے۔" (اخبار سرفراز لکھنؤ مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۳ء)۔ اور دوسرا واقعہ ۱۳۵۱ھ ہجری کا ہے، "امیر فیصل شاہِ عراق نے پیغمبرؐ کے جلیل القدر صحابی حضرت حذیفہؓ یمانی، حاکمِ مدائن اور حضرت جابر ابنِ عبداللہ انصاری کو خواب میں دیکھا کہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ہم کو ہماری قبروں سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کر دو، اس لئے کہ دریا کا پانی ہمارے جسموں کو نقصان پہونچا رہا ہے۔ چنانچہ ۲۰ ذی الحجہ کو حکومتِ عراق نے شاہی تزک و احتشام اور احترام کے ساتھ جنازہ اُٹھوایا اور لاکھوں مسلمانوں کو ان دو مقدّس صحابیوں کی زیارت کا شرف حاصل ہُوا۔ دونوں جسم بالکل محفوظ تھے۔ کفن بھی بوسیدہ نہیں ہوئے تھے۔ ڈاڑھیوں کے بال اور آنکھوں کی چمک برقرار تھی۔ بشیر الحسن فوٹو گرافر نے عکس حاصل کیا اور اخبارات میں حالات مشتہر ہوئے۔"

(اخبار الواعظ محرّم نمبر ۱۳۷۰ھ ہجری)

● جنگِ موتہ میں قتل ہونیوالوں کی لاشوں کا محفوظ رہنا اور بوسیدہ نہ ہونا تو اس امر کا

بیّن ثبوت ہے کہ "جو راہِ خدا میں قتل ہو جائیں انھیں مُردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں"۔ لیکن اس اَمر کا خیال رہے کہ جنگِ موتہ میں شہید ہونے والے بھی بشر ہی تھے، فرشتے یا مافوق البشر ہستیاں نہ تھیں۔ مگر ان کے اَجسام (یعنی پیکرِ بشریت) ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی فنا نہیں ہوئے۔

● حضرت جابر ابنِ عبداللہ اَنصاری نے نہ ہجرت فرمائی اور نہ ہی کسی جنگ میں شہید ہوئے لیکن اِن کا پیکرِ بشریت بھی سینکڑوں سال کے بعد بھی صحیح و سلامت پایا گیا۔ اَب سوائے اس کے اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ آپ (جابرؓ) نے یہ مرتبہ علم و معرفت، ایمان و یقینِ کامل، زُہد و تقویٰ اور خدمت و غلامیٔ پیغمبرِ اسلام کی بدولت حاصل کیا چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ:-
"جب کوئی بندہ اپنے اعمال (نوافل و مستحبات) کے ذریعہ مجھ سے قریب ہو جاتا ہے تو اُسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اُس کے وہ کان بَن جاتا ہوں جس سے وہ سُنتا ہے۔ اُس کی آنکھ بَن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اُس کی زبان بَن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے"۔ جب بشریّت اس منزلِ قُربِ الٰہی پر فائز ہوتی ہے کہ خداوندِ عالم اس کا ہاتھ، اس کا کان، اس کی زبان، اس کی آنکھ بَن جاتا ہے۔ تو پھر اس جسمِ انسانی کے کِس حصّہ کے لئے فنا کے تصوّر کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ان بندوں کا تذکرہ ہے جو صرف خدا کی محبّت کے حامل ہیں جنکا ذکر سورۂ الحج میں اس طرح سے ہُوا ہے کہ "والّذین ھاجروا فی سبیل اللہ ثمّ قتلوا او ماتوا لیرزقنّھم رزقاً حسناً ط اور جن لوگوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی پھر قتل ہو گئے یا (اپنی موت) مَر گئے تو انھیں رزق حسن عطا کیا جائے گا (سورۂ الحج آیت ۵۸) شہید کیلئے صرف رزق کا وعدہ ہے یہاں پر قتل کے علاوہ اپنی طبعی موت مَرنے والوں کے لئے رزقِ حسن کا وَعدۂ الٰہی ہے۔ اَور رِزق زندوں کو دیا جاتا ہے، مُردوں کو نہیں۔ یہ اَور بات ہے کہ ہماری فکرِ ناقِص اس کا مشاہدہ کرنے کے شعور سے عاری ہی رہے۔ لیکن حیات ان مَرنے والوں کی قرآن کی روشنی میں ثابت ہے۔ جیساکہ حضرت جابر ابنِ عبداللہ اَنصاری کے صحیح و

سالم جسم کا لاکھوں انسانوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرمایا جو کہ کسی سابقہ اُمّت کا واقعہ یا افسانوی داستان نہیں بلکہ نصف صدی پہلے کا واقعہ ہے اور دیکھنے والے حضرات بھی ابھی زندہ ہوں گے۔ جب اِتّباع و اِطاعت اور محبّت و غلامی پیغمبرِ اَطہر کا یہ صِلہ ہے کہ غلاموں کے اَجسام فنا نہیں ہوتے تو پھر انبیاء، مُرسلین، اَولیاء اللہ اور خصوصاً سرکارِ دو عالم کا جسمِ اَطہر نورانی کیونکر فنا ہو سکتا ہے ؎

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
تری حیات کے مرکز سے دُور رہتا ہے (اقبالؔ)

● موت فنا نہیں تمہیدِ حیات ہے۔ سیرِ تکمیل بشریّت ہے۔ خون تبدیل ہو کر نُطفہ بنا۔ نُطفہ کا اِنتقال ہوا تو پھر خون بنا، خون میں تبدیلی آئی تو مُضغہ (لوتھڑا بنا) پھر گوشت، گوشت میں سے ہڈّیاں پیدا ہوئیں، ڈھانچہ بنا اور اس طرح اتنے اِنتقال (موت) کی منازل سے گزرنے کے بعد یہ اِنسان پیدا ہوا جسے آپ موت سمجھ رہے ہیں۔ یہ تمام مراحل موت نہیں بلکہ مستقل اور پے بہ پے سفرِ انسانیت ہیں۔ اِس کے بعد طِفلی، پھر جوانی، اس کے بعد بڑھاپا اور پھر جس طرح زمین پر آئے تھے پھر زمین میں داخل کر دیئے گئے۔ یہ تمام منزلیں مسلسل سفر ہیں۔ زندگی معرفت و بندگی کے ساتھ تکلیفِ شرعی کا نام ہے۔ زندگی درحقیقت رُوح کا ایک مرکزِ عمل ہے۔ زندگی رُوح کے لئے ایک فعال دائرۂ عمل۔ موت جو رُوح کے کشتِ عمل کی باریابی کی ایک منزل ہے اور یقیناً حیات ہے فنا نہیں ہے یعنی زندگی اَجسامِ بشری اس کی صلاحیتوں میں تحریکِ فکر و عمل کا نام ہے۔ اور موت رُوح کا جسم سے علیٰحدہ ہو کر اپنی جزا و سزا کے اِنتظار کا نام ہے۔ رُوح کا جسموں سے علیٰحدہ ہو جانا فنا نہیں بلکہ تکلیفِ شرعی سے نجات کا حاصل ہونا ہے۔ اور نہ ہی تمام اَرواح کے لئے جسموں سے علیٰحدہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے جسموں، حالات و ماحول سے بیخبر ہیں۔ اور نہ ہی جسموں کے ساتھ رُوحوں کا رِشتہ کلّیتہً منقطع ہو جاتا ہے۔ بلکہ رُوح کا رابطہ اپنے جسموں سے مسلسل قائم ہے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ ابنِ عبداللہ انصاری کے واقعہ سے ظاہر ہے کہ انھیں اپنی قبر، اپنے جسم کو

دریا کے پانی سے نقصان پہونچنے کے علم کے ساتھ یہ بھی اختیار تھا کہ وہ حالات سے بیخبر زندوں کے خواب میں آکر حالات کی اطلاع دے گئے جبکہ یہ زندہ ہونے کے بعد بھی بے خبر تھے۔ کیا ان مشاہدات کے بعد بھی یہ کہنا کہ "اے نبیؐ! آپ قبر والوں کو نہیں سنا سکتے" کج فہمی، بے معرفتی اور بے علمی کے سوا اور کیا ہے، اگر ایسا نہیں تو یہ عمداً توہین انبیاءؑ اور سرکارِ دو عالم کی شان میں بدترین گستاخی کے مترادف ہے۔ پروردگارِ عالم، جناب رسالتمآب کے صدقہ میں ان بدعقیدہ لوگوں کی تصنیفات و عقائد سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔

مومن کی موت فنا نہیں بلکہ حیاتِ ابدی کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس حیاتِ خاموش اور غیر متحرک جسم کا صرف اور صرف یہ مقصد ہے کہ " اور آگے چلیں گے دم لے کر"۔ اسلام میں حیات و موت کا فلسفہ کچھ اور ہے جیسا کہ قرآن نے چلتے پھرتے ہوئے لوگوں کو مردہ کہا ہے، سانسیں لینے والوں کو جنازے کہا ہے۔ "اِنَّھُم مَّیِّتُونَ" اے نبیؐ! آپ کی باتیں نہیں سن سکتے۔ جس طرح یہ میری نگاہوں میں میّت ہیں اسی طرح آپؐ ان کی نگاہوں میں میّت ہیں کہ آپؐ ان کی مشرکانہ اور کافرانہ عمل کو اختیار نہیں کر سکتے۔ "اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُم مَّیِّتُونَ ؁" کے یہی معنی ہیں۔ جب مومن و کافر کی موت ہم پلّہ اور برابر نہیں تو پھر سرکارِ دو عالم کے منازل سفر کو پروردگارِ عالم کافروں کے موت کے برابر قرار دے کر اپنے نبیؐ کی توہین کیونکر کر سکتا ہے۔ اب رہا خارجیت کا لکھنا اور پڑھنا اور ان کا اس پر عقیدہ رکھنا تو یہ انھیں ہی مبارک ہو۔ مومن تو ایسا گمان بھی نہیں کر سکتا۔

اگر بنی اُمیّہ اور ان میں بھی بالخصوص ابوسفیان جو آنحضرتؐ کی موت کا خواہاں تھا تو اس کی اس دشمنی کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ آنحضرتؐ نے بنی اُمیّہ کے آبائی دین بت پرستی کو باطل قرار دے دیا تھا جس کی وجہ سے ابوسفیان اور اس کے ہمنوا آپؐ کے دشمنِ جانی ہو گئے تھے۔ مگر آج ان کلمہ گویوں کو کیا ہوا کہ وہ سرکارِ دو عالم کی موت کے خواہاں ہو رہے ہیں۔ اور آپؐ کی حیاتِ نبوی ان کی طبیعتوں پر بارِ گراں ہے۔ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے کہ

" بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر قرآن کو نازل کیا تاکہ تمام عالم کے لئے (خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا ہے۔ (سورۂ فرقان آیت ملہ) "

اب تک تو خارجیت آپؐ کی نبوّت و رسالت ہی کی بحث میں الجھی ہوئی ہے۔ اور اُن کی سمجھ میں آپؐ کا وجود نورانیت و روحانیت نہیں آسکا لیکن قرآن نے تو صرف آپکی ایک حیثیت (عبد) کو اختیار کر کے آپؐ کو بحیثیت بشر کے عالمین کے لئے نذیر قرار دیدیا ہے۔ تو آپ اب یہ بتائیں کہ آپ کس محمدؐ کی وفات کے قائل ہیں، آیا اُس محمدؐ کی وفات کے جو " محمدؐ رسول اللہ " ہیں۔ یا اُس محمدؐ کی وفات کے قائل ہیں جو " عبداللہ " بندۂ خدا یعنی بشر ہیں؟ اور جو بحیثیت " نذیر " آج بھی عالمین میں موجود ہیں۔ مگر اِس بات کا احساس رہے کہ یہ قرآن ہے کوئی حدیث اور تاریخ نہیں جس کا انکار یا من مانی تاویل کیجاسکے۔ اور قرآن کا انکار آپ اُمّتِ محمدیہ میں رہتے ہوئے نہیں کر سکتے۔

بشریتِ انبیأ علیہ السّلام

جس طرح جمادات سے قوّتِ نمو کی وجہ سے نباتات بہتر اور الگ ہیں اسی طرح نباتات سے حیوانات قوّتِ ارادہ اختیار رکھنے کی بناء پر حیثیت و وجود اور قدر قیمت میں بہتر و اعلیٰ ہیں۔ اسی طرح اِنسان جبکہ یہ بھی حیوان ہی ہے لیکن قوّتِ نُطق (اور عقل) کے حامل ہونے کی وجہ سے حیوانِ محض سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ مگر انسان (بشر) جنسِ حیوانی ہونے کے باوجود اِسے حیوان نہ تو سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی کہا جاتا ہے۔ اِس لئے کہ نُطق و عقل کے حامل ہونے کے بعد بشریّت حیوانِ محض سے مُمیّز و ممتاز ہو جاتی ہے۔ اور یہ جنس میں حیوان ہونے کے باوجود نوعِ بشریّت اس سے مختلف اور بلند و برتر ہو جاتی ہے اور بشریت حیوانِ محض سے حیوانِ ناطق کے اِمتیاز سے موسوم ہو جاتی ہے جو یقیناً حیوانِ محض سے منزلت و درجات اور قدر و قیمت میں مختلف ہے۔ اِسی طرح انبیاء و مُرسلین علیہم السّلام جس پیکرِ بشری میں مبعوث ہوئے وہ بھی یقیناً جنس میں بشریّت سے مختلف کوئی دوسرا پیکر نہ تھا۔ مگر علم و حکمت، نبوّت و عصمت اور طہارت عقل و فکر کی وجہ سے بشر محض پر انھیں افضلیت حاصل ہے۔

جس کی بناء پر تمام انبیاء و مُرسلین علیہم السّلام جنس بشری میں ہونے کے باوجود نوعی حیثیت میں عام بشری جنس سے ارفع و اعلیٰ درجات کے حامل ہیں۔ اور اُن کی نوع عام انسانی نوع سے بلند و بالا ہے۔ جیساکہ عام انسان فطرتاً جاہل و بےعلم اور بےعقل پیدا ہوتے ہیں۔ اور جسمانی و فکری نشو و نما کے ساتھ اُن کی عقل و فکر مشاہدے اور تجربات سے باخبر ہو کر علم

حاصل کرتی ہے۔ اور دوسرے انسانوں کے مشاہدات و تجربات سے اس کی عقل و فکر رَدّ و قبول اور اثبات و نفی کی بتدریج شعور اور امتیاز حاصل کرتی ہے۔ انبیاءِ کرام اس جیسے نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ حیوانِ ناطق کی طرح بے عقل، بے علم و معرفت ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ دوسرے انسانوں کے مشاہدات و تجربات و رہبری کے محتاج و مجبور ہوتے ہیں، بلکہ وہ فطرتاً معصوم، صاحبِ علم و حکمت اور علمِ لدُنّی کے حامل ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے دَور میں کردار و عمل اور طہارت عقل و فکر میں تمام انسانوں سے افضل و اعلیٰ ہوتے ہیں۔ انکی مماثلت بشری صرف جنس بشر کے اعتبار سے مذکور ہوئی ہے۔ فکر و عمل، علم و حکمت کے ساتھ نوعی حیثیت میں وہ بہر طور عمومی سطحِ انسانی سے یقیناً بلند و برتر ہیں۔ انھیں یہ امتیاز بحیثیت حجّتِ خدا، نبی و رسول اور ولایتِ الٰہیّہ کے درجے پر فائز ہونیکی بنا پر حاصل ہے۔

جیسا کہ قرآن میں حضرت یحییٰ کے صاحبِ علم و حکمت ہونے کا اس وقت مذکور ہے جبکہ وہ ابھی طفل تھے اور دوسری مثال قرآن میں حضرت عیسیٰ کی ہے کہ آپ نے صاحبِ کتاب (علم و حکمت) اور نبوّت کے حامل ہونے کا اُس وقت اعلان فرمایا جبکہ آپ کی عمر ابھی صرف چند یوم ہی کی تھی۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ انبیاء و مرسلین علیہم السّلام کی نوعِ بشریّت عام بشریّت سے بلند و اعلیٰ ہے۔ انبیاء و رُسل کو عام سطحِ بشریّت پر گمان کرنے والے یا تو تاریخ انبیاء و رُسل سے ناواقف ہیں، یا کسی ذاتی منفعت و مصلحت کی بناء پر ایسا کر رہے ہیں، یا پھر یہ عمداً توہینِ انبیاء و مرسلین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

جہاں تک قرآن کا تعلّق ہے تو وہ ان کفّار کے قول کا ذکر کر رہا ہے جو رسُولوں کو اپنا جیسا بشر سمجھتے تھے۔ ورنہ جہاں بھی قرآن نے بشریتِ انبیاء و رُسل کا ذکر کیا ہے تو اُن کے عُہدے، درجات و حیثیت کی قید کے ساتھ کیا ہے۔ جیسے کہیں پر حجّت، صاحبِ وحی، صاحبِ امر، بشیر و نذیر اور کہیں پر ہادی و شاہد اور رسول کی قید لگا کر عام بشریّت سے مُمیّز و مُمتاز قرار دیا ہے۔ قرآن میں حضرت موسیٰ و حضرت ہارونؑ کے لئے کافروں کا یہ قول مذکور ہُوا

ہے کہ "کیا ہم اپنے جیسے دو بشر پر ایمان لائیں یا پھر "مَا اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ" یعنی تم تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو۔ "اِنْ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ" "تم بشر ہی ہو نا۔" ان آیاتِ قرآنی کی روشنی میں یہ امر واضح ہوتا ہے کہ کافروں کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا کے رسولوں کو ہمارے جیسا بشر نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ ہم سے بلند یعنی کسی ما فوق البشر ہستی کو رسول ہونا چاہیئے۔ وہ لوگ کافر و مشرک ہونے کے ساتھ انبیاءِ کرام کے دشمن بھی تھے۔ لیکن ان کی عقل و فکر کا یہ رُخ منصبِ نبوّت کے بارے میں قابلِ غور ہے کہ وہ اپنے ہادی و رہبر کو عام سطحِ انسانی اور اپنی عام بشریّت سے ارفع و اعلیٰ قرار دینے پر مُصر تھے۔ اور جب تک انبیاءِ کرام کی عظمت و بزرگی اور ما فوق البشر کراماتؑ معجزات کا مشاہدہ نہ کر لیا ایمان نہیں لائے۔ برخلاف اسلام میں ایک مخصوص اور بد نصیب ٹولے کے جو نبیؐ اکرم کو نبی بھی تسلیم کرتا ہے۔ آپؐ کا کلمہ بھی پڑھتا ہے اس کے باوجود وہ نبیؐ کو سہو و نسیان کا خوگر بھی گردانتا ہے۔ اور اپنے جیسا خطا کار بشر بھی گمان کرتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمام بد اعتقادی اور شانِ رسالت میں گستاخی آیت میں "بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کے لفظ "مِثْلُکُمْ" کے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے تو آیئے ان امثالِ قرآنی اور لفظ "بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" پر غور کریں۔

ہر پیکرِ بشری میں نظر آنے والی شخصیت جنس میں بشر نہیں ہوتی ہے اور قرآن نے بحیثیت مخلوق یا پیکرِ بشری میں نظر آنے کی وجہ (یعنی پیکرِ بشری میں مماثل ہونے کی وجہ) سے انھیں "بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کہا ہے۔ جیسا کہ حضرت لوطؑ نے دو فرشتوں کو پیکرِ بشری میں دیکھ کر انھیں بشر سمجھا اور آپ کی لڑکیوں کے ساتھ آپ کی قوم، انھیں بشر ہی سمجھتے رہی۔ جبکہ انکی جنس بشریّت سے علٰحدہ (نوری) تھی لیکن مماثل پیکرِ بشری کی بناء پر وہ بشر سمجھے گئے۔

دوسری مثال حضرت جبرئیلؑ کی ہے کہ آپ متعدد بار پیکرِ بشری یعنی دحیۂ کلبی کی شکل میں پیغمبرِؐ اکرم کے حضور آتے رہے اور اصحابِ کرام انھیں بشر گمان کرتے رہے تو کیا جبرئیلِؑ امین کا اس پیکرِ بشری میں آنا اس امر کی دلیل بن سکتا ہے وہ عام بشری تقاضوں اور غلبہ کے تابع تھے۔ ان کا مثلِ بشر (پیکرِ بشری میں) ہونا ان کی حیثیت (نورانیت) کی نفی

کے لئے دلیل بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ مریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم میں نے جبرئیلؑ کو مریمؑ کے پاس بھیجا جو مثلِ بشر کے مریمؑ کے سامنے جا کھڑا ہوا (سورۂ مریم آیت ۱۷)" جبرئیلؑ کا مثل بشر نظر آنا اور حضرت مریمؑ کا انہیں اپنا جیسا بشر سمجھنا کیا فرشتے کی جنس (نورانیت) کی نفی کر سکتا ہے؟ اور اس کی یہ عارضی مماثلتِ بشری اس کے درجے کو پست یا تبدیل کر دینے کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح پیغمبرِ خاتمؐ کی حیثیت وجود نورانی جو ہدایتِ خلق کیلئے پیکرِ بشری میں تشریف لائے تو کیا اس سے آپؐ کے وجود نورانی کی (معاذ اللہ) نفی قرار دیا جا سکتا ہے یا انہیں عام بشری تقاضوں سے مغلوب گمان کیا جا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ فرشتوں کا جسمِ نورانیت سے پیکرِ بشریت کو اختیار کرنا اور پھر پیکرِ بشری سے عالمِ نورانیت میں منتقل ہونا ان کی موت (یعنی فنا) کی دلیل ہو سکتا ہے۔ تو پھر پیغمبرِ اکرمؐ جو یقیناً وجود نورانی کے حامل تھے اور فرشتوں سے بہتر و اعلیٰ آپؐ کی نورانیت ہے آپؐ کا نورانیت سے پیکرِ بشری میں تشریف لانا اور پھر پیکرِ بشری سے عالمِ نورانیت کی طرف انتقال کرنا کیا اس پر موت (یعنی فنا) کا گمان لازم ہو سکتا ہے؟

اس کے علاوہ میثاقِ انبیاء کے بارے میں بھی غور فرمایئے کہ پروردگارِ عالم اپنے حبیب سرکارِ دو عالمؐ کی توجہ عالمِ ارواح میں گزرے ہوئے اس واقعہ کی طرف مبذول فرما رہا ہے جبکہ تمام انبیاء و مرسلین سے آپؐ کی نبوت و امامت کا اقرار لیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ "یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا جب میں تم کو کتاب حکمت دوں پھر تمہاری طرف تشریف لائے وہ رسولؐ جو تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا۔ کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا۔ سب نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ تو فرمایا (پروردگار نے) ایک دوسرے پر گواہ بن جاؤ اور میں تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔ اب جو کوئی اس عہد سے منحرف ہوگا وہی فاسق ہے" (آلِ عمران آیت ۸۱-۸۲) (ترجمہ از کنز الایمان، احمد رضا خاں مرحوم، وہ لوگ جو آنحضرتؐ کی محض بشریت کے قائل

ہیں اور آپؐ کی حیثیت نورانیت کے منکر ہیں، انھیں چاہیئے کہ وہ ان آیاتِ قرآنی میں غور و فکر کریں کہ ابھی پیکرِ آدمؑ بھی تیار نہیں ہوا ہے اور آپؐ کی نبوّت و رسالت کا عہد پروردگارِ عالم، عالمِ ارواح میں نبیّوں سے لے رہا ہے کہ وہ آپؐ پر ایمان لائیں اور نصرت کریں جس سے یہ امر واضح ہے کہ آپؐ پیکرِ بشری میں تشریف لانے سے قبل عالمِ انوار میں صاحبِ نبوّت تھے، اور سرکارِ دو عالمؐ ان انبیاء کرام کی کتابوں کے اس وقت بھی عالم تھے تبھی تو آپؐ ان کی کتابوں کے تصدیق کنندہ قرار پائے۔

جب تمام انبیاءؑ و رسُل، آنحضرتؐ پر عالمِ ارواح ہی میں ایمان لائے اور انھوں نے آپؐ کی نصرت کا عہد کیا تو آپؐ کے مومن اور امّتی ہوئے۔ تو جب حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ جیسے نبیؑ اولوالعزم، آپؐ کے مومن اور امّتی ہیں (برابر نہیں) اور آپؐ کی عظمت و بزرگی، درجات و منزلت تمام انبیاءِ کرام پر ثابت ہے۔ تو اس کے بعد پھر کس بد نصیب میں یہ جراُت و جسارت پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ امّتِ پیغمبرِ اکرمؐ میں بھی ہو اور خود کو رسولؐ جیسا یا پیغمبرؐ کو اپنے جیسا بشر بھی گمان کرے۔ (معاذ اللہ) چنانچہ مولانا نعیم الدّین صاحب متذکرہ بالا آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور ان کے بعد جس کسی کو بھی نبوّت عطا فرمائی اُن سے سیّدالانبیاء حضرت محمدؐ کی نسبت عہد لیا اور ان انبیاء نے اپنی قوموں سے عہد لیا کہ اگر ان کی حیات میں سیّدِ عالمؐ مبعوث ہوں تو وہ آپؐ پر ایمان لائیں اور آپؐ کی نصرت کریں۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضورؐ تمام انبیاءؑ میں سب سے افضل ہیں (کنز الایمان ص۸۲)" جس سے ثابت ہوا کہ آپؐ پیکرِ بشری میں تشریف لانے کے بعد اور چالیس سالہ حیاتِ بشری گزار دینے کے بعد نبی نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ آپؐ پیکرِ بشریت میں تشریف لانے سے بہت پہلے عالمِ نورانیت میں منصبِ نبوّت و رسالت سے سرفراز تھے۔

مورّخینِ اسلام کی دیانتداری کا تقاضہ یہ تھا کہ تاریخِ اسلام کو وہ مخلوقِ اوّل

نورِ اوّل، عقلِ اوّل سے شروع کرتے جو کہ صاحب نبوّت و رسالت تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس، ابنِ جُبیر اور ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ سے سوال کیا گیا کہ آپؐ پر نبوت کب واجب ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا کہ "جب آدمؑ، مٹّی اور پانی کے درمیان تھے۔ میں اس وقت نبی تھا"۔ سوال کرنے والے کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ نے تبلیغ کب سے شروع کی۔ جب آپؐ کی نبوّت تخلیقِ آدمؑ سے قبل ہے تو یقیناً پیدائش اس سے بھی قبل ہوئی۔ لہٰذا سیرت نگاروں اور مورّخینِ اسلام کا یہ فرضِ اوّلین تھا کہ تاریخ اسلام اور حضورِ پُرنور کی خلقت کو عالمِ انوار سے شروع کرنا تھا، نہ کہ ربیع الاوّل کی محدود اور مادّی تاریخ سے۔ لیکن تاجدارانِ مملکت اور ان کے ہمنواؤں کا عقیدہ ہی اس کے برعکس ہے۔ بحمد اللہ اہلِ سُنّت اور اہلِ تشیع کا نظریہ اور عقیدہ یہ ہے کہ کائنات نہ تھی، عناصر اربعہ نہ تھے اور نہ ہی بنی اُمیّہ اور بنی عباس کے دُنیاوی تاجداروں کی ابھی روحیں خلق ہوئی تھیں لیکن کوئی معصوم عقل اور نورانی وجود اور با معرفت مخلوق قربِ الٰہی میں تسبیح و تقدیسِ خالق میں مصروف تھی جبکہ بشریّت تو کجا ابھی مٹّی (یعنی زمین) کو بھی وجود عطا نہیں ہوا تھا۔ اور جب عقل و نور سے ابتداء ہے تو پھر دین بھی عقل والوں کے لئے ہے۔ اور شافعِ محشر بھی عقل و نور ہے۔ اب اگر کوئی عقل سے تہی دامن ہو تو پھر اس کی سمجھ میں عقلِ اوّل کی حیثیت و وجود کیونکر آسکتا ہے۔ اور تکلیفِ شرعی بھی عقل کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ دین بے عقلوں (حیوانوں) کے لئے نہیں ہے۔ اور معرفتِ الٰہی، معرفتِ دین و پیغمبر بھی صاحبانِ عقل صحیح کو حاصل ہے۔ عصمتِ انبیاء کے بارے میں معصومؑ سے پوچھا گیا کہ عصمت کیا ہے؟ "فرمایا ظلمت سے دوری نور ہی نور"۔ لیکن تاریخِ اسلام ظلمت (دورِ جاہلیّت) سے شروع کی گئی ہے تو نورانیت سمجھ میں آئے تو کیونکر۔

اگر تاریخِ اسلام کو عقلِ اوّل اور نورِ اوّل سے شروع نہیں کیا گیا تھا تو میثاقِ انبیاءؑ سے شروع کرتے۔ اگر یہاں بھی مورّخین دھوکہ کھا گئے تھے تو حضرت آدمؑ جو پہلے بشر اور پہلے نبی

ہیں جن سے تاریخِ انسانیت کی ابتداء ہوئی ان کی حیات سے تاریخِ اسلام کو شروع کرنا تھا۔ اور اگر تاریخِ اسلام کو لفظ "اسلام" کی قید اور تاریخ استعمال سے شروع کرنے کی ضد تھی تو اسے پھر حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہونا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ربّ العزّت ہے کہ "یاد کرو اپنے باپ ابراہیمؑ کے دین کو جنھوں نے سب سے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا" اور حضرت ابراہیمؑ کا قول قرآن یوں دُہراتا ہے کہ "میں پہلا مسلمان ہوں" لیکن ان تمام حقائق اسلامی کا عمداً انکار کر کے تاریخ اسلام کو نورانیتِ انبیاء سے شروع کرنے کے بجائے دَورِ جاہلیّت سے شروع کیا گیا تاکہ شاہانِ دُنیا کے آبا و اجداد جو کفر کے عالم میں مر گئے اور سرکارِ دو عالم کے مُسلم آبا و اجداد دُونوں (یعنی مُسلم و کافر) کی حیثیت اور سطح کو برابر قرار دے دیا جائے جس کے بعد مورّخین و محدّثین کو یہ لکھنے میں کسی قسم کی حیا و شرم محسوس نہ ہو کہ آنحضرتؐ کے آبا و اجداد بھی دَورِ جاہلیّت میں کافر مرے۔ اِس منصوبے کے تحت دَورِ فترت[1] کو دَورِ جاہلیّت قرار دیا گیا۔ اگر تاریخِ اسلام عالمِ نورانیت سے شروع کی جاتی تو آپؐ کی حیثیت و وجود میں سوائے عصمت و طہارت کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔ مگر تاریخِ اسلام کو دَورِ جاہلیّت سے شروع کرنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ آپ، محمّد رسول اللہ کے بجائے محمّد ابنِ عبداللہ دِکھائی دیں، اور اِس طرح نبوّت و رسالت کی سطح اور ملوکیت و شہنشاہیت کی سطح مساوی اور برابر کر دی گئی۔

اگر تاریخِ اسلام اور آپؐ کی سیرت و ممات و حیات پر قلم اُٹھانا ہی تھا تو سب سے بہتر مواد قرآن سے حاصل ہو سکتا تھا، یا پھر آپؐ کے ارشادات و اقوال کی روشنی میں سیرتِ نبویؐ کو مُرتّب کیا جاتا جیسا کہ آپؐ خود فرماتے ہیں کہ "میں خلقت کے اعتبار سے عالمِ انسانیت میں پہلا ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب سے آخر ہوں، اللہ نے جب خلقت کا آغاز کیا تو مجھے بہترین حصّے میں رکھا۔ جب مخلوق کو مختلف فرقوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کیا تو مجھے بہترین

---

[1] وہ وقفہ جو ایک نبی سے دوسرے نبی کے درمیان ہوتا ہے۔

فرقے میں رکھّا اور جب فرقوں کو قبیلوں کی شکل دی تو مجھے بہترین قبیلے میں رکھّا اور جب قبیلوںکو گھروں اور بیتوں میں جگہ دی تو مجھے بہترین بیت میں رکھّا۔ اِس لئے میں نفس کے اعتبار سے تم سے بہتر ہوں' (کنزالعمّال)"۔ جب انبیاءِ کرام کے نورانی بیت سمجھ میں آجاتے تو پھر اہلِ بیت کے سمجھنے اور اُن کی معرفت میں یہ حیرانی و پریشانی باقی نہ رہتی۔ اور انبیاءِ کرام کے عِصمت و طہارت سے منافی روایات کو عقل تسلیم کرنے سے اِنکار کر دیتی۔ اور جب انبیاءِ کرام کے وجود نورانیت کو عقلِ سلیم قبول کر لیتی تو پھر آدمؑ گناہگاروں کی صف میں دکھائی نہ دیتے اور نہ ہی پھر حضرت نوحؑ پر الزام و بہتان کو قبول کرتے۔ اگر انبیاءِ کرام کی عِصمت و نبوّت سے دِل و دماغ منوّر ہوتے تو حضرت ابراہیمؑ پر تین بار جھوٹ بولنے کے اِلزام کو اپنی کتابوں میں نہ لکھتے۔ اور حضرت موسیٰؑ ہاتھوں میں عصاء لئے ہوئے برہنہ حالت میں ایک پتھّر کے پیچھے بھاگتے ہوئے نہ دِکھائی دیتے۔ انبیاءِ ماسبق کی ذواتِ مقدّسہ پر اِلزام لگانے والی زبانیں، بُہتان باندھنے والی عقلیں اور نقائص تلاش کرنے والی بیہودہ فکریں خود اپنے ہی نبی کی اعلیٰ فکر و عقل، پاکیزہ کردار و عمل اور عصمت و طہارت کو نقائص و گناہگاری کی عقل اور بے معرفتی و کم عِلمی کی نگاہوں سے دیکھنے کی خوگر ہو گئیں۔ اور یہ کہنے میں کوئی باک، کوئی شرم محسوس نہ کی کہ نبیؐ سے دَورِ جاہلیت میں گناہ سرزد ہوئے جسے پروردِگارِ عالم نے معاف کر دیا (اگلے اور پچھلے گناہ) پچھلے گناہوں سے مقصد دَورِ جاہلیّت کے گناہ اور اگلے گناہوں سے مراد منصبِ نبوّت پر فائز ہونے کے بعد کے گناہ (معاذ اللہ) یہ اقتدار و حکومت کے قائم کردہ علماءِ سُو اور ان کے مکتب کی کارگزاریاں ہیں جنھوں نے صاحبانِ اقتدار کو خوش کرنے کی خاطر اس آیت کی تاویل اپنی منفعت بخش مصلحت دُنیاوی کی خاطر کر ڈالی۔ اگر انھیں شمّہ برابر بھی اِسلام اور عظمتِ مصطفےٰؐ کا پاس و لحاظ ہوتا تو اس محکم آیت " عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ط " کی محکم تفسیر سے رُوگردانی نہ کرتے۔ اور " مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ مَاغَوٰی ط " کی تفسیر دیکھنے کے بعد دربارِ سیاسی سے دامن کش ہو جاتے یا پھر اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ کر آپ مر جاتے۔ عِلم و حکمت

اور عصمت و طہارت کے دروازوں کو چھوڑ کر سلاطینِ دُنیا سے بھیک مانگنے اور انکی حاشیہ نشینی کا یہی صلہ تھا کہ ایمان و یقین، دین و دیانت سے دُور ہو کر شیطان کی حرص و ہَوس کے شکار ہو گئے اور یہ اسی مکتبِ فکر کا دستورِ اسلامی ہے کہ "اگر کوئی شخص تلوار اور قوت کے بل بوتے پر اسلامی معاشرے پر غلبہ حاصل کرے اور خلیفہ بن جائے اور امیر المومنین کہلانے لگے تو پھر جو شخص اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے جائز اور روا نہیں ہے کہ رات کو اس حالت میں دن تک لے جائے کہ اُسے امام نہ سمجھتا ہو۔ خواہ خلیفہ ایک بدکردار شخص ہو یا پاکدامن"۔ مگر علامہ فضل اللہ ابنِ روزبہان نے تو الماوردی، امام غزالی، ابنِ تیمیہ، ابنِ قیم، ابنِ انباری اور ابنِ خلدون کو بھی اقتدار پرست ذہنیت میں ہزاروں میل پیچھے چھوڑ دیا، آپ فرماتے ہیں کہ۔

"بادشاہت اور امامت کے قیام کا چوتھا طریقہ غلبہ اور طاقت ہے علماء نے کہا ہے کہ جب ایک امام فوت ہو جائے اور کوئی شخص بغیر اس کے کہ کوئی اس کی بیعت کرے یا اُسے خلیفہ بنائے۔ امامت کا کاروبار سنبھال لے اور قوت و لشکر کے ذریعہ لوگوں کو زیر کرلے تو بغیر بیعت کے اسکی امامت قائم ہو جاتی ہے قطع نظر اس کے کہ وہ قریشی ہو، عرب ہو، عجمی ہو، یا ترک ہو اور خواہ وہ امامت کی شرائط پوری کرتا ہو یا فاسق و جاہل ہو اُس پر خلیفہ اور امام کے نام کا اطلاق ہو سکتا ہے" (ملوک وسلوک ص۴۷)۔

قارئین نے غور فرمایا کہ چھین جھپٹ اور ظلم و جور سے حکومتِ دُنیا کو حاصل کرنے والے کو بھی لفظ امام اور خلیفہ کے جامۂ تقدّس میں چھپا دیا گیا اور سیاسی فرمانروا کو بھی امام اور خلیفہ سمجھنے کی تاکید ہے چاہے وہ جیسا بھی ہو جبکہ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ ظالم امام نہیں ہو سکتا اور تم میں مکرّم وہی ہے جو صاحب تقویٰ ہے لیکن علامہ موصوف کی نگاہوں میں اطاعتِ خدا و رسُول کی قید نہیں، جو بھی ظلم و جور اور جبر و ستم سے حکومتِ اسلامی پر قابض ہو جائے وہ امام اور خلیفہ ہوگا اور ملّت کو اس سے اختلاف و اعراض کا حق حاصل نہیں، اقتدار پرست ذہنیتوں نے خود کو اسلام اور قرآن کا تابع کرنا گوارہ نہیں کیا بلکہ خود اسلام اور قرآن کو اپنی حرص و ہوس کا تابع بنایا۔

پیکرِ بشری میں انبیاؑ و مرسلینؑ کے مبعوث کرنے میں حکمتِ الٰہی

یہ تھے بنی اُمیّہ کے جذبات و عقائد اسلام اور پیغمبرِ اکرمؐ کے حق میں۔ تو پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ بنی اُمیّہ کے صاحبانِ اقتدار آنحضرتؐ کی حیثیتِ نورانی اور کردار و عمل کی صحیح تصویر اور آپؐ کی سیرتِ صالحہ کو صحیح انداز میں منظرِ عام پر آنے دیتے۔ جبکہ یہ اُمراء ان کے اقتدار و حکومت کے ساتھ خود ان کے غیر دینی اعمال و کردار اور احکام کے لئے ایک آئینہ کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ جو کہ ان کے سیاسی اقتدار کے لئے سمِ قاتل ثابت ہوتا۔ اس لئے انھوں نے حتّی المقدور آنحضرتؐ، اہلِ بیتؑ کرام اور اصحابِ باوفا کی بھرپور انداز میں کردار کشی کی اور جاہ و حشم، اقتدار و ثروت، نام و نمود اور جھوٹی شان و شوکت کے حریص و متلاشی افراد کو ان حق پرستوں کے مقابل کھڑا کرکے انھیں عزّت و وقارِ شہنشاہی سے سرفراز کیا اور ان کے ہاتھوں دین و دیانت اور اسلامی اقدار کو پامال کیا گیا بلکہ حق تو یہ ہے کہ اسلام ہی کا گلا گھونٹ دیا۔ لیکن یہ لوگ اپنے سیاسی مقاصد کی نگہداشت اور اس کے حصول و تحفّظ کی خاطر خود کو مسلمان ہی کہتے رہے جبکہ اسلامی نظریات و عقائد کے وہ قطعی پابند نہ تھے۔

آج ایک گروہ جو انبیاؑ و رسلؑ کی توہین پر کمربستہ اور مستعد نظر آرہا ہے درحقیقت یہ کوئی نیا نظریہ یا نیا عقیدہ لے کر پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ماضی میں بھی ایسے لوگوں کی کثرت تھی کہ جن کی عقل و فہم اور فکرِ غلیظ میں قرآن و اسلام اور پیغمبرِ خاتمؐ کی طہارت و نورانیت نہ

سما سکی تھی مگر اس دور میں توہینِ اَنبیا و رُسُل کرنے سے قبل یہ لوگ اس اَمر میں بھی غور و فکر کر لیتے کہ ہر مماثل اَور ہم جنس شئ قدر و قیمت، حیثیت و منزلت اَور درجات میں برابر نہیں ہوا کرتی۔ نہ تمام پتھر ایک جیسے اور نہ سارے حیوان ایک جیسے اَور قدر و قیمت میں یکساں ہوتے ہیں۔ اسی طرح نہ تمام انسانوں کی قدر و قیمت، مراتب و درجات، حیثیت و منزلت ایک جیسی ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔ پھر ایک نسبت بشری کی بنا پر عالِم و جاہل، حاکم و محکوم، آقا اور غلام، اُستاد و شاگرد جب ایک جیسے نہیں ہیں۔ تو پھر ہادی و رہبر اَور وہ جو محتاجِ ہدایت ہو، معصوم و غیر معصوم کس طرح ایک جیسے ہم مرتبہ و ہم منزلت ہو سکتے ہیں۔ پھر اَنبیاءِ کرام کی حیثیت، عصمت و طہارت، عِلم و معرفت، زُہد و تقویٰ اَور رُشد و ہدایت کی تمام ذمّہ داریوں اور مناصب کو نظر انداز کر کے محض ایک نسبت بشری کی وجہ سے انھیں عام بشری حیثیت و منزلت میں شمار کرنا اَور اپنے جیسا بشر محض سمجھنا دراصل معرفتِ دینی کے فُقدان کے سوا اَور کچھ نہیں۔ اَور نہ یہ شرعاً صحیح ہے اَور نہ ہی عقلِ سلیم اس غلط عقیدے اَور فیصلے کو تسلیم کر سکتی ہے۔

خلقتِ حضرت آدمؑ سے قبل جتنی مخلوق وجود میں آ چکی تھیں وہ سب وجود تو رکھتی تھیں لیکن ایک ایسا وجود جنھیں لمس (یعنی چھُو کر) کے ذریعہ ادراک میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ مثلاً لوح و قلم، عرش و کرسی، جنّ و ملک اور اَرواح و اَنوار جو وجود تو رکھتے تھے مگر جسمِ لطیف کے حامل تھے۔ جس کی وجہ سے انھیں چھُو کر محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ حوادثِ زمانہ بھی ان پر اَثر انداز نہیں ہو سکتے تھے اَور مادّی اَثرات سے بھی یہ مُبرّا تھے۔ ان مخلوقات کی موجودگی میں جو جسمِ لطیف کے حامل تھے اگر پروردگارِ عالم اَنبیاءؑ و مرسلین کو بھی جسمِ لطیف یا اس سے بہتر کسی اور پیکر میں مبعوث فرماتا جسے لمس یا کسی اَور ذریعہ سے اِنسانی ادراک و محسوسات میں نہیں لایا جا سکتا تو اَنبیاءؑ و رُسُل اَور اَولیاءِ کرام کے معجزات و کرامات ان کے اِختیار و تصرّفات کو دیکھ کر بشریّت خود انھیں ہی پروردگار سمجھ

بیٹھتی یا پھر مافوق الفطرت ہستی قرار دے کر ان کی اِتّباع و اِطاعت سے یہ کہہ کر منحرف ہو جاتی کہ ہم بشر ہیں ان کی اِتّباع و اِطاعت ہمارے بس کی بات نہیں، اس لئے کہ پیغمبرؐ کی جنس اور ہے اور ہماری جنس اور۔ اِس طرح انسانیت شریعتِ الٰہیہ کو قبول کرنے اور رسُولؐ کی اِتّباع و پیروی سے منکر ہو جاتی۔ جیسا کہ انبیاؑ و مرسلین کو پیکرِ بشری میں مبعوث فرمانے کی حکمت خود پروردگار اس طرح بیان فرماتا ہے "اگر ہم فرشتے کو نبی بناتے تو (آخر) ان کو بھی مرد صورت (پیکرِ بشری) میں بناتے۔ جو شُبہے یہ لوگ کر رہے ہیں وہی شُبہے خود ان پر (بھی) اُڑھا دیتے۔ (اے رسُول! آپ دِل تنگ نہ ہوں) آپؐ سے پہلے (بھی) پیغمبروںؑ کے ساتھ مسخرا پن کیا گیا ہے۔" (الانعام، آیات ۸ تا ۹)۔ اِن آیات کی تفسیر میں حضرت احمد رضا خاں صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ ان کفّار کا جواب ہے جو نبیؐ کریم کو کہا کرتے تھے کہ یہ ہماری طرح کے بشر ہیں اور اس خبط میں وہ ایمان سے محروم رہتے تھے۔ انھیں انسانوں میں سے رسُول کو مبعوث فرمانے کی حکمت بتائی جاتی ہے کہ ان سے منتفع ہونے کی اور تعلیمِ نبیؐ سے فیض اُٹھانیکی یہی صورت ہے کہ نبی صورتِ بشری میں جلوہ گر ہو" (کنزالایمان)۔ ربّ العزّت نے پیکرِ بشری میں انبیاؑ و مرسلینؑ کے مبعوث فرمانے کی حکمت و مصلحت بیان فرما دی اور اس کے ساتھ یہ بھی واضح فرما دیا کہ جو کافر ہیں وہ پیغمبرؐ کے محض بشری رُخ پر یقین رکھتے ہیں۔ اور پیغمبروںؑ کو بشرِ محض سمجھنا (یعنی ان کی روحانیت و نورانیت اور عصمت پر یقین نہ رکھنا، ان کے اعلیٰ مدارج و منزلت سے اِنکار کرنا) یہ کافروں کا شیوہ ہے۔ جو حقیقت نورانیتِ نبویؐ کو سمجھنے سے قاصر ہونے کی وجہ سے انبیاء و مرسلینؑ اور سرکارِ دو عالمؐ کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ پروردگارِ عالم مسلمانوں کو اِس بیدین عقیدے سے محفوظ رکھّے۔

ربّ العزّت نے انبیاء و مرسلین کو پیکرِ بشری میں مبعوث فرما کر جہاں مخلوق کو مخلوق پر خالق ہونے کے گمان و شک کے اِمکان کو ختم کر دیا وہاں دوسری طرف خود اپنی توحید کو فکرِ بشر میں مشتبہ ہونے سے محفوظ کر دیا۔

روحِ کائنات وجہِ تخلیقِ کائنات حضرت محمّد مصطفٰے صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے نورِ مبارک کو پیکرِ بشری میں مبعوث فرمایا تاکہ وہ بھی طفلی، جوانی، کبرسنی اور شادی وغم، مرض وصحّت جیسے بشری تقاضوں کے ساتھ دیگر ضروریات بشری پر بھی عمل پیرا ہوں۔ تاکہ انسانیت انھیں اپنی ہی طرح کی ایک مخلوق اور ہمجنس سمجھ کر آپؐ سے مانوس رہے اور احکامِ شریعت کو حاصل کرے اور احکامِ دینی میں آپؐ کی اطاعت و پیروی کرے۔ پیکرِ بشری میں انبیاءؑ و مرسلینؑ کا مبعوث ہوکر پروردگارِ عالم کے حکم سے یہ کہنا کہ "میں بھی تمہاری مثل ایک بشر ہوں" یہ صرف تخلیقی اور پیکرِ بشری کی مناسبت سے ہے ورنہ نوعِ انبیاءؑ و رُسلؑ عام سطحِ بشری سے یقیناً بلند و بالا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ انبیاءؑ و مرسلینؑ عام بشری تقاضوں سے مغلوب اور اس کے تابع ہیں کہ جس طرح بشریّت بے عقل پیدا ہوتی ہے اور دُنیا میں آکر تجربات و مشاہدات کے بعد علم حاصل کرتی ہے انبیاء کا شمار اس طرح کی صفِ بشری میں نہیں کیا جاسکتا۔ نہ وہ جاہل و ظالم، بے عقل و معرفت ہوتے ہیں اور نہ ہی تجربات و مشاہدات کے ذریعہ وہ علم و معرفت حاصل کرتے ہیں بلکہ وہ علمِ لَدُنّی کے حامل ہوتے ہیں اور خالقِ فطرت انھیں علم و حکمت اور معرفت کے ساتھ پیدا کرتا ہے۔

اِن کی عقل و فکر مرضی و منشاءِ الٰہی کی تابع ہوتی ہے۔ ہَوا و ہَوس اور شیطانی وَسوسوں کا جہاں گزر نہیں ہوتا۔ تمام عالمِ انسانیت ہادی و رہبرِ دینی کی محتاج ہے۔ اور انبیاءؑ و رُسلؑ رہبر و ہادئ انسانیت ہیں۔ لیکن پیغمبرِ اکرمؐ تو انبیاءؑ و مرسلینؑ پر بھی بحیثیت رسول کے مبعوث ہیں تو پھر ہمارے جیسے کیونکر گمان کئے جاسکتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ صفوفِ انبیاءؑ و مرسلینؑ میں ایک فرد بھی پیغمبرِ آخرالزّمان کے مثل اور برابر نہیں تو پھر ہمارے جیسے خاطی و گنہگار، بے علم و معرفت اور ہوا و ہوس کے شکار بندے۔ ع

"چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک"

ملّتِ اسلامیہ میں رہتے ہوئے کس بدنصیب میں یہ جرأت ہوسکتی ہے کہ وہ یہ گمان

بھی کرے کہ پیغمبرؐ عام بشری تقاضوں سے مغلوب ہیں۔ ایسا کہنے اور گمان کرنے والا یقیناً آپؐ کا اُمّتی نہیں بلکہ وہ شانِ مصطفےٰ اور عظمت و عصمتِ نبوّت کا منکر ہے جو توہینِ رسُول کے مترادف ہے۔ یہودیوں نے حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور عیسائیوں نے حضرت عیسٰیؑ کی عظمت و احترام میں اس حد تک مبالغہ کیا کہ انھیں خدا کی خدائی میں شریک اور انھیں خدا کا بیٹا بھی قرار دے دیا۔ مگر اپنے جیسا بشر قطعی گمان نہیں کیا۔ یہ بدنصیبی تو صرف خارجیوں کا مقدّر ہے کہ وہ پیغمبرؐ کی دشمنی میں اس حد تک بے دین جذبات کے شکار ہوئے کہ آیاتِ قرآنیہ کی نصوص تک کو رد کرکے انھیں اپنے جیسا بشر، گنہگار، خاطی اور فنا و نیستی (موت) کا شکار قرار دے دیا۔ جب پیغمبرؐ ان جیسے بشر ہیں اور یہ پیغمبرؐ جیسے تو پھر کلمہ میں پیغمبرِ اکرمؐ کے اسمِ گرامی کی جگہ اپنا بدنصیب نام کیوں شامل نہیں کر لیتے تاکہ ان کی نسبتِ بشری بھی ادھوری سے مکمّل ہو جائے۔"

پروردگارِ عالم نے نبیؐ اکرم سے یہ کہلوا کر کہ "میں تم جیسا بشر ہوں" درحقیقت عقل و فکرِ بشری کی رہبری فرما دی ہے کہ یہ رسُول جو تمہاری رہبری و ہدایت کی منزل پر فائز ہے یہ تمہاری طرح کی مخلوق ہے، خالق و پروردگار نہیں۔ مگر جو رمز و بلندی، منزلت اس آیت میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ وحیِ الٰہی کا حامل ہونا ہے اور یہی قید وصفتِ پیغمبری، پیغمبرؐ کو عام سطحِ بشری سے بلند و بالا قرار دیتی ہے جس کا ذکر یہ خارجی حضرات جان بوجھ کر اور عمداً نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی نبیؐ و رسُول نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ "اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّثْلُنَا" تم بھی میرے جیسے بشر ہو۔ پھر آپ! نبیؐ کو اپنے جیسا بشر کس عقلی اور نقلی پہلو یا منطق کے تحت قرار دے سکتے ہیں؟

بشریّت سے نبوّت تک

ملائکہ اور جِنّ خلقت میں ایک پیکرِ لطیف کے حامل ہونے کی وجہ سے خود کو اعلیٰ و ارفع مخلوق تصوّر کرتے تھے۔ پروردگارِ عالم نے انھیں مخاطب کرکے فرمایا "میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔" لیکن اس امر کو واضح نہیں فرمایا کہ کسے یہ عہدۂ خلافت عطا فرمائے گا۔ جنّ و مَلک منتظر تھے کہ اس امرِ خلافت کا کون مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ مگر جب انھیں مٹّی سے ایک بشر کی تخلیق کے ساتھ اسے سجدے کا حکم ہُوا تو فرشتوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ ضرور اس خاک کے پُتلے کو یہ منصبِ جلیل عطا ہوگا۔ ابھی تک وہ خلقت میں مقدّم اور جسمِ لطیف کے حامل ہونے کے سبب خود کو اس عہدۂ جلیلہ کا لائق و مستحق سمجھ رہے تھے۔ پیکرِ خاکی (یعنی بشر) ان کی نگاہوں میں پیکرِ کثیف اور تخلیق میں مؤخّر ہونے کی بنا پر ناقابلِ اعتناء تھا۔ لیکن عہدۂ خلافت کے ذکر کے ساتھ اس پیکرِ بشر کو سجدے کے اعلان سے وہ سمجھ گئے کہ یقیناً نیابتِ الٰہی زمین پر اسے ہی حاصل ہوگی۔ ان کی طبیعتوں پر یہ امر گراں گزرا کہ یہ خاکی پُتلا جو برسوں سے بے خبر پڑا ہُوا اپنی تخلیق کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اور ہم جبکہ تسبیح و تقدیسِ الٰہی اور اس کے ذکر میں ہزاروں برس سے مصروف ہیں یہ ہم پر کس طرح سے سبقت لے جاسکتا ہے۔ فوراً ہی اپنے استحقاقِ خلافت کو اس معروضہ کے ساتھ بارگاہ ربّ العزّت میں پیش کر دیا۔ "تو ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے گا جبکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔" جس کا جواب پروردگارِ عالم نے یہ دیا کہ "جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔" پھر حضرت آدمؑ کو کچھ اسماءِ مبارکہ، اللہ تعالیٰ نے تعلیم فرمائے اور پھر ملائکہ سے کہا اگر تم سچے

ہو تو اِن "اَسماء" کو بتلاؤ ؟ فرشتوں نے عرض کی، تو پاک و پاکیزہ ہے، ہم تو جو کچھ کہ تُو نے بتایا ہے اُس کے سوا اور کچھ نہیں جانتے، تو بڑا صاحبِ علم و حکمت ہے۔ پھر خدا نے آدمؑ کو حکم دیا کہ فرشتوں کو وہ "اَسماء" بتا دیں۔ جب آدمؑ نے اُن اَنوار کے نام بتا دیئے تو خدا نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا، کیوں میں نہ کہتا تھا کہ مَیں آسمانوں اور زمینوں کے رازسے واقف ہوں۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو سب کے سب سجدے میں جُھک گئے، سوائے ابلیس کے جس نے غرور کیا اور کافر ہوگیا (سورۂ البقرہ آیات ۳۰ تا ۳۵)

ع:۔ "حکم دیتا ہے خدا انکار کر دیتی ہے آگ"

فرشتوں کی نگاہیں چونکہ آدمؑ کے پیکرِ خاکی (بشریّت) کی حد تک محدود تھیں جو برسوں سے بے حس پڑا اپنی تکمیل کی منازل طے کر رہا تھا اور آتے جاتے ہوئے وہ اسکا مُشاہدہ بھی کر رہے تھے۔ ان کی فکر و عقل چونکہ تجسّس سے عاری تھی اس لئے انھوں نے نہ ہی آدمؑ کے پیکرِ خاکی کے متعلّق سوچا اور نہ ہی پیکرِ بشریّت میں داخل کی جانے والی الٰہی رُوح (امرِ الٰہی) کے بارے میں عقل و فکر کو استعمال کیا اور نہ ہی آدمؑ کی جنس اور عقل و فکر کے حامل ہونے کی حیثیت کو سمجھ پائے۔ صرف بشریّت (پیکرِ خاکی) کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے نیابتِ الٰہی کے اہل قرار دیئے جانے پر احتجاج کر بیٹھے۔ لیکن آدمؑ کے دوسرے رُخ رُوح اور عقل و فکر کے حامِل ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر بیٹھے مگر انھوں نے حقائق و حق پرستی کے ساتھ اپنی حیثیت (کمِ علمی) کا اعتراف بھی کر لیا، جبکہ شیطان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہا چنانچہ "سورۂ ص" میں ارشاد ہوا کہ "پروردگار نے کہا! اے ابلیس تجھے کس چیز نے اس کے سجدے سے باز رکھا جسے میں نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا تھا۔ تُو نے تکبّر کیا یا تو بھی بلند مرتبہ والوں میں سے۔ شیطان نے کہا مَیں اس سے بہتر ہوں اس لئے کہ تُو نے مجھے آگ سے خلق کیا ہے اور اسے (آدمؑ کو) مٹّی سے۔ پروردگار نے کہا! یہاں سے نکل جا یقیناً تو گمراہ ہے اور تجھ پر لعنت ہے "یومِ دین" تک (سورۂ ص آیات ۷۵ تا ۷۸) حسبِ ذیل اُمور قابلِ غور ہیں:

(۱) فرشتوں اور ابلیس کی نگاہیں حضرت آدمؑ کے صرف پیکرِ خاکی تک محدود رہیں اور حضرت آدمؑ کا دوسرا رُخ حیات (رُوح) ان کی محدود عقل اور غیر متجسّسانہ فکر میں نہ آسکا جیساکہ یہ خارجی حضرات پیغمبرؐ خاتمؐ کے محض بشری رُخ پر ہی یقین رکھتے ہیں اور آپؐ کا دوسرا رُخ حیات (صاحبِ وحی) ہونا ان کی سمجھ میں اب تک نہ آسکا۔ یا پھر یہ کیسی اور مصلحتِ دُنیاوی کیوجہ سے آنحضرتؐ کی شان وعظمت اور حیثیت ومنزلت کا ذکر پسند اور گوارہ نہیں کرتے۔

(۲) پروردگار کے حکم کے بعد فرشتے، عظمتِ آدمؑ کے سامنے سربسجود ہوگئے۔ لیکن شیطان نے ملائکہ کا ساتھ نہیں دیا۔ اور حضرت آدمؑ کی حیثیت ومنزلت (نیابتِ الٰہیّہ کے منصب کو) قبول کرنے کے لئے تیّار نہ ہوا۔ اسلام میں بھی ایک جماعت آنحضرتؐ کے وجودِ نوُرانیت ورُوحانیت کے اعلیٰ درجہ ومنزلت کی منکر ہے۔ اور وہ صرف آنحضرتؐ کے محض بشری حیثیت کے قائل ہیں اور آپؐ کو گنہگار اور سہو ونسیاں کا خوگر جانتے ہیں۔

(۳) پروردگارِ عالم نے حضرت آدمؑ کی عقل وفکر اور منصب نیابتِ الٰہیّہ کے حامل ہونے کی کوئی توجیہہ وضاحت فرمانا بھی پسند نہیں فرمایا بلکہ صرف یہ ارشاد ہوا کہ "تجھے اُسکے سجدے سے اِنکار میں کیا چیز مانع ہوئی جسے مَیں نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا تھا۔ کیا تو خود کو بھی ان بلند مرتبوں والوں (عالین) میں سمجھتا ہے۔

(۴) اس میں سب سے اہم امر یہ ہے کہ ابھی تک جن وجود کا ذکر تھا وہ ملائکہ، جنّ، اور پیکرِ بشری (حضرتِ آدمؑ) تک محدود تھا مگر اب سجدہ آدمؑ کو وقت کچھ ایسے وجود بھی نمایاں ہوئے جنھیں سجدۂ آدمؑ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا اور جن کا پروردگارِ عالم نے بلند مرتبہ والے (عالین) کہکر ذکر فرمایا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ اس وقت کچھ ایسے وجود بھی تھے جو فرشتوں، جنوں اور خود حضرت آدمؑ سے بھی بلند اور عظیم درجے پر فائز تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں حضرت عبدالحق محدّث دہلوی کی روایت ملاحظہ فرمائیں۔ "ایک حدیث عمر ابنِ خطّاب سے مروی ہے، علماءِ حدیث نے اسے صحیح کہا ہے کہ، جب حضرت آدمؑ صفی اللہ سے خطا سرزد ہوئی تو توبہ کے لئے کہا، اے میرے ربّ

مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ بطفیل محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم مجھے بخش دے مجیب الدّعوات کے دربار سے فرمان آیا کہ تم نے محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کس طرح پہچانا، حالانکہ میَں نے ابھی اُن کے جوہرِ رُوح کو صدفِ جسمانیت میں نہیں رکھّا ہے۔ آدمؑ نے کہا، اَے خدا تو جانتا ہے کہ جس رُوز مجھ کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا اور میرا قالب بشری میں روحِ علوی پھونکی تو مَیں نے سر اُٹھایا، عرش کے پایوں پر لکھا ہوا دیکھا۔ " لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ " اس دن سے میَں نے پہچان لیا کہ وہ تیرے ایک بندے ہیں اور تیرے نزدیک کُل مخلوقات میں محبوب ترین اور تیرے دربار کے مقرّب ترین ہیں حکم آیا کہ جب تم نے ان کو میرے دربار میں وسیلۂ مغفرت ٹھہرایا ہے تو میَں نے تمہارے گناہ معاف کر دیئے۔ اَے آدمؑ اگر محمدؐ نہ ہوتے تو تم کو بھی پیدا نہ کرتا (جذب القلوب ص۲۳۵)۔

کہا جا رہا ہے کہ پروردگارِ عالم نے حضرت آدمؑ کو " اسماء " بتا دیئے تھے جس کی وجہ سے حضرت آدمؑ امتحان میں کامیاب ہو گئے اور فرشتے ناکام رہے۔ جبکہ حقیقت اسکے برعکس ہے۔ فرشتوں کے علم میں یہ " اسماء " تخلیقِ آدمؑ سے ہزاروں سال قبل ہی آ چکے تھے۔ اس لئے کہ عرشِ الٰہی پر یہ اسماءِ مقدّسہ عالمِ نورانیت میں نمایاں تھے۔ فرشتے آتے جاتے ہوئے برابر انوارِ مقدّسہ اور " اسماء " کو دیکھتے رہے تھے۔ ان کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی وہ ان وجود اور " اسماء " سے واقف تھے۔ چنانچہ جب حکم ہوا کہ ان کے (عالین) " اسماء " بتاؤ تو فرشتے متجسّسانہ عقل و فکر کے حامل نہ ہونے کی بناء پر اپنی صحیح حیثیت اور لاعلمی کا اعتراف کر کے پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن جب آدمؑ کو یہی حکم ہوا تو انھوں نے اپنی عقل و فکر کے صحیح استعمال کی وجہ سے ان " اسماء " کو مناسب انوارِ مقدّسہ پر عرض کر دیا۔ اس طرح حضرت آدمؑ اپنی عقل و فکر کے صحیح استعمال کی بناء پر منزلِ امتحان سے کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔ چنانچہ ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ " کنتَ من العالین " سے وہ کون لوگ مراد ہیں جو فرشتوں سے بھی اعلیٰ و افضل ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ " ہم

اہلِ بیت ہیں جو عرشِ الٰہی پر تسبیح و تقدیسِ پروردگار کرتے تھے اور فرشتوں نے ہم سے تسبیح و تقدیسِ الٰہی کا طریقہ سیکھا۔ ہمارے اسماءِ طاہرہ سرِ عرش مکتوب تھے"۔ اس سے یہ امر قطعی طور پر واضح ہے کہ فرشتوں کو "اسماء" کا بھی علم تھا اور انوارِ مقدّسہ کا بھی۔ اب اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ حضرت آدمؑ کو پیپر آؤٹ کر دیا گیا تھا قطعی غلط ہے اور اگر پیپر آؤٹ تھا تو دونوں ہی فریق کے لئے۔ اس کے علاوہ جانبداری عدلِ الٰہی کے بھی سراسر منافی ہے۔

بہرصورت ابلیس کی سطحی نگاہیں اور ملائکہ کی ظاہر بیں نگاہیں حضرت آدمؑ کی حیثیتِ بشری ہی تک محدود رہیں، جس کی بنا پر شیطان گمراہ ہوا اور حضرت آدمؑ کی دوسری حیثیت (صاحبِ روحِ الٰہی) یا تو اس کی سمجھ میں نہ آسکی یا اس نے حضرت آدمؑ کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے سے عمداً انکار کر دیا۔ یہی حال اس دور میں خارجیت کا ہے جو آنحضرتؐ کی صرف حیثیتِ بشری پر ایمان رکھتے ہیں اور آپؐ کی دوسری حیثیت روحانیت اور نورانیت اور عصمتِ نبوّت کے منکر ہیں۔ اور آپؐ کے صرف بشری حیثیت کا ذکر کر کے سیدھے سادھے مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

آخر فرق کیا ہے امری، روحی اور وحی میں اس لئے کہ قرآن مجید میں یہ تینوں امرِ الٰہی کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں جس سے یہ امر قطعی واضح ہے کہ حضرت آدمؑ میں جو روح تھی وہ بھی امرِ الٰہی ہی تھی اور پیغمبر جس امرِ الٰہی کے حامل تھے (یعنی وحیِ الٰہی) وہ بھی امرِ الٰہی تھی۔ یعنی آپؐ اسرار و رموزِ شریعت سے واقف اور آشنا تھے جس کے بعد انبیاء و مرسلین کو عام بشری سطح پر گمان کرنا عقل و فکر کا فقدان اور تقلیدِ شیطانی ہے۔ یہ توحید پرستی نہیں توہین پرستی ہے۔ آنحضرتؐ کا فرمان ہے کہ سب سے پہلے پروردگار نے میرا نور خلق کیا، سب سے پہلے پروردگار نے عقل کو خلق کیا۔ اور آپؐ ہی کا یہ ارشاد ہے کہ میں اُس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ مٹی اور پانی کے درمیان تھے۔ (حدیث متفق بین الفریقین) ان تینوں اقوالِ مقدّسہ کی روشنی میں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سب سے پہلے وجود نورانیت محمدؐ خلق ہوا جو صاحبِ عقل تھا اور صاحبِ علم و معرفت بھی۔

اب ارشادِ پیغمبرؐ کے بعد اگر کوئی بشر ایسا دکھائی دے جو اپنی خلقت کی اوّلیں منزل پر صاحب عقل و فہم اور صاحب علم و معرفت کے ساتھ اپنی خلقت کی غرض و غایت سے بھی آگاہ ہو تو بیشک اسے حضورؐ جیسا اور حضورؐ کو اس جیسا بشر کہیئے، ورنہ پھر توہینِ انبیاء کے مرتکب ہونگے، جس کی شرعاً کافر اور مرتد کی سزا کے برابر ہے۔ صفوفِ انبیاؑ، و مرسلینؑ میں کوئی فرد رسُول کے ہمسر اور ان جیسی نہیں ملتی تو پھر ہم جیسے بے علم، گنہگار، خاطی اور بے معرفت بندے کہ جنھیں خود اپنی ذات کی بھی صحیح معرفت نہیں وہ کیونکر رسُول جیسے (معاذ اللہ) ہو سکتے ہیں۔ پیکرِ بشری میں نظر آنے والا جسم بعض حالات میں جنس اور نوع میں عام بشریّت سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ فرشتے باوجود نوری مخلوق ہونے کے پیکرِ بشری میں بار بار منتقل ہوتے رہے جو جنس و نوع کے اعتبار سے بشریّت سے یقیناً مختلف ہیں۔ تو سرکارِ دو عالم جن کے نور سے ملائکہ کی تخلیق ہوئی اور جبرئیلِ امیں جو سرکار رسالتمآب کی بارگاہ میں ایک ادنیٰ خدمتگار اور فرمانبردار کی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے اختیار و تصرّف کا جب یہ عالم ہے کہ وہ جب چاہیں نورانیت سے پیکرِ بشری میں اور پیکرِ بشری سے عالمِ نورانیت میں منتقل ہو جاتے ہیں تو پیغمبرِ خاتمؐ جو یقیناً نوری مخلوق ہیں اگر پروردگار کی مرضی و منشاء اور اُس کی مصلحت و حکم کے تحت عالمِ نور سے پیکرِ بشری میں منتقل ہوئے پھر آپؐ کا نور اُسی کی مرضی سے پیکرِ بشری سے منتقل ہو کر جسمِ مثالی میں منتقل ہو گیا تو اس میں حیرانی و پریشانی اور بے اطمینانی کیسی، آخر اس میں کفر و شرک کا کون سا مقام ہے؟ جب ملائکہ اور اجنہ اپنے حقِ تصرّف و اختیار کا، باوجود مخلوق ہونے کے مظاہرہ کر سکتے ہیں تو پھر اس کے حقّ تصرّفات و اختیارات کی کس طرح نفی کی جا سکتی ہے جو کائنات پر حقِ تصرّف رکھتا ہے۔ اگر کسی کی عقل و فکر لفظِ "بشر مثلکم" کی نسبت کی وجہ سے دھوکہ کھا رہی ہے تو اس کا علاج کچھ نہیں ہے اس لئے کہ "بشر مثلکم" کے ساتھ "یوحیٰ الی" کے استثنیٰ نے تمام بشریّت کے زمرے سے پیغمبرِ اکرمؐ کو ممتاز و ارفع اور اعلیٰ قرار دے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ بمثِل ذات تو صرف پروردگارِ عالم

کی ہے جس کی نہ کوئی مثال ہے اور نہ ہی کوئی نظیر۔ آخر پیغمبرؐ کو بحیثیت مخلوق کسی نہ کسی جنس سے مشابہ ہونا تھا چونکہ آپؐ بشریّت کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے اس لئے آپؐ کا نور پیکرِ بشری میں منتقل ہوا۔ ورنہ پروردگارِ عالم کی مراد اِس سے ہرگز یہ نہیں کہ آپؐ نوعی حیثیت و منزلت میں عام گھٹیا بشریّت میں شامل ہیں۔ اور نہ ہی آیت سے اس مفہوم بشریّت کا اثبات ہوتا ہے۔ آیت کے طرزِ بیان سے آپؐ کے وجودِ بشری پر زور نہیں بلکہ آپؐ کے مخلوق ہونے کی حیثیت کا اثبات و وضاحت مقصود ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں، یہ آیت معنیٰ و مَتن کے اعتبار سے تینؔ حصّوں پر منقسم ہے۔

(۱) قل انّما انا بشر مثلکم یوحی الی :۔ آپؐ کہہ دیں کہ میں بھی تمہارے جیسا بشر ہوں مگر صاحبِ وحی ہوں۔

(۲) انّما الٰھکم الٰہ واحد :۔ میرا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے۔

فمن کان یرجوا لقاء ربّہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربّہ احدا :۔ پس جو کوئی لقائے الٰہی چاہتا ہے وہ عمل صالح بجا لائے اور خدا کی عبادت میں کسی کو شریک قرار نہ دے۔

اگر خارجیت کی رسُول دشمن اور اِسلام بیزار فکر کی اس منطق کو تسلیم کرلیا جائے کہ رسُول کی منزلت ہم سے زیادہ نہیں وہ بھی ہماری طرح کے بے معرفت اور تقاضائے بشری سے مغلوب تھے تو نہ آیت کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور نہ ہی آیت کے جُملے مفہوم و معنی میں ایک دوسرے سے مربوط دِکھائی دیتے ہیں کہ میری عظمت تم سے زیادہ نہیں مجھے اپنی منزلت سے بلند نہ سمجھو میں بھی تمہارا سا گھٹیا بشر ہوں، عملِ صالح کرو اور عبادت میں کسی کو شریک قرار نہ دو۔" تو شرک بالعبادت اور عملِ صالح کے ساتھ لقائے ربّ اور ہم تم سب ایک جیسے ہیں۔ اور اگر ان جملوں کو اِس طرح مربوط کیا جائے کہ مجھے اپنے جیسی مخلوق (یعنی بشر) ہی سمجھو خالق و ربّ نہیں میں مخلوق ہوں لیکن صاحب نبوّت ہونیکی

بناء پر میں تم سے عظیم ہوں۔ میرا اور تمہارا ربّ ایک ہی ہے۔ اطاعت و پیروی میری کرو۔ اور عبادت اس کی کرو جو میرا اور تمہارا ایک ہی ربّ ہے۔ اور عبادت میں اس کا کسی کو شریک قرار نہ دو اگر تم اپنے پروردگار کی لقاء چاہتے ہو تو "آیت" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے معلوم نہیں کس طرح نبیؐ کو عام بشریّت پر گمان کیا گیا جبکہ حقیقت نبی و رسُول میں اور عام بشر میں نورانیت آفتاب اور تاریکیٔ شب کا فرق ہے۔ اس آیت سے صرف یہ واضح ہے کہ بشریّتِ رسُول کا ذکر پیغمبرؐ کی حیثیت عبدیت کی وضاحت ہے ورنہ پیغمبرؐ کی حیثیت صاحبِ وحی اور نمائندۂ الٰہی ہونے کی وجہ سے بشریّت سے اعلیٰ و افضل اور مراتب و درجات ہیں "بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر"

قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر بشریّتِ نبی اور بشریّت قوم کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت مُوسیٰؑ کے حالات میں مذکور ہے۔ حضرت مُوسیٰ اپنی قوم کے منتخب افراد کو لے کر کوہِ طور پر تجلّی نورِ الٰہی کو دیکھنے کے لئے گئے۔ لیکن تجلّیٔ نور نے حضرت مُوسیٰ کی قوم کے افراد اور پہاڑ کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ جبکہ بشریّت میں قوم اور نبی دونوں مماثل اور مشترک تھے۔ مگر قوم کے افراد (جو ہمراہ تھے) جل کر فنا ہو گئے اور حضرت مُوسیٰ صحیح و سالم رہے۔ سوائے اس کے کہ آپ چند لمحوں کے لئے بیہوش ہو گئے۔ کیا اب بھی بشریّتِ قوم اور بشریّتِ نبی مساوی ہے؟

خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ اگر ہم اپنے پیغام کو پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ اور سرکارِ دو عالم کے لئے ارشاد ہوا کہ جبرئیل میرے پیغام کو لے کر آپؐ کے قلب پر نازل ہوا۔ پیغام بھی نور ہے۔ کوئی چھپی ہوئی کتاب نہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ پیغمبرِ اکرمؐ کا جسم (یعنی پیکرِ بشری) بھی کتنا لطیف، صاف و شفّاف اور پاکیزہ تھا کہ اس پیغام الٰہی کا متحمّل ہوا۔ اور اس پیکرِ بشری کے متعلق علماءِ تاریخ، مُفسّرین و محدّثین کا اتّفاق ہے کہ آپؐ کا سایہ نہ تھا۔ اس کے بعد بھی سرکارِ دو عالمؐ، ابولہب، ابوسفیان اور ابوجہل ان خارجیوں کو

یکساں اور مساوی دکھائی دیتے ہیں حقیقت میں سرکارِ دو عالم کی حیثیت روحانیت و نورانیت کی نفی اس لئے کی جارہی ہے کہ صاحبانِ تخت و تاج کی گمراہ بشریت اور صاحبانِ حق کی یعنی "بشراً الرّسولاً"، کی حیثیت و منزلت کو ایک قرار دے کر دونوں کی سطح برابر کر دی جائے۔

چنانچہ اس ضمن میں "توحید روڈ کراچی سے ڈاکٹر عثمانی صاحب کی بھی" اختراع اور توحید پرستی کا خبط ملاحظہ فرمائیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "وفات سے چار دن پہلے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر بیماری کی وجہ سے "بحرانی" کیفیت طاری ہو سکتی ہے تو عمر ابن العاص پر اس وقت جبکہ وہ عین سکرات کے عالم میں ہوں طاری نہیں ہو سکتی اور وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے کہ اگر پورے ہوش و حواس میں ہوتے تو کبھی نہ کہہ سکتے"۔ (عذاب قبر صفحہ ۲۰)۔ کل تک تاجدارانِ بنی اُمیّہ اور اُن کے ہمنوا اپنے مفادِ سیاسی اور تحفّظاتِ سلطنت کے خاطر رسولِ اکرم کی حیثیت نورانیت و روحانیت کا انکار اور آپؐ کی عمداً کردار کشی کر رہے تھے تو یہ ان کے دُنیاوی و مادّی مفاد کے لئے تھا مگر آج ایک طرف توحید پرستی کا بھی دعویٰ اور توہینِ رسول کا ارتکاب بھی۔ تو کیا توحید خالص، بغیر توہینِ رسول کے کامل نہیں ہو سکتی؟

چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ عقیدہ کہ عمر ابن العاص اور رسولِ اکرمؐ دونوں پر مرضِ موت میں بحرانی کیفیت طاری تھی تو عمر ابن العاص کے متعلق میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ رہا رسولِ اکرم کے متعلّق ڈاکٹر صاحب موصوف کا عقیدہ "بحرانی کیفیت"، یہ خدا اور رسول اور نصوصِ قرآنیہ کیخلاف اور متصادم ہے۔ پروردگارِ عالم اس ہتک آمیز اور بے دین نظریہ سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

رسول جو کچھ دیدے، لے لو۔ اور جس چیز سے روک دے، رُک جاؤ۔ اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ حالتِ سفر میں ہو یا حالتِ حضر میں، صحّت میں ہو یا حالتِ مرض میں، جس حالت میں ہو جو کچھ دے، لے لو۔ مگر آپ مرضِ موت کا بہانہ کر کے (بہانہ بنا کر) اطاعتِ رسول سے منحرف ہو رہے ہیں بلکہ رسول ہی کو بحرانی کیفیت میں مبتلا کر رہے ہیں۔ جبکہ آیت میں اس

جواز کا اشکال بھی ممکن نہیں ۔ دوسرے یہ کہ نبی ہر لمحہ اور حالت میں تابع مولا ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے " تمہارا ساتھی نہ گمراہ ہوا نہ اغوائے شیطانی میں آیا ۔ جبکہ رسول گمراہ ہی نہیں تو پھر گمراہی، ہجرانی اور ہذیانی کیفیات کا رسول کے پاس گزر کیسا ۔ اس کے علاوہ نبیؐ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ وحی الٰہی کے بغیر گفتگو ہی نہیں کرتے جیسا کہ ارشاد ہوا ۔ " آپ ہوا و ہوس سے گفتگو نہیں کرتے بلکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ وحی الٰہی سے کہتے ہیں " تو ڈاکٹر صاحب اتنی نصوص قرآنیہ کے خلاف آپ کا عقیدۂ توحید پرستی جا رہا ہے ۔ ایک دوسری جگہ موصوف یوں رقمطراز ہیں کہ " اگر کہا جائے کہ مردہ کا جسم ریزہ ریزہ ہو جائے یا آگ اسے جلا کر خاکستر کر دے تو جلا دیا جانے والا کافر تو عذاب سے بچ گیا ۔ اس کے دونوں کانوں کے درمیان گرز کیسے مارا جائے گا اور عذاب کا دور اس پر کیسے گزرے گا ۔ تو اللہ کی قدرت اور " اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ " کا سہارا لیا جاتا ہے ۔ سبحان اللہ ۔ اللہ کی قدرت سے کس کو انکار ہے لیکن قدرت کے ساتھ اللہ کی نہ بدلنے والی سنّت بھی تو ہے ۔ اس کو نظر انداز کر دینا بھی تو اچھا نہیں " (عذاب قبر صنا) ۔ تو ڈاکٹر صاحب آپ کے ریزہ ریزہ اور خاکستر کر دے کا جواب انشاء اللہ قرآن ہی سے پیش کر دیا جائے گا مگر سب سے پہلے آپ کے اصول کا کہ " اللہ کی نہ بدلنے والی سنّت بھی تو ہے " تو کیا آپ تاریخ انبیاء و مرسلین سے کوئی ایک مثال کوئی ایک سنّت الٰہی پیش کر سکتے ہیں کہ خدا نے اپنے کسی نبیؐ و رسول کو عالم سکرات میں ہجرانی، ہذیانی اور بدحواسی میں مبتلا کر دیا ہو اور اس نے بہکی بہکی باتیں کی ہوں جس طرح آپ کے نبیؐ پر ہجرانی کیفیت طاری ہو گئی تھی ۔ اگر آپ کے پاس اس ضمن میں کوئی مثال ہو تو ضرور اطلاع دیجئے گا ورنہ پھر اللہ کی سنّت اس رسول خاتم کے بارے میں کیوں تبدیل ہو گئی کہ آپ کے آخری ایام (حیات دنیوی) میں عقل کو خبط اور ہجرانی کیفیت میں مبتلا کر دیا گیا ۔

اب رہا آپ کا خدا کی صفت " اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ " پر شک اور بے یقینی کہ جس کی لاشیں جلا کر خاکستر کر دی گئیں یا جنھیں ریزہ ریزہ کر دیا گیا وہ تو عذاب سے بچ گیا ۔

اس کے دونوں کانوں کے درمیان گرز کیسے مارا جائیگا تو اُس کیلئے قرآن میں حضرت عزیرؑ کا واقعہ پڑھیئے جنھیں ان کے گدھے کے ساتھ پروردگارِ عالم نے موت سے ہمکنار کیا اور صرف حضرت عزیرؑ کی آنکھوں کی صلاحیت کو باقی رکھا تاکہ وہ حالات کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کریں، اور انھوں نے دیکھا کہ پہلے ان کے گدھے کی رُوح سلب ہوئی۔ اس کے بعد انکی، اور پھر ان کے جسم مٹّی میں تبدیل ہو کر خاک بنے اور ہوا مثل خاکستر اِن کے جسموں کو اُڑا کر کسی نامعلوم مقام پر لے گئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد پھر ہوا نے منتشر خاک کو ایک جگہ جمع کرنا شروع کر دیا اور اس خاک نے ایک گدھے اور ایک اِنسانی جسم کی شکل اختیار کی اور اس میں سو برس کا عرصہ گزر گیا اس کے بعد دونوں زندہ ہو گئے تو پروردگارِ عالم نے اپنی قدرتِ کاملہ کی مثالیں قرآن میں بیان کر دی ہیں لیکن اس سے ہدایت و یقین اُنھیں ہی حاصل ہو سکتا ہے جو سرکارِ دو عالم کی محبّت اور معرفت سے اپنے دِل و دماغ کو منوّر رکھتے ہیں۔

آپ کا دوسرا شک اور بے یقینی جسم کا ریزہ ریزہ ہو جانا ہے کہ یہ کیونکر پھر سے مجسّم ہوگا، تو اُسکی بھی مثال قرآن میں حضرت اِبراہیمؑ کے ذکر میں موجود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے چار پرندوں کو ذبح کیا پھر انھیں ریزہ ریزہ کر کے اُن کے گوشت کو آپس میں مخلوط کر دیا۔ پھر ان مختلف پرندوں کے مخلوط ریزوں کو پہاڑوں پر پھینک دیا۔ لیکن جب حضرت اِبراہیمؑ نے آواز دی تو اُن مُردہ پرندوں کے مُردہ جسموں کے مُردہ ریزوں نے نبیؑ کی آواز کو بغیر عقل کے سمجھا اور بغیر کان کے سُنا اور بغیر پَروں کے ہوا میں اُڑ کر ہر ریزہ اپنی جُوڑ سے ملحق ہو کر جسم بنا۔ مگر ایک بھی ریزہ باوجود مخلوط ہونے کے دوسرے جسم کی طرف نہیں گیا۔ آخر ان ریزوں میں عقل و فکر اور اختیار اور باوجود مُردہ ہونے کی سننے کی صلاحیت کیونکر اور کہاں سے آئی اگر ان میں موجود تھی تو مُردہ سُن بھی سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ کا یہ کہنا "اے نبیؐ! آپ قبر والوں کو نہیں سُنا سکتے" اس میں سوائے معرفتِ دین کے فُقدان اور بیچارگیِ عقل و فکر کے اور کیا ہے۔ جب حضرت اِبراہیمؑ کی آواز مُردے سُن سکتے ہیں۔ تو پیغمبرِ اسلام کی آواز

پر اگر مردے لبیک کہہ اٹھیں تو اس میں شرک و کفر کی کون سی بات ہے حقیقتِ توحید

تو یہی ہے اور " اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ " کے یہی معنی ہیں ۔ وہ ذات اس امر پر قادر

ہے کہ وہ فنا سے وجود کو خلق کرتا ہے اور وجود کو فنا کرتا ہے ۔ موت سے حیات، اور حیات

سے موت کو نکالتا ہے ۔

ان حقائقِ قرآن کی روشنی میں جس میں ۳۰۹ برس تک اصحابِ کہف مردہ

رہے پھر ان میں روح داخل ہوئی اور اب قیامت میں پھر وہ زندہ کئے جائیں گے، اور

حضرت عزیرؑ کا موت کے بعد پھر سے زندہ ہونا آپ کے اس عقیدے کو باطل قرار دے

رہا ہے کہ روح ایک بار جسمِ بشری سے نکلنے کے بعد دوبارہ اپنے پیکر میں داخل نہیں

ہوتی ۔ جنگِ موتہ کے شہداءِ حق کا اپنے زخموں پر ہاتھ کا رکھنا ان کی حیات کی دلیل

ہے ۔ اگر یہ حیاتِ بشری فکر و شعور میں نہیں سماتی تو پروردگار نے تو پہلے فرما دیا ہے کہ :-

" احیاء " زندہ ہیں لیکن تمہارے شعور سے بالاتر ہے اور جس امر کو پروردگار نے ہماری

عقل و فکر سے بالاتر قرار دیا ہے ۔ اس میں موشگافیوں سے کیا حاصل ۔ بس یہ یقین رکھیے

کہ وہ زندہ ہیں اور پروردگارِ عالم نے ان کی زندگی کے لئے دلیل یہ قائم کی کہ وہ رزق پاتے

ہیں اور رزق کا تصوّرِ حیات سے ہے، فنا سے نہیں ۔ اس کے علاوہ علماءِ اسلام کا متفق

فیصلہ ہے کہ روح فنا نہیں ہوتی ۔ اور سائنسی تحقیق و مطالعہ سے یہ امر بھی ثابت ہو چکا

ہے کہ مادّہ بھی فنا نہیں ہوتا بلکہ اس کی ہئیت اور شکل تبدیل ہو جاتی ہے ۔ مگر قرآنِ حکیم

کچھ ایسے لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو عقل و فکر، قلب و نظر رکھنے کے باوجود دین و دیانت

کی باتوں کو سمجھ نہیں سکتے ۔ (سورۂ اعراف آیت ۱۷۹) ۔

دینِ آباءِ النبی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم

قبلِ بعثتِ نبوی اہلِ عرب کی اکثریت لہو ولعب، فسق وفجور اور بیدینی میں مبتلا تھی۔ اکثریت کی اس بے راہ روی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پیغمبرؐ دشمنی کے جذبات میں مبتلا افراد اور جماعت نے آنحضرتؐ کے آباء واجداد اور اُمّہات وجدّات کو بھی اسی زمرہ میں شمار کرکے انھیں بھی بے دین اور کافر قرار دے دیا ہے۔ اگر قرآن نے اکثریّت کے بارے میں کہا ہے کہ "اکثرھُم فاسقون۔ اکثرھُم لایومنون۔ اکثرھُم لایوقنون"۔ تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ قِلّت کا وجود موجود نہیں۔ بلکہ اکثریت کے لفظ کا وہاں پر اطلاق ہوتا ہے۔ جہاں کثرت کے مقابل اور مخالفت میں قِلّت کا وجود موجود ہو تو عرب معاشرے میں اکثریت کا فسق وفجور اور بے دینی میں مبتلا ہونا اس اَمر کی ہرگز نفی نہیں کرتا کہ اس وقت دین اور دین پرست بالکل معدوم تھے۔ اور کوئی فرد بھی اسلام اور تصوّرِ توحید کی حامل نہ تھی۔ دورِ جاہلیّت پر زور صرف اسی لئے صَرف کیا جا رہا ہے تاکہ اس دور میں دینِ اسلام کی نفی اور دینداروں کے وجود کو معدوم قرار دیا جائے۔ اور اس دور کے کردارِ صالح کو بھی دورِ جاہلیّت کے اندھیروں میں گم کر دیا جائے۔ مگر قرآن قبلِ بعثتِ نبویؐ، دینِ اسلام اور نظریۂ توحید کے حامل اسلام پرستوں کے وجود سے اس دورِ جاہلیّت کو خالی قرار نہیں دیتا۔

چنانچہ ملاحظہ ہو حضرت ابراہیمؑ کے لئے ارشاد ہوتا ہے "ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی، بلکہ وہ ایک خدا کے ماننے والے مُسلم تھے اور وہ مُشرک نہ تھے"۔ (سورۂ البقرآیت ۶۷)
اور حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو وصیّت فرماتے ہیں "تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ

تم اِسلام پر برقرار رہو۔" (سورۂ البقر-آیت ۱۳۲) حضرت لوطؑ کے لئے ارشاد ہوا" ہمیں اِس بستی میں کوئی مسلم گھر نہیں ملا سوائے ایک گھر کے۔" (سورۂ ذاریات، آیت ۳۶) حضرت یوسفؑ اِس طرح دُعا کرتے ہیں" مجھے حالتِ اِسلام پر موت دے اور مجھے صالحین کی رفاقت عطا فرما۔" (سورۂ یوسف-آیت ۱۰۱) حضرت موسیٰؑ کے لئے ارشاد ہوا" موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا! اے میری قوم، اگر تم اللہ پر ایمان لے آئے ہو اور مسلمان ہو گئے ہو تو اللہ ہی پر بھروسہ کرو۔" (سورۂ یونس-آیت ۸۴) حضرت موسیٰؑ دُعا فرماتے ہیں" پروردگار ہمیں صبر عطا فرما اور ہماری موت حالتِ اسلام پر ہو۔" (سورۂ اعراف-آیت ۱۲۶) حضرت سلیمانؑ، ملکۂ سبا کو خط میں لکھتے ہیں" میرے ساتھ سرکشی نہ کرو اور مسلم بن کر میرے پاس آجاؤ۔" (سورۂ نمل-آیت ۳۱) ملکۂ سبا نے جواب دیا" میں سلیمانؑ کے ساتھ پروردگارِ عالمین کی مسلم ہو گئی۔" (سورۂ نمل-آیت ۴۴) حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں سے کہتے ہیں" کون اللہ کے راستے پر میرا مددگار ہے۔ حواریوں نے کہا، ہم اللہ کے راستے میں آپ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔" (سورۂ عمران-آیت ۵۲)۔

یہ چند آیاتِ قرآنی تحریر کی گئیں تاکہ قارئین پر واضح رہے کہ پیغمبرِ خاتمؐ کوئی نیا دین یا نیا مذہب لے کر نہیں آئے۔ بلکہ یہ وہی سابقہ دین ہے جس پر تمام انبیاء و مرسلین اور ان کی امتیں عمل پیرا تھیں۔ اور اُس کا نام "اِسلام" سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے رکھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی دُعا یہ تھی کہ" میری ذُرّیت میں ایک اُمتِ مسلم کو باقی رکھ اور اس اُمتِ مسلم میں ایک رسول کو مبعوث فرما جو لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور اُن کے نفوس کو پاکیزہ کرے۔" (سورۂ البقر-آیات نمبر ۱۲۸ تا ۱۲۹)۔ جس سے یہ امر واضح ہے کہ جب رسولِ مقبولؐ مبعوث ہوئے تو اُس وقت بھی ایک ایسا گروہ موجود تھا جس پر اُمتِ مسلمہ کا اطلاق ہو سکتا تھا۔ لیکن مورخین نے ان تمام افراد کو بھی دورِ جاہلیت کے گمراہ افراد میں شامل کر لیا۔

جبکہ آنحضرتؐ کے فرمان سے آپؐ کے آباؤ اجداد کا مسلم ہونا ثابت ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ "اللہ نے مجھے طاہر مردوں کے صلب سے طاہرہ عورتوں کے ارحام میں منتقل کیا ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ مشرک نجس ہیں لہٰذا آپؐ کے تمام اجداد و امہات شائبۂ کفر و شرک سے پاک و منزّہ اور مبرّا تھے۔ عبدالحق صاحب محدّث دہلوی فرماتے ہیں کہ "جہاں تک آنحضرتؐ کے آباؤ اجداد کا تعلق ہے تو جاننا چاہیئے کہ وہ سب کے سب حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت عبداللہ تک کفر کی گندگی اور شرک کی نجاست سے طاہر و مطہّر ہیں اس پر حضورِ اکرمؐ کا یہہ ارشاد شاہد ہے کہ میں طاہر مردوں کے صلب سے طاہرہ عورتوں کے رحموں میں منتقل ہوتا ہوا عالمِ وجود میں آیا"۔ اس کے علاوہ آپؐ کے اجداد و جدّات کے موحّد ہونے پر قرآن کی آیت نصِّ قطعی کا حکم رکھتی ہے کہ "تقلّبک فی السّاجدین"، یعنی آپؐ کا نور خدا کو سجدہ کرنے والوں میں منتقل ہوتا رہا"۔ یہ تمام شواہد و براہان ایک طرف اور یہ ضد ایک طرف کہ دورِ جاہلیّت میں سب کافر تھے، یہاں تک کہ سرکارِ دو عالم کی طرف ایک بے بنیاد قول منسوب کردیا گیا کہ "تمہارا اور میرا باپ (دونوں) جہنّم میں ہیں۔ اور پھر اس بے بنیاد قول کو تقویت پہنچانے کے لئے اس آیت سے استدلال کیا گیا جس میں پیغمبرؐ کو کافروں اور مشرکوں کی مغفرت کرنے سے منع کیا گیا، جبکہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے تحت اتنے افراد ہر دور ہر زمانے میں موحّد اور مسلم رہے ہیں کہ جن پر امّتِ مسلمہ کا اطلاق ہوتا تھا۔ تو آیئے چند قدم گزرگاہِ تاریخ پر چلیں۔

حضرت قصّیؑ آپ کا نام زید اور کنیت ابومغیرہ تھی۔ آپنے عربوں کو دور دراز سے لاکر یکجا کیا اور ان میں انسانیت کے جذبے کو بیدار کیا۔ عربوں کو معاشرتی زندگی گزارنے اور ایک مرکز پر متّحد ہوکر زندگی گزارنے کے طور طریقے سکھائے۔ آپ نے خلیل خزاعی کی لڑکی سے نکاح کیا جو اس وقت متولّیِ خانۂ کعبہ تھے۔ خلیل خزاعی کے مرنے کے بعد تولیتِ کعبہ بھی آپ کو تفویض ہوئی۔ افادہ اور سقایا جو حرم کعبہ کا سب سے بڑا عہدہ ہے آپ

ہی نے قائم کیا اور اسلام نے بھی اُسے بعینہٖ برقرار رکھا مشعرِ حرام بھی آپ ہی کی ایجاد ہے۔ جس پر
ایّامِ حج میں چراغ جلایا جاتا ہے۔ آپ کے بارے میں مورّخین کا ایک گروہ لکھتا ہے کہ آپ
ہی کا لقب "قریش" تھا۔ قُصّیٰ نے حاجیوں کو حلال کی کمائی سے کھانا کھلانے کا اِنتظام
کیا تھا وہ اُن کی اولاد میں اسی طرح جاری رہا یہاں تک کہ آنحضرتؐ مبعوث ہوئے۔ تو آپ نے
بھی اُسے اِسلام میں اُسی طرح باقی رکھا، چنانچہ آج بھی یہ رسم باقی ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ عرب
اور اس کے اطراف میں جہالت و ضلالت، قتل و غارتگری اور فسق و فجور پھیلا ہوا تھا، ایسے
اندھیرے وقت کے شکار قُصّیٰ نہیں ہوئے بلکہ اس اندھیرے وقت میں بھی قُصّیٰ نے عربوں
کی فلاح و بہبود اور ان کے معاشرے کی اِصلاح کی تدبیریں نکالیں، اور بجائے کفر و
شرک میں مبتلا ہونے کے قوم کی ترقّی و خوشنودی اور فلاح و اِصلاح میں منہمک رہے۔ اور
اپنی زندگی کا مقصد خلقِ خدا کی خدمت ہی قرار دیا۔

قُصّیٰ کے بعد اُن کے بڑے بیٹے عبد الدّار کو کچھ عرصے کے لئے تولیتِ کعبہ منسوب
ہوئی، جو بعد کو مغیرہ ابنِ قصّیٰ کو منتقل ہوئی۔ قُصّیٰ نے ۴۸۰ء میں اِنتقال کیا۔ مرنے کے بعد
بھی ان کا اِحترام و ادب باقی رہا۔ جب قُصّیٰ اِنتقال کر گئے تو انھیں "حجون" کے مقام پر دفن کیا
گیا۔ جہاں لوگ ان کی قبر کی زیارت کو جایا کرتے تھے اور اس کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ آپ
نبی و رسول نہ تھے لیکن جس انداز میں آپ نے اِصلاحِ معاشرہ فرمایا اِس سے ثابت ہوتا
ہے کہ اُس دور کے مُصلح ضرور تھے، چنانچہ تاریخ کے الفاظ یہ ہیں کہ :۔ مگر آپ سے حقیقت و
معرفت کی وہ باتیں ظاہر ہوئیں کہ جو انبیاء سے ہوتی ہیں، اور رفاہِ عام کے کارنامے نمایاں ہوئے
جو آپ کو معمولی انسانوں سے بالاتر ثابت کرتے ہیں۔ آپ نے بُت پرستی نہیں کی، اور نہ ہی
شراب و شباب کی محفلوں میں آپ نے کوئی دلچسپی لی جو عربوں کا محبوب مشغلہ تھا۔

حضرت مُغیرہ ابنِ قصّیٰ (عبدمناف)

حضرت کا نام "مغیرہ" (آپ کے والد بزرگوار جناب قصّیٰ نے) رکھا۔ لیکن تاریخ کی کتابوں

میں آپ عبد مناف کے نام سے مشہور ہیں۔ جن لوگوں نے یا گروہ نے اس نام کو شہرت دی اُن کا کہنا ہے کہ یہ نام بُتوں کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ چونکہ مغیرہ ابنِ قصیٰ آنحضرت کے بزرگوں میں سے ایک بزرگ ہیں۔ اس لئے زمانہ ساز طبیعتیں اور دشمنی پیغمبر میں گرفتار عقلیں یہ کب گوارہ کر سکتی تھیں کہ پیغمبرِ اکرم کے آباء و اجداد کو موحّد اور مسلمان رہنے دیں۔ جبکہ ان کے محبوب نظر تاجدارانِ بنی اُمیّہ کے آباء و اجداد کا کفر اور شرک میں مبتلا رہنا تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ بہرطور میں نے کوشش بسیار کے بعد بھی "مناف" نام کے کسی بُت کا ذِکر تاریخ کی مستند کتابوں میں نہیں پایا۔ البتہ ایک بُت "منات" نام ضرور تھا جسے قرآن میں "منوٰۃ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جب "مناف" کسی بُت کا نام ہی نہیں تھا تو بلاوجہ اس نام کو کسی بُت کے نام سے منسوب کرنا دیانتداری کے تقاضوں سے کُھلا ہوا انحراف ہے۔

حضرت قصیٰ کے اِنتقال کے بعد عبد الدّار، باپ کی جگہ سرداری کے درجہ پر فائز ہوئے۔ اور جو خاص عہدے خود حضرت قصیٰ سے متعلق تھے عبد الدّار کو منتقل ہو گئے۔ مگر عبد الدّار نے اپنی خوشی سے اپنے بھائی حضرت مُغیرہ کو اپنی ذمہ داریوں میں شریک کر لیا۔ حضرت مُغیرہ اِس درجہ صاحبِ حُسن و جمال تھے کہ لوگ آپ کو قمر کہا کرتے تھے۔ چنانچہ تاریخ طبری میں ہے کہ "قریش مثل ایک انڈے کے تھے۔ جب وہ شگافتہ ہوا تو پتہ چلا کہ خالص مغز عبد مناف کے لئے ہے۔" (طبری جلد "ا" صفحہ ۸)۔ زُبیر نے موسیٰ بن عقبہ سے روایت کی ہے کہ اس نے حجر میں ایک نوشتہ پایا جس میں لکھا ہوا تھا کہ میں مُغیرہ فرزندِ قصیٰ ہوں۔ میں لوگوں کو حکم دیتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہا کریں۔ (تاریخ ائمّہ صفحہ ۵ بحوالہ تاریخ خمیس جلد "ا" صفحہ ۱۷۶)۔ تاریخ ائمّہ میں مزید تحریر ہے کہ "اس سے کئی مفید باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) عبد مناف خود بھی بُت پرستی سے علیحدہ تھے۔

(۲) عبد مناف، اللہ ہی کو اپنا معبود سمجھتے تھے، کسی اور کو نہیں۔

(۳) عبد مناف، اللہ سے ڈرنے اور اپنے رشتہ داروں کو صلۂ رحمی کا حکم اسی طرح

دیتے، جس طرح انبیاءِ کرام تاکید فرماتے تھے یا جس کی تعلیم بعد کو آنحضرت نے فرمائی۔

مُغیرہ (عبد مناف) نے مُلکِ شام میں بمقام "غزاہ" وفات پائی، جہاں وہ بغرضِ تجارت گئے ہوئے تھے۔ حضرت مغیرہ (عبد مناف) کے فضائل و مناقب بھی اسی طرح واضح ہیں، جس طرح آپ کے آباء و اجداد اور اولاد کے ہیں۔ جس جس بزرگ میں جناب رسُولِ خدا کا نور منتقل کیا گیا وہ سب کے سب خدا کے برگزیدہ بندے، مخلوقِ خدا کے محسن اور معاشرۂ انسانی کے اصلاح کنندہ تھے۔ اور یہ اُمورِ خیر اور اصلاح معاشرہ کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کئے رہے۔

حضرت ہاشم ابنِ مُغیرہ

مُغیرہ (عبد مناف) کے چھ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے حضرت ہاشم تھے۔ وہ انتہائی باہمّت، صاحبِ صولت اور با اثر ہوئے۔ انھوں نے عبدالدّار سے سقایا اور رفادہ کے عہدے خود حاصل کئے۔ علّامہ دیار بکری تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت ہاشم اپنی قوم میں اس سبب سے زیادہ محترم اور فخر کے مستحق تھے۔ چونکہ جناب رسُولِ خدا کا نور آپ کی پیشانی پر چمکتا تھا اور اس کی چھوٹ ہر طرف پڑتی تھی اور جو عیسائی یا یہودی پیشوا آپ کو دیکھتا وہ آپ کے دونوں ہاتھوں کو چومتا اور جس چیز کے پاس سے گزر ہوتا وہ آپ کو سجدہ کرنے لگتی۔ قبائلِ عرب کے یہودی اور عیسائی خود آپ کے پاس آتے اور اپنی لڑکیاں آپ کو نکاح کے لئے پیش کرتے۔ یہاں تک کہ سلطنتِ روم کے فرمانروا (ہرقل) نے بھی اپنی لڑکی کا پیغام آپ کے پاس بھیجا۔ کیونکہ وہ آپ کے جود و کرم اور سخاوت و شجاعت سے بخوبی واقف تھا۔ ہرقل کا مقصد اس نکاح سے یہ تھا کہ وہ حضرت رسُولِ خدا کا نور اپنی بیٹی کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اِس لئے کہ اُسے اس نور کی مدح و ثناء کو "انجیل" میں مذکور پایا تھا۔ مگر حضرت ہاشم ان سب پیغامات کو نامنظور کرتے رہے۔ اور اپنی قوم کی ایک

نجیب الطرفین لڑکی سے شادی کی جس سے حضرت اسد پیدا ہوئے۔ جن کی دختر فاطمہ بنتِ اسد (والدۂ حضرت علیؑ) تھیں۔ لیکن وہ نور جو جناب ہاشم کی پیشانی میں تھا اب بھی باقی رہا۔ پس ایک روایت کے بموجب ایک رات جناب ہاشم نے خانۂ کعبہ کا طواف کیا اور تضرّع وزاری کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں دُعا کی کہ مجھے ایک ایسا فرزند عطا کر جو اس نور کا حامل ہو۔ ایک شب آپ نے خواب میں دیکھا کہ "ہاتفِ غیبی" ندا کرتا ہے کہ تم سلمیٰ بنت عمر سے نکاح کرو۔ (تاریخ آئمہ بحوالہ تاریخ خمیس، دیار بکری جلد ۱ صفحہ ۱۷۵)

موّرخین کہتے ہیں کہ سلمیٰ بنتِ عمر عظمت و تقدّس اور عزّت و احترام میں ویسی ہی خاتون تھیں جیسی کہ اپنے زمانے میں جناب خدیجۃ الکبریٰ عزّت و احترام اور حلم و ثروت میں تھیں۔ آپ (سلمیٰ) قبیلۂ بنی النّجار سے تھیں اور شرف و بزرگی میں تمام عرب میں مشہور تھیں، چنانچہ جناب ہاشم کی شادی سلمیٰ بنتِ عمر سے مدینہ میں ہوئی۔ آپ کے بطن سے ایک فرزند پیدا ہوئے جن کے سر کے بال سفید تھے اور اس نسبت سے اس فرزند کا نام "شیبۃ الحمد" رکھا گیا۔ جناب ہاشم ایک عرصہ تک مدینہ میں قیام پذیر رہے۔ علاّمہ فخرالدّین رازی "سورۂ قریش" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ قریش کی یہ حالت تھی کہ جب ان میں کا کوئی شخص مصیبت میں مبتلا ہوتا اور فقر و فاقہ سے تنگ آجاتا تو وہ اپنے عیال کو لے کر کسی جگہ چلا جاتا اور وہ سب اپنے اوپر خیمہ گرا لیتے، یہاں تک کہ وہ سب اس کے اندر ہی ہلاک ہو جاتے اور کسی کو اس بات کی خبر بھی نہ ہوتی۔

قریش کو اس مصیبت سے نجات اس وقت حاصل ہوئی جب حضرت ہاشم بڑے ہو کر اپنی قوم کے سردار ہوئے تو انھوں نے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی کہ "اے اہلِ قریش وہی لوگ دوسروں پر غالب رہ سکتے ہیں جن کی افرادی قوّت زیادہ ہو۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ فقر و فاقہ کے باعث تم لوگوں نے خود کو ہلاک کر دینے کا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے جس کے باعث تمہاری تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے تمہاری قوّت بھی کم ہو رہی ہے میں نے

نہایت غور و فکر کے بعد تمہاری نجات کے لئے ایک عمدہ تدبیر نکالی ہے۔ لوگوں نے کہا یقیناً آپ کی رائے ہم لوگوں کے حق میں بہتر اور سود مند ہوگی۔ آپ ارشاد فرمائیں، ہم لوگ اُس پر عمل کرنے کو تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں میں جو فقیر و نادار ہیں اُنھیں، تم میں کے جو مالدار اور خوش حال لوگ ہیں، اپنی تجارت میں اِس طرح شریک کر لیں کہ محنت اُن کی ہو اور مال تمہارا۔ اور نفع میں تم اُنھیں اپنا شریک کر لو۔ اِس طرح اُن کی ناداری ختم ہو جائیگی اور تمہاری تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ لوگوں نے اِسے پسند کیا اور اِس طرح اہلِ قریش نے فقر و فاقہ کی موت سے نجات حاصل ہوئی۔ (تفسیرِ کبیر جلد ۸ صفحہ ۶۹۴)۔

آج معاشیات کے اصول میں اَفرادی قوّت کو بھی اصل زر اور سرمایہ کی حیثیت حاصل ہے لیکن آج سے ہزاروں سال قبل جناب ہاشم اشتراکِ سرمایہ اور افرادی قوّت کے اِستعمال اور اس کی صحیح تقسیم پر عمل پیرا نظر آرہے ہیں۔ اِس کے علاوہ حضرت ہاشم کا یہ عمل اور جناب سرکارِ دوعالم کے "عقد مواخاتِ مدینہ" سے کس قدر مشابہہ ہے۔ حالانکہ ابھی پیغمبرِ اکرم نے لباسِ ظاہری (یعنی پیدا بھی نہ ہوئے تھے) میں نہ آئے تھے مگر اسلامی مساوات کی عملی ترکیب پیش کی جارہی ہے۔ اب سوائے اِس کے اور کیا کہا جائے کہ کشتِ اِسلام کی آبیاری ہو رہی ہے تاکہ رسُولِ مقبول جب مبعوث ہوں تو شجرِ اسلام اس وقت تک ایک مکمّل سایہ دار درخت کی شکل میں بار آوری اور اتمامِ نعمت کے لئے تیّار ہو جائے۔ یا اسے یوں کہئے کہ حضرت ہاشم عربوں میں اس مُسلم معاشرے کی تشکیل کی جانب بڑھ رہے تھے کہ جو معاشرہ بعثتِ ختمی مرتبت اور اسلام کی تکمیل کا متحمّل ہو سکے۔ اور آپ ایک معاشرے کی تخلیق میں مُنہمک رہے جو دُعائے حضرت خلیل اللہ کی مصداق بن جائے اور وہ مُسلم مُعاشرہ ہو۔

حضرت شیبۃ الحمد ابنِ ہاشمؑ "عبد المطّلب"

حضرت ہاشم ایک عرصہ تک مدینہ میں مقیم رہے۔ جب آپ تنہا شام سے مکّہ کی طرف واپس آرہے تھے تو راہ میں اِنتقال کیا۔ ان کے اِنتقال کے بعد حضرت مطّلب ابنِ

مُغیرہ، مدینہ پہونچے، انھوں نے چند بچّوں کے ساتھ ایک بچّے کو دیکھا کہ تیراندازی میں مشغول ہے، قریب گئے تو پہچان لیا کہ یہ ان کا بھتیجہ "شَیبَۃُ الحمد ابنِ ہاشم" ہے۔ اُس کو ساتھ لے کر مکّہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہودیوں کو علم ہوا تو انھوں نے اس غرض سے ان کا تعاقب کیا کہ "شَیبَۃُ الحمد" کو واپس لے جائیں اور جناب مطّلب کو قتل کر دیں۔ مطّلب نے دَورانِ سفر یہودیوں کے گھوڑوں کی آوازیں سُنیں تو بھتیجے سے کہا کہ اَے فرزند جن کا خوف تھا وہ دشمن آپہونچے۔ شَیبَۃُ الحمد نے مشورہ دیا کہ ہم راستہ تبدیل کر دیں۔ مطّلب کہنے لگے اَے نورِ چشم ہم جدھر بھی جائیں گے تیری پیشانی کا نور ان گمراہوں کی رہبری کر دیگا۔ چنانچہ کپڑے کو کئی تہہ دے کر شَیبَۃُ الحمد کی پیشانی پر لپیٹا گیا لیکن نور کی ضیا اور تابانیاں کم نہ ہوئیں۔ آخر مطّلب نے کہا اَے فرزند، تیرے چہرے کا نور خدا کا نور ہے اور یہ پوشیدہ نہیں ہو سکتا، اور نہ کسی کی مجال ہے کہ اِسے معدوم کر سکے۔ خدا کی نظر میں تیری منزلتِ عظیم ہے اور جس خدا نے تجھ کو یہ نور عطا کیا ہے وہی تجھے ہر خطرے سے محفوظ رکھّے گا۔

جب یہودی قریب پہونچ گئے تو شیبۃ الحمد نے کہا، چچا مجھے نیچے اُتار دیجئے تاکہ خداوند قدّوس کے اس نور کا تماشہ آپ کو دِکھاؤں۔ آپ نیچے اُتر کر اس طرح پروردگارِ عالم سے دُعا کرنے لگے۔ اَے نور و ظلمت کے خالق اور آسمانوں کو گردش دینے والے، اَے ہر ذی روح کو روزی دینے والے، میں تجھ سے بحقّ شفیعِ روزِ جزا التجا کرتا ہوں کہ جس کو تو نے میرے سُپرد کیا ہے اسے دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھ۔ ابھی دُعا ختم نہ ہوئی تھی کہ کئی ہزار افراد کے ہمراہ سلمٰی بنتِ عمر نے آکر یہودیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور مطّلب جو ابھی تک تنہا یہودیوں سے جہاد کر رہے تھے انھیں کمک پہونچا دی اور تمام یہودیوں کو معہ اُن کے سرداروں کے قتل کر دیا۔ اس کے بعد حضرت مطّلب سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں، آپ خوب آئے لیکن اس بچّے کو ماں سے کیوں جدا کر رہے ہیں۔ مطّلب نے کہا، اس بچّے کی منزلت عظیم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بچّے کی منزلت و شرف اور عظمت و تقدّس میں اور اضافہ کروں۔ میں تم لوگوں سے زیادہ اس پر

مہربان اور محافظ و نگہبان ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ پروردگارِ عالم اس بچّہ کو صاحبِ جود و کرم اور پیشوائے اُمم قرار دے گا۔ سلمیٰ نے حضرت شیبۃ الحمد سے مخاطب ہو کر کہا، فرزند تمہیں اختیار ہے۔ اگر چاہو تو ہمارے ساتھ واپس چلو یا چچا کے ہمراہ چلے جاؤ۔ یہ سن کر شیبۃ الحمد نے کہا، مادرِ گرامی میں آپ کی مخالفت سے ڈرتا ہوں، مگر چاہتا ہوں کہ خانۂ کعبہ کی مجاورت بھی حاصل کر دوں۔ تب سلمیٰ بنتِ عمر نے حضرت مطّلب سے کہا، آپ کے بھائی نے جو امانت مجھے دی تھی اسے میں آپ کے حوالہ کرتی ہوں۔ اس کی حفاظت آپکی ذمّہ داری ہے۔ جب یہ جوان ہو تو اس کی شادی ایسی عورت سے کرنا جو نجابت و طہارت اور عزّت و شرافت میں اس کے برابر ہو۔ اس کے بعد حضرت مکّہ کو روانہ ہو گئے۔ جب مکّہ پہونچے تو اہلِ مکّہ نے یہ سمجھا کہ جناب مطّلب کوئی غلام خرید کر لائے ہیں۔ اِس بنا پر لوگ شیبۃ الحمد کو عبدالمطّلب کہنے لگے۔ جناب مطّلب نے حضرت ہاشم کی تمام جائداد و املاک حضرت عبدالمطّلب کے حوالہ کر دیں اور خود اُن کی حفاظت و نگہداشت میں مصروف ہو گئے (حیات القلوب جلد ۲ ص ۶۴ و ۶۵)۔

حضرت عبدالمطّلب کا اِس پریشان کُن ماحول اور عالمِ طفولیت میں خدائے عز واحد پر اتنا یقین اِس امر کی کھلی دلیل ہے کہ حضرت ہاشم کے ساتھ ان کے سسرال والے بھی خدائے واحد ہی کے پرستار تھے۔ جبھی تو ان لوگوں نے حضرت عبدالمطّلب کو بھی اسی نظریات و عقائد کا وارث بنایا جس پر یہ لوگ خود بھی عامل تھے۔ دوسرے حضرت مطّلب اور حضرت عبدالمطّلب کا یہ کہنا کہ جس خدا نے ہمیں یہ نور عطا کیا ہے وہی اُس کی حفاظت بھی کرے گا ان لوگوں کے مُشرک اور بُت پرست ہونے کی نفی کے ساتھ ساتھ ان کے ایمانِ کامل اور مسلم ہونے کا بیّن ثبوت ہے کہ جس اُمّتِ مسلمہ کی دُعا جنابِ خلیل ؑ نے اپنے پروردگار سے مانگی تھی، یہ لوگ اسی اُمّتِ مسلمہ کے افراد تھے۔

حضرت عبدالمطّلب کو خواب میں بشارت ہوئی کہ وہ چشمۂ زمزم کو کھود کر ظاہر کریں۔

چنانچہ انھوں نے اپنے بیٹے حارث کو ساتھ لے کر چشمۂ زمزم کو کھود نکالا۔ قریش نے چاہِ زمزم کی ملکیّت میں شریک ہونا چاہا۔ لیکن عبدالمطّلب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ زمزم کے استعمال میں ہم اور تم برابر کے شریک ہیں لیکن حقِّ ملکیت میرے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوگی اِسلئے کہ یہ میرے پروردگار کا مجھ پر خاص فضل وعنایت ہے۔ آخر فیصلے کے لئے ایک کاہنہ کو حَکَم قرار دیا گیا جو شام میں رہتی تھی۔ قافلہ شام کی سمت روانہ ہوا۔ اثناءِ راہ حضرت عبدالمطّلب اور اُن کے حامیوں کا پانی ختم ہوگیا، یہ لوگ پیاس کی شدّت سے قریب بہ ہلاکت تھے لیکن ان کے مخالف انھیں ایک بوند بھی پانی دینے کو تیاّر نہ تھے۔ حضرت عبدالمطّلب پانی کی تلاش و جستجو کی خاطر اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے جیسے ہی اونٹنی اٹھ کھڑی ہوئی اُس کے پیروں کے نیچے آبِ خنک وشیریں کا ایک چشمہ اُبل پڑا۔ لوگ سیراب ہوئے۔ اور آپ کے مخالفین نے اپنی نزاع و مخالفت کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ چشمۂ زمزم پر آپ کو اب مکمّل اختیار رہے۔ اِس لئے کہ جس خدا نے اِس بے آب وگیاہ صحرا میں آپ کے لئے پانی کا چشمہ پیدا کیا ہے اسی نے چشمۂ زمزم بھی آپ ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور اس طرح یہ لوگ شام گئے بغیر واپس لوٹ آئے۔

چشمۂ زمزم پر قبضہ کرنے کے بعد آپ نے زمزم کو مسافروں، حاجیوں اور اہلِ مکّہ کے لئے وَقف کر دیا۔ آپ نے پروردگار سے دُعا کی کہ اگر خداوند عالم انھیں دسؔ فرزند عطا کرے اور یہ تمام فرزندان کی زندگی میں ہاتھ پیر والے ہوجائیں تو وہ ان میں ایک فرزند کو پروردگار کی خوشنودی کے لئے اس کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ چنانچہ جب دسؔ فرزند آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کئے اور سب کے سب آپ کی حیات میں جوان ہو گئے تو آپ نے حضرت عبداللہ کو قربانی کے لئے خانۂ کعبہ کے قریب لے گئے۔ مگر اہلِ مکّہ نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے قُرعہ اندازی کی رائے دی جسے آپ نے قبول کیا۔ اور متواتر تینؔ بار قُرعہ جب اونٹوں پر نکلا تو آپ نے سو اونٹ خانۂ کعبہ کے قریب ذبح کروائے اور اہلِ مکّہ کی ضیافت کی۔

حضرت عبدالمطّلب اپنی قوم میں ابراہیم ثانی مشہور تھے۔ اور آپ کے نظریات و

عقائد وہی تھے جو حضرت ابراہیم کے تھے جس سے آپ کے مسلمان ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

چنانچہ شاہ عبدالحق دہلوی صاحب فرماتے ہیں کہ "حضرت رسولِ خدا کے آباؤ اجداد کرام، حضرت آدمؑ سے حضرت عبداللہ تک سب کے سب کفر اور شرک کی نجاست سے پاک و پاکیزہ تھے۔ حضرت عبداللہ کے قربانی سے بچ جانے کے بعد یہودیوں نے زہر آلودہ کھانا حضرت عبدالمطلب کے گھر یہ کہہ کر بھیجا کہ عبداللہ کے بچ جانے کی خوشی میں یہ تحفہ ہے۔ لیکن قدرتِ خدا نے اس زہر آلود کھانے کے بارے میں حضرت عبدالمطلب کو آگاہ کر دیا اور انھوں نے یہ کھانا زمین میں دفن کروا دیا۔ اس قسم کے متواتر واقعات ہوئے جس میں حضرت عبداللہ کو ہلاک کرنے کی یہودیوں نے کوششیں کیں مگر خداوندِ عالم نے ہمیشہ آپ کی نصرت اور نگہبانی فرمائی۔ جب زہر کے حربے کو یہودیوں نے ناکام ہوتے دیکھا تو انھوں نے حضرت عبداللہ کو ہلاک کرنے کی یہ صلاح کی کہ انھیں قتل کر دیا جائے تاکہ سرکارِ رسالتمآب کا نورِ مبارک منتقل ہونے سے قبل ہی ختم ہو جائے۔

"ایک روز حضرت عبداللہ تنہا شکار کے لئے گئے کہ یہودیوں نے جو آپ کی تاک میں تھے، گھیر لیا اور تلواریں لے کر آپ کو قتل کے لئے بڑھے، بنی ہاشم کو وہب ابنِ عبد مناف نے اطّلاع دی تو یہ لوگ بعجلت حضرت عبداللہ کی مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ پہلے تو حضرت عبداللہ، بارگاہِ ایزدی میں تضرّع زاری اور دعائیں کرتے رہے، پھر آپ نے ان یہودیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کس وجہ سے مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ خدا کی قسم میں نے کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی، نہ ہی میں نے کسی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی میں نے کسی کا مال چھینا ہے، لیکن ان ملعونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ایکبارگی حملہ کرنے کی تیاری کر دی کہ اسی اثناء میں بنی ہاشم پہنچ گئے، جنھیں دیکھ کر کچھ یہودی پہاڑ کے درّوں میں جا چھپے، جن پر بقدرتِ الٰہی پتھر برسے اور وہ وہیں ہلاک ہو گئے بقیّہ کو قید کر لیا گیا، یہ لوگ حضرت عبدالمطلب کے پاس لائے گئے۔

وہب نے حضرت عبداللہ کے خصائلِ حمیدہ اور فطرتِ طاہرہ کے ساتھ نورِ محمدی کا جب ان کی پیشانی میں مشاہدہ فرمایا تو اپنی بیوی برہ کو حضرت عبدالمطّلب کے گھر بھیجا کہ وہ حضرت عبداللہ کی شادی ان کی لڑکی آمنہ بنتِ وہب سے منظور فرمالیں، برہ نے کہا کہ اے عبدالمطّلب میرے شوہر چاہتے ہیں کہ عبداللہ کے نور کو اپنی بیٹی آمنہ کی طرف منتقل کرلیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے دولتمندوں اور امیروں کی لڑکیوں کو بھی اپنے لڑکے کے لئے قبول نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ لڑکی تمہارے قبیلہ کی ہے اور عقل و فراست، طہارت و عصمت، امانت و دیانت اور حسن و جمال میں مکّہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ عبدالمطّلب نے منظور فرمالیا۔ نکاح کا خطبہ حضرت عبدالمطّلب نے خود پڑھا، جس میں آپ نے فرمایا: "میں خدا کی حمد کرتا ہوں شکر کرنے والوں جیسی حمد، ایسی حمد جس کا وہ سزاوار ہے۔ ان نعمتوں پر جو اُس نے ہمیں عطا کی ہیں اور ہم کو اپنے حرم کا ہمسایہ قرار دیا ہے۔ اور ہمیں حرم میں جگہ دی ہے۔ اپنے بندوں کے دلوں میں ہماری محبّت ڈالدی ہے اور ہم کو تمام اُمتّوں پر فضیلت دی ہے۔ اور ہماری تمام بلاؤں اور آفتوں میں حفاظت کی ہے۔ میں حمد کرتا ہوں اس خدا کی جس نے ہمارے لئے نکاح کو حلال اور زناء کو حرام قرار دیا ہے۔ واضح ہو کہ ہمارا فرزند عبداللہ، تمہاری بیٹی آمنہ کی اِتنے مہر پر خواستگاری کرتا ہے، کیا تم کو منظور ہے؟ وہب نے کہا، ہم راضی ہیں۔ اور ہم نے منظور کیا۔ عبدالمطّلب نے قوم سے کہا، آپ سب گواہ ہیں۔ اس کے بعد عبدالمطّلب نے چار روز تک تمام مکّہ والوں اور قرب و جوار کے لوگوں کی دعوت کی۔" (حیات القلوب جلد ۲ ص ۸٦ تا ۹۰)۔

حضرت عبداللہ قریش کے ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام گئے اور واپسی کے وقت آپ کی طبیعت خراب ہو گئی اس لئے آپ مدینہ میں بنی النجّار کے یہاں مقیم ہو گئے۔ لوگوں نے واپس آکر حضرت عبدالمطّلب کو اُنکے حالات سے آگاہ کیا۔ آپ نے اپنے بیٹے جناب حارث کو ان کے پاس بھیجا۔ لیکن جب حضرت حارث مدینہ پہونچے تو حضرت

عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت عبدالمطلب کو جب حضرت عبداللہ کے انتقال کی خبر ہوئی تو آپ کو انتہائی رنج ہوا۔ رسول اللہ اس وقت بطنِ مادر میں تھے۔ حضرت عبداللہ نے پچیس[۲۵] سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔" (طبقاتِ ابنِ سعد جلد اوّل ص ۱۴۴ تا ۱۴۵) آنحضرت نے اپنے والد حضرت عبداللہ سے ترکہ میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی "برکۃ" جس کا اصل نام اُمِّ ایمن تھا، وراثتہً پائیں۔" (سیرت النبیؐ جلد ۱ ص ۱۲۱ علامہ شبلی نعمانی) جس سے یہہ امر واضح ہوا کہ نبی اپنی وراثت کا بھی وارث ہوتا ہے۔

جب یہودیوں کو خبر ہوئی کہ نورِ محمدی حضرت عبداللہ سے جناب آمنہ کیطرف منتقل ہو چکا ہے تو ان لوگوں نے زرقہ نامی ایک عورت کو حضرت آمنہ کو قتل کرنے پر مامور کیا، اس نے ہر چند کوشش کی لیکن حضرت آمنہ تک اس کی پہنچ نہ ہو سکی۔ آخر اس نے انعام و اکرام کا لالچ اور اس کی حفاظتِ جان کا یقین دلا کر حضرت آمنہ کی ایک کنیز "تکنا" کو اس امر کے لئے تیار کر لیا۔ ایک دن جب کہ اہلِ مکہ ضیافت میں مصروف تھے "تکنا" نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت آمنہ پر خنجر سے وار کر ہی دیا جس سے اس کی غرض حضرت آمنہ اور آنحضرت کا قتل تھا۔ لیکن قدرتِ خدا سے اس کا خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا، اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے دل کو پکڑ لیا ہے اور اس کی آنکھوں میں ایسا اندھیرا چھا گیا کہ اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ حضرت آمنہ نے خنجر اٹھا لیا اور شور کرنا شروع کر دیا۔ بنی ہاشم اور اُن کی عورتیں سب جمع ہو گئیں اور "تکنا" کو پکڑ لیا۔ اس نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ حضرت ابوطالبؑ نے اطرافِ مکہ کی ناکہ بندی کر دی مگر زرقہ شام فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ (حیات القلوب جلد ۲ ص ۱۳۸)۔ حضرت عبدالمطلب کے زندگی کے اہم ترین واقعات میں ایک واقعہ ابرہہ کا خانۂ کعبہ پر فوج کشی کا بھی ہے جس سے حضرت عبدالمطلب کا اپنے پروردگار کی قدرتِ کاملہ پر یقینِ کامل ہونے اور اُن کے صاحبِ ایمان ہونیکی روشن ترین دلیل ہے۔ جب ابرہہ کے لشکر نے اہلِ مکہ کے جانوروں کو پکڑ کر اپنے قابو میں کیا تو اُنکے ساتھ

حضرت عبد المطلب کے اونٹ اور بکریاں بھی پکڑ کر لے گئے۔ حضرت عبد المطلب اُن جانوروں کی واپسی کا مطالبہ لے کر اَبرَہہ کے پاس گئے۔ اَبرَہہ کو جب معلوم ہوا کہ سردارِ قوم اور محافظِ بیت اللہ اُس کے پاس آرہا ہے تو اس نے حضرت عبد المطلب کی توہین و تذلیل کی خاطر ایک سرکش ہاتھی کو سرِ راہ بٹھا دیا تھا، تاکہ وہ حضرت عبد المطلب کو پریشان و خوفزدہ کر دے۔ جس سے سردارِ بنی ہاشم کی توہین ہو اور اپنے درباریوں سے کہا کہ تم دیکھنا کہ اِس سردار کی ہم کیسی توہین کرتے ہیں۔ لیکن جب حضرت عبد المطلب وہاں پہونچے تو اُس سرکش ہاتھی نے اپنی گردن نیچے جھکا دی اور حضرت اس کے پاس سے گزر کر اَبرَہہ کے خیمہ میں داخل ہوئے جیسے ہی اَبرَہہ کی نظر آپ کے چہرے پر پڑی وہ آپ کے حُسن و جمال، رعب و دبدبہ کو دیکھکر مبہوت ہو گیا۔ اَور ایک اِضطراری کیفیت اُس پر طاری ہو گئی۔ وہ بجائے توہین و تذلیل کے آپ کی عزّت و احترام کی خاطر اُٹھ کر استقبال کرنے پر مجبور ہو گیا۔ دہشت سے کانپتے ہوئے حضرت عبد المطلب کو اپنے پہلو میں بٹھایا اَور پوچھا۔ آپ کا کیا نام ہے، آپ سے قبل میں نے آپ جیسا حَسین و جمیل اَور پاکیزہ صورت اِنسان نہیں دیکھا۔ آپ کی جو بھی حاجت ہو گی پوری کروں گا، اگر آپ کہیں تو میں واپس چلے جانے کو بھی تیّار ہوں۔ عبد المطلب نے فرمایا میری کوئی حاجت تجھ سے نہیں ہے۔ میں صِرف یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ تیرے سپاہی کچھ میرے اونٹ اَور بکریاں پکڑ لائے ہیں جنھیں میں نے حاجیوں کی ضیافت کے لئے رَکھّی ہیں تو مجھے وہ سب جانور واپس دِلوا دے۔ اَبرَہہ نے اُسی وقت حُکم دیا کہ جانور واپس کر دیئے جائیں۔ اَبرَہہ نے پھر کہا اَور کچھ حاجت آپ نے بیان نہیں کی۔ ساتھ ہی اَبرَہہ نے مزید کہا، آپ کیوں اپنے شہر والوں کی اَمان کے لئے سِفارش نہیں کرتے۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ خانۂ کعبہ کو برباد اَور یہاں کے مَردوں کو قتل کروں گا۔ لیکن آپ کی منزلت چونکہ میری نگاہوں میں عظیم ہے اِسلئے آپ کی شفاعت و سفارش اِس ضمن میں قبول کرتے ہوئے واپس لوٹ جاؤں گا۔ حضرت عبد المطلب نے کہا، مجھے اِن باتوں سے کوئی سروکار نہیں اِس لئے کہ ہر مالک کو اپنی ملکیت کی فکر ہوتی ہے۔

اِس گھر کا بھی ایک مالک ہے جسے میری سفارش کی کوئی ضرورت نہیں، اور وہ مالک اتنی بڑی قوّت والا ہے کہ وہ ہر طرح کے دشمن سے اپنے گھر کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اِس کے بعد آپ اَبرہہ کے پاس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اَہلِ مکّہ قریش اور بنی اُمیّہ معہ دیگر قبائل کے پہلے ہی مکّہ سے باہر محفوظ مقامات کی طرف جا چکے تھے۔ عبدالمطّلب معہ اَہل و عیال کے مکّہ ہی میں مقیم رہے۔ آپ نے واپس آکر بنی ہاشم سے کہا تم لوگ کوہِ اَبوقبیس پر جا کر اَب قدرتِ الٰہی کا تماشہ دیکھو۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اَبرہہ کا ایک قاصد جس کا نام "حناطہ" تھا۔ عبدالمطّلب کے پاس آکر کہنے لگا 'میرے مولا' اَبرہہ پر آپ کا فضل و شرف ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کے جُرم کو معاف کیا اور چاہتا ہے کہ جس قدر ہمارے آدمی اور اَموال کو نقصان پہونچا ہے اس کا تاوان اور خوں بہا دِیدیجئے اور ہمارے عبادت خانے کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی قیمت ادا کر دیجئے تو ہم لوگ واپس چلے جاتے ہیں۔ حضرت عبدالمطّلب نے فرمایا کہ "ہم کسی بے گناہ سے کسی مجرم کے عوض مواخذہ نہیں کرتے، عدالت اور امانت ہماری عادت ہے۔ ظلم سے ہمیشہ ہم پرہیز کرتے ہیں۔ اور مرضیِ الٰہی کے کبھی خلاف کوئی کام نہیں کرتے۔ اور کعبہ کے بارے میں جو کچھ تم نے کہا تو سُن، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ اپنا پروردگار رکھتا ہے جو اس اَمر پر قادر ہے کہ اس کو دشمن کے ضرر سے محفوظ رکھے۔ خدا کی قسم نہ مجھے اَبرہہ کی پرواہ ہے، نہ اس کے لشکر کے خدم و حشم کی کوئی حقیقت سمجھتا ہوں۔ یہ جواب سُن کر "حناطہ" بہت غضب ناک ہو کر عبدالمطّلب کو ہلاک کرنے کی خاطر آگے بڑھا۔ حضرت عبدالمطّلب نے اُسے گریبان سے پکڑ کر اُٹھا لیا اور زمین پر پٹک کر کہا اگر تو سفیر نہ ہوتا تو اِسی وقت تجھ کو ختم کر دیتا۔" حناطہ" واپس لوٹ گیا اور جا کر مشورہ دیا کہ مکّہ بالکل خالی ہے اس پر اِسی وقت حملہ کر دینا چاہیئے۔ حضرت عبدالمطّلب خانۂ کعبہ کی طرف تشریف لے گئے اور بارگاہِ ایزدی میں اس طرح دُعا کرنے لگے "پروردگار میں تیرے سِوا اور کسی سے اُمیّد نہیں رکھتا، پروردگارا! ان سے تو ہی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔

بلاشبہ تیرے گھر کا دُشمن وہی ہو سکتا ہے جو تیرا دُشمن ہے۔ تو اُن کے دستبرد سے اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ اے خدا، ہر ایک اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے پس تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ اہلِ صلیب کی طاقت و قوّت تیری قوّت و طاقت پر غالب نہ آجائے۔" (تاریخ کامل ابن اثیر جلد "۱" صلا۲۶ و سیرۃ ابن ہشام اُردو جلد "۱" صنہ۵) اس کے بعد وہی عذاب کا نازل ہونا ہے کہ اَبابیلوں نے اَبرہہ اور اُس کے تمام سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۸، امام فخر الدّین رازی۔ وحیات القلوب جلد ۲ صہ۷۵ وغیرہ)۔ اِس واقعہ کا اِتنا گہرا اثر عیسائی دُنیا پر ہُوا کہ اس واقعہ کے بعد پھر عیسائیوں نے اولادِ عبدالمطلب پر فوج کشی نہیں کی، یہاں تک کہ آنحضرت نے اِعلانِ نبوّت و رِسالت فرمایا تو آپ کو یہودیوں، قریشیوں اور اُمویوں سے جہاد کرنا پڑا لیکن عیسائیوں نے کبھی بھی رِسالتمآبؐ پر فوج کشی نہیں کی۔

وہ عرب کے مطلعِ روشن پہ اُبھرا آفتاب

حضرت آمنہ بیان کرتی ہیں کہ جب مجھے رسُولِ خدا کا حمل ہوا تو کوئی گرانی محسوس نہ ہوئی، یہاں تک کہ وضعِ حمل ہوا۔ جس وقت آپؐ متولّد ہوئے، مغرب سے مشرق تک ایک نور پھیل گیا۔ بعدِ وِلادت آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ دیئے اور ایک مُشتِ خاک اُٹھائی اور اپنا سر آسماں کی طرف بلند فرمایا۔ اور جناب عباس ابنِ عبدالمطّلب کا بیان ہے کہ آپؐ ختنہ شدہ اور ناف بُریدہ متولّد ہوئے۔ حضرت آمنہؑ نے جناب عبدالمطّلب کو اطّلاع دی، آپ اس خوشخبری کو سُن کر بہت مسرور ہوئے اور مولود کو لے کر خانۂ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے اور اس عطائے نعمت پر اپنے پروردگار کا شکرانہ ادا کرتے ہوئے فرمایا، تمنّا ہے کہ اِس مولود کو پروان چڑھتا ہوا دیکھوں اور اس کی نسبت بُغض رکھنے والوں کے شر سے اور حاسدوں کے حسد سے پناہ چاہتا ہوں۔ عمر ابنِ اسلمی سے روایت ہے کہ حضرت عبدالمطّلب نے آپؐ کے بارے میں فرمایا! ہر طرح کی حمد و ثنا اس خدا کے لئے ہے جس نے مجھے یہ پاک و طاہر بچّہ عنایت فرمایا۔ یہ لڑکا وہ ہے جو گہوارہ ہی میں تمام بچّوں کا سردار ہُوا۔ اِسے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتا ہوں اور اُسی سے

اس کے لئے پناہ چاہتا ہوں (کتاب طبقات جلد "۱" صفحہ ۱۶۰)۔

آنحضرتؐ کو دُودھ پلانے والی عورتیں

بعض باتیں مسلمانوں میں آنحضرتؐ کے بارے میں ایسی مشہور ہیں جن کا تعلّق کسی بھی طرح آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس کے لئے جائز و روا ہونا ممکنات میں نہیں۔ ہمارا عقیدہ قرآن کی روشنی میں یہ ہے کہ حضورؐ پُرنور کی ذات گرامی کو قدرت نے ہر طرح کی نجاست و بُرائی سے پاک و محفوظ رکھا ہے۔ اور آپؐ دنیا میں ہر قسم کی نجاست و بُرائی سے لوگوں کو پاک کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے لوگوں کے آپؐ کی دشمنی میں جھلستے ہوئے دِل و دماغ کا کہ جہاں انھوں نے آنحضرتؐ کے آباؤ اجداد کرام کی کردار کُشی کی ہے وہیں جناب آمنہؑ بنتِ وہب (مادرِ گرامیٔ پیغمبرِ اکرمؐ) کی بھی حیثیت، وقار، عظمت، بزرگی، احترام اور تقدّس کو بھی مجروح کر دینے کی ناپاک جسارتیں کیں ہیں۔ اور اس کے لئے حضرت آمنہؑ کے مدِّ مقابل کئی دوسری عورتوں کو لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ آنحضرتؐ کی والدۂ ماجدہ ہونے کی حیثیت سے جو آپ کو ایک عظیم منزلت و فضیلت حاصل ہے اس میں غیر عورتوں کو شامل کر کے آپ کی اس امتیازی فضیلت کو سُبک کر کے ایک ناقابلِ ذکر "مرتبہ" قرار دے دیا ہے ورنہ انبیاءِ کرام کے متعلق سوائے ان کے اپنی پاک و مقدّس ماؤں کے دُودھ پینے کے کسی غیر عورت کے دُودھ کو قبول کرنے کی کوئی روایت راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری۔ غیر عورتوں کے "دُودھ" کو قبول کرنا یہ امرِ عصمت و طہارت اور مزاجِ نبوّت کے بھی منافی ہے۔ اس کے علاوہ سنّتِ الٰہیہ کے بھی سراسر مخالف ہے اس لئے کہ پروردگار کا حُکم ہے کہ "مشرک نجس ہیں"۔ جب بہ نصِّ قرآنی کافر و مشرک نجس ہیں تو پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ مشرکہ اور کافرہ عورتوں کا "دُودھ" خُدا اپنے اس نبیؐ اُمّیؐ کو جسے خود ہی "طٰہٰ، طاہر اور اطہر فرما رہا ہے" پینا گوارہ کر لیتا؟

اگر بہ فرضِ محال اس نظریے کو قبول کر بھی لیا جائے تو پھر اس فرمانِ نبوی کی کیا تاویل اور معیار باقی رہتا ہے "میں پاک "صلبوں" اور طاہر "رحموں" سے منتقل ہوتا ہوا "صلبِ عبداللہ" اور رحمِ آمنہ" تک پہونچا"۔ تو پھر اس طہارت و پاکیزگی، نسب اور نجابتِ خاندان کا کیا معیار باقی رہتا ہے۔ جبکہ کافرہ اور مشرکہ عورتوں کا نجس دودھ آپ میں خارجی طور پر داخل تھا (معاذ اللہ)۔

بنی امیّہ نے اپنے دورِ اقتدار میں حضرت آمنہ کی کردار کُشی اور دشمنی پیغمبر اکرمؐ کے جذبے کے تحت بے بنیاد واقعات اور روائتیں وضع کرکے انھیں اتنی شہرت دی کہ لوگ اسے صحیح سمجھنے لگے اور بعد میں مورّخین و محدّثین نے ان کی صداقت پر یقین کرلیا۔ اور اپنی اپنی تصنیفات میں لکھ گئے۔ ورنہ متعدّد عورتوں کو آپ کی " رضاعی ماں "کے درجہ پر فائز کر کے آپؐ کی مادرِ گرامی کی عظمت و وقار اور ایک عظیم امتیازی حیثیت و منزلت کو ایک ناقابلِ فخر حیثیت میں تبدیل کردینے کی ایک ناپاک جسارت نہیں تو اور کیا ہے۔ جبکہ انبیاء و مرسلین کی سیرتِ پاک یہی رہی ہے کہ ان حضرات نے سوائے اپنی طاہر و مقدّس ماؤں کے دودھ کے کسی غیر عورت کے دودھ کا پینا گوارہ نہیں کیا۔ انشاء اللہ اسکا ذکر آگے بعد کے صفحات پر ہوگا۔

اس کے خلاف عقیدہ رکھنا یا گمان بھی کرنا کہ انبیاءؑ کرام نے غیر عورتوں کا دودھ پیا ہے یہ سراسر سیرتِ انبیاءِ کرام کے خلاف ہے اور مزاجِ نبوّت کے بھی منافی۔ تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے کہ پروردگارِ عالم کافرو مشرکہ عورتوں کا دودھ اپنے اس نبیؐ خاتم کیلئے جائز قرار دیتا جس کی طہارت میں کسی بھی جہت سے کوئی نقص نہیں۔ اگر انبیاءِ کرام کی ابتدائی زندگی میں ہی نجس رزق جو کہ حرام ہے، شامل ہو تو پھر وہ قوم کو حلّت و حرمت کے اختیار و اجتناب کا حکم کیونکر دے سکتے ہیں اور قوم میں انکا یہ حکم کس معیار و حیثیت کا حامل ہوسکتا ہے۔

بنی امیّہ نوازی اور بنی ہاشم دشمنی کے جذبات میں مبتلا مورّخین نے سلاطینِ بنی امیّہ کے چشم و ابرو کی جنبش کے ساتھ ساتھ اپنے قلم کو حرکت دی۔ اور پیغمبرِ اکرمؐ کی کردار کشی میں کیا کیا قلابازیاں کھائی ہیں ملاحظہ فرمائیں کہ علاّمہ حافظ ابن قیّم شاگردِ رشید امام تیمیہ تحریر فرماتے

ہیں کہ :۔ "ان میں ابو لہب کی کنیز "ثوبیہ" تھی جس نے آنحضرت کو دودھ پلایا۔ ثوبیہ نے اپنے بیٹے اور ابو سلمہ اور عبداللہ اور عبداللہ ابنِ عبدالاسد اور اس کے علاوہ، آپ کے چچا حضرت حمزہ کو بھی دودھ پلایا تھا۔ ثوبیہ کے اسلام لانے میں اختلاف ہے۔ اس کے بعد حلیمہ نے اپنے بیٹے عبداللہ کے ساتھ آپ کو بھی دودھ پلایا تھا۔ حلیمہ نے آپ کے ایک چچازاد بھائی ابو سفیان ابن حارث ابن عبدالمطلب کو بھی دودھ پلایا تھا (کتاب زادالمعاد حصہ اوّل صٓ ۲۷") اس روایت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں :۔

(۱) سب سے پہلا امر یہ کہ ثوبیہ کے اسلام میں اختلاف ہے۔ (اختلاف کا لفظ لکھ کر ثوبیہ کے کُفر کو مشکوک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ورنہ جب ابولہب نے مرتے دم تک اسلام قبول نہیں کیا تو پھر اس کی لونڈی اسلام کیونکر قبول کر سکتی تھی۔ پھر یہ کہ جب دودھ پلانے کا معاملہ درپیش تھا اس وقت تو اس کے بیدین ہونے میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔

اور اس کا اسلام لانا بھی ثابت نہیں ہے وہ کافرہ اور مشرکہ ہی رہی۔ اس روایت سے کہ آنحضرت کا ثوبیہ کے دودھ کو قبول کرنا اور پینا امر محال ہی نہیں بلکہ ناممکنات سے ہے۔ اس لئے کہ یہ سیرت انبیاء کے منافی ہی نہیں بلکہ مخالف بھی ہے۔ اس کی وضاحت میں صرف اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ کُفر و شرک نجاست ہیں تو پھر کافرہ اور مشرکہ کا دودھ بھی نجس ہوا۔ تو انبیاءِ کرام کی پرورش ہرگز ہرگز نجس رزق سے نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہ روایت محلِ تامّل اور قابلِ غور ہے کہ آنحضرتؐ نے، ابو لہب کی کنیز ثوبیہ کے دودھ کو قبول فرمایا۔ جسکا اسلام لانا ہی ثابت نہیں۔ لہٰذا یہ روایت قطعی غلط اور وضعی ثابت ہوتی ہے۔

(۲) ثوبیہ (ابو لہب کی کنیز) کا ایک ہی وقت میں "۵" بچّوں کو دودھ پلانا امر محال ہے۔ اور نہ ہی ایسا کوئی عورت کر سکتی ہے جبکہ اس امر کی کوئی ضرورت ثابت نہیں۔ وہ "۵" بچّے یہ ہیں :۔ (۱) خود اُس کا اپنا لڑکا۔ (۲) ابو سلمیٰ۔ (۳) عبداللہ ابنِ عبداللہ۔ (۴) حضرت حمزہ۔ (۵) سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم۔

کو ایک ہی ساتھ دودھ پلایا۔ جیسا کہ زاد المعاد کی روایت سے عیاں ہے۔ کیا ایک عورت سے یہ ممکن ہے کہ وقت واحد میں اپنے دودھ سے "۵ بچوں کی پرورش کر سکے۔ اور پھر اسمیں کون سا فقہی اور شرعی جواز' یا اخلاقی و فطری ضرورت کے ساتھ کون سی مجبوری حائل تھی۔

اور روضۃ الاحباب کی اس روایت کو عبدالحق صاحب محدّث دہلوی نے بھی اپنی کتاب مدارج النبوۃ میں تحریر فرمایا ہے :" ثوبیہ کے اسلام میں اختلاف ہے۔ کذا فی روضۃ الاحباب اور اسی ثوبیہ نے حضرت سیّد الشہداء حمزہ ابنِ عبدالمطّلب کو بھی دودھ پلایا تھا۔ اس پر حضورؐ اکرم اور حضرت حمزہ کے درمیان رضاعی بھائی کی نسبت بھی ثابت ہے۔" (مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ) اور یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ ایامِ شیرخوارگی میں کئی بچّوں کے دودھ میں شریک رہے۔ دوسروں کے رزق میں بغیر کسی شرعی ضرورت اور فطری حق کے شریک ہونا حقدار کے حق کو تلف کر دینے کے مترادف ہے اور یہ تحفّظِ حقوق کے ساتھ عدل کے بھی منافی ہے تو پھر یہ کیونکر انبیاءِ کرام کے عادلانہ مزاج کی عکّاسی کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ جہاں انبیاءِ کرام کی غرضِ بعثت ہدایتِ خلق ہے وہیں ان کی ذمّہ داریوں میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ بندگانِ خدا کے تمامتر حقوق کی محافظت کیساتھ نظامِ عدل کے قیام کی کوشش فرمائیں۔

اگر ان دودھ پلانے والیوں کی روایتوں کو بہ فرضِ مُحال تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر ان بچّوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے ساتھ عدل و انصاف کا توازن باقی نہیں رہتا۔ اور اس توازن' عدل اور حقوق کے اتلاف کا ارتکاب (معاذ اللہ) آپؐ کی طرف منسوب ہوئے گا جو یقیناً امرِ محال ہے آپؐ کے متعلق ایسا گمان کرنا بھی ناروا ہے۔ ورنہ پھر انبیاءِ کرام کے انسانی معاشرے میں قیامِ عدل و انصاف' تحفّظِ حقوقِ انسانی اور مساویانہ روش کے تمام احکام افسانوی رنگ میں ڈھل جائیں گے۔ اس لئے نبیِّ کریم کے متعلق یہ عقیدہ کہ آپؐ نے دوسری عورتوں کا دودھ پی کر خود ان کے اپنے بچّوں کو ان کے جائز اور فطری حق سے محروم کر دینے اور

اُن کے اپنے مقرّرہ حصّہ میں کمی کر دینے کے باعث ہوئے یا کچھ حصّہ سے محروم کر دیا یہ مزاجِ نبوّت سے سراسر مخالف قرار پاتا ہے اور یہ امر آنحضرتؐ کے مزاج عدل و انصاف اور آپؐ کی ذاتِ اقدس جو کہ کائنات کے لئے رحمت ہے، سراسر منافی ہے۔

(۳) اب رہا یہ کہ آنحضرتؐ کے ساتھ ثوبیہ نے حضرت حمزہ کو بھی دودھ پلایا تھا۔ یہ نقد و نظر کے معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ اس لئے کہ آنحضرتؐ اور حضرت حمزہ کے سِن ولادت میں تفاوت ہے اور عمروں میں نمایاں فرق ہے۔ آنحضرتؐ، جنابِ حمزہ کے دودھ شریک بھائی نہیں قرار پاتے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں "شہادت کے وقت حضرت حمزہ کی عمر ۵۹ سال تھی اور رسول اللہ سے چار سال بڑے تھے" (طبقاتِ ابن سعد جلد سوم صہ ۲۲۷)۔ اب یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ چار سال کا بچہ وہ بھی عرب ماحول کا، وہ دودھ پیتا رہا ہو؟ جس کی وجہ سے حضرت حمزہ کو آنحضرتؐ کا دودھ شریک بھائی قرار دیا جا سکے؟ یہ روایت کسی طور پر بھی فطرتِ انسانی اور مزاجِ نبوّت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اور نہ ہی مدّتِ رضاعت چار سال ہے۔ اب رہا مورّخین کا تواتر سے اس روایت کو نقل کرنا تو میں سمجھتا ہوں کہ مورّخین نے اس امر میں نہ ہی تاریخ انبیاء کو ملحوظ خاطر رکھا اور نہ ہی مزاج و حقیقتِ محمدیّہ کی نجابت و طہارتِ نسب کا خیال کیا اگر وہ ان مذکرہ بالا امور پر غور فرماتے تو پھر نقد و نظر اور تحقیقِ حق کے دروازے بند نہیں تھے۔ اگر مورّخین اور ان کی روایتوں کے تواتر ہی پر واقعات کی تحقیق و تنقید کے باب کو بند کر دیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ آپؐ کا "شق الصدر" دو مرتبہ کیا گیا اور سیاہی فرشتے نے نکال کر باہر پھینک دی (معاذ اللہ)۔ کیا اور کسی نبیؑ کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آیا۔ یا پھر آپؐ گانا سُننے کے لئے روانہ ہوئے اور اپنی بھیڑ بکریاں اپنے ایک ساتھی چرواہے کے حوالہ کر دیں، لیکن خداوندِ عالم نے آپؐ پر نیند طاری کر دی اور جب آپؐ کی آنکھ کھلی تو وقت گزر چکا تھا (معاذ اللہ)۔ یا پھر "خیبر" میں آپؐ نماز بھول گئے یا صبح کی نماز کے وقت آپؐ بے خبر سوتے رہے۔ اور حضرت بلالؓ کے جگانے پر آپؐ بیدار ہوئے۔ یا پھر آپؐ ایک شادی شدہ خاتون حضرت زینب

(جو کہ آپؐ کی رشتہ کی بہن بھی تھیں) پر عاشق ہو گئے اور ان کے شوہر کو جب اطلاع ہوئی تو انھوں نے حضرت زینب کو طلاق دے دی جس کے بعد آپؐ نے ان سے عقد فرمایا (معاذ اللہ)۔ اس قسم کے سینکڑوں من گھڑت واقعات ہیں، کہاں تک تحریر کروں۔ جس طرح سے یہ تمام روائتیں ناقابلِ اعتنا ہیں۔ اس ضمن کی یہ بھی روایت ہے جو مزاجِ نبوّت سے قطعی مخالف ہی ہے۔ بنی اُمیّہ کو جو جنگِ بدر میں بدنصیبی سے دوچار ہونا پڑا اور جس طرح کے عظیم نقصان انھیں حضرت حمزہ اور حضرت علیؑ کے ہاتھوں جنگِ بدر میں ہوا وہ اس کی نہ تو تلافی کر سکے اور نہ ہی بھلا سکے، بلکہ جنگِ بدر کی اِنتقامِ طلبی کے جذبے انکی نسلوں میں اُترتے چلے گئے۔ جیسا کہ یزید ابنِ معاویہ کے اُس وقت کے اشعار سے عیاں ہے جبکہ اس کے سامنے امامؑ عالی مقام کا سر بریدہ لاکر دربار میں رکھا گیا۔ تو پھر وہ حضرت حمزہ کی اس عظمت سیّدالشّہداء اور اسدِ رسُول کو کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ بنی اُمیّہ نے اپنے ۱۳۲ھ ہجری تک کے دَورِ اقتدار میں جس طرح پیغمبرِ اکرمؐ اور آپؐ کے مقدّس و محترم خاندان کی کردار کُشی کی ہے وُہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ جنابِ حلیمہ کے دودھ پلانے کی روایت پر آگے چل کر تبصرہ ہو گا فی الحال کتاب طبقات ابنِ سعد کی روایتوں کا اِضطرار ملاحظہ ہو۔

جیسا کہ مسرح کہتے ہیں یہ واقعہ حلیمہ کی آمد سے قبل کا ہے ثوبیہ نے اِس سے پہلے حمزہ ابنِ عبدالمطّلب کو دُودھ پلایا تھا۔ اس کے بعد ابو سلمہ ابنِ عبدالاسد المخزومی کو دُودھ پلایا تھا۔ ابنِ عباس کہتے ہیں کہ ثوبیہ نے جو ابولہب کی کنیز تھی، حلیمہ کی آمد سے قبل رسُول اللہ کو چند روز دودھ پلایا تھا۔ اور آپؐ ہی کے ساتھ ابو سلمہ ابنِ عبدالاسد کو بھی دُودھ پلائی تھی۔ لہٰذا ابو سلمہ آپؐ کے دُودھ شریک بھائی تھے۔ (مسرح کی روایت کے بموجب حضرت حمزہؓ اور ابو سلمہ کے ساتھ آنحضرت کو بھی دودھ پلایا تھا۔ اور زاد المعاد کی روایت کے بموجب ثوبیہ نے حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے ساتھ حضرت حمزہؓ اور ابو سلمہ کو دودھ پلایا تھا۔ جبکہ ابنِ عباس کی روایت کے تحت آنحضرتؐ کے ساتھ صرف ابو سلمہ کا ذکر ہے۔

اور حضرت حمزہ اور ابنِ حارث ابن عبدالمطّلب کا کوئی ذکر نہیں۔ روایت کے اس اضطرار کا کیا مطلب اس روایت سے حضرت حمزہ اور ابنِ حارث کی جگہ ابوسلمہ دودھ شریک بھائی قرار دیئے جارہے ہیں۔ ۔طاہر) ۔اور اس امر کو ملحوظ بھی رکھیں کہ روایت حضرت عباّس سے نہیں ہے بلکہ ابنِ عباس سے ہے جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور روایت بلا واسطہ نقل ہو رہی ہے جو معیارِ قبولیت کے لئے دعوتِ غور و فکر ہے۔

(۴) اب روایت کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیں :۔" حمزہ ابنِ عبدالمطّلب اور آنحضرتؐ دودھ شریک بھائی تھے۔ آنحضرتؐ اور انھیں ایک عربیہ عورت نے دودھ پلایا تھا۔"
یہ عربیہ عورت اتنی گمنام اور ناقابلِ ذکر، حیثیتؔ و وقار کی حامل تھی کہ مورّخین کو اس کے نام و نسب سے بھی واقفیّت حاصل نہ ہوسکی لیکن اس مجہول النّسب عورت کا بھی آنحضرتؐ نے دودھ پیا۔ (استغفراللہ)۔ ثوبیہ کے ساتھ اس مجہول النّسب عورت کے بعد ایک اور عورتؐ کے دودھ پلانے کی بھی روایت ملاحظہ ہو۔"

" قبیلۂ بنی بن بکر کے لوگوں میں حضرت حمزہ کے دودھ پلانے کا انتظام تھا۔ رسُول اللہ ایکدن اپنی دودھ پلانے والی ماں حلیمہ کے پاس تھے کہ حمزہ کی والدہ نے آپؐ کو بھی دودھ پلایا، (طبقات ابنِ سعد جلد "ا" ص۱۶۵ تا ص۱۶۷)۔" قارئین نے غور فرمایا کہ ثوبیہ نے دودھ پلایا۔ ایک گمنام عربیہ نے دودھ پلایا۔ جو حضرت حمزہ کو دودھ پلاتی تھی۔ اُس نے بھی آپ کو دودھ پلایا۔ حضرت حمزہ کی والدہ نے آپ کے ساتھ حضرت حمزہ کو دودھ پلایا۔ جبکہ حضرت حمزہ کی عمر چار سال ہے لیکن انھیں بھی یہ مورّخین رسُول اکرم کی کردارکُشی کرنے کی خاطر شیر خوار ثابت کر رہے ہیں۔

(۵) " واقدی کا بیان ہے کہ پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) عورتوں نے آپؐ کو دودھ پلانے کی کوشش کی مگر آپؐ نے کسی کا بھی دودھ اپنے مُنھ میں نہیں لیا۔" (ماہنامہ "الحجّت" شمارہ جولائی ۶۶ء بحوالہ واقدی)۔ جب رسُولِ اکرم نے کسی عورت کا دودھ مُنھ میں نہیں لیا تو پھر عربیہ، ثوبیہ، بکر قبیلہ کی عورت، حضرت حمزہ کی دودھ پلائی اور حضرت حمزہ کی والدہ کے ساتھ حضرت حلیمہ کا

بھی قبول نہیں کیا ورنہ وَاقِدی ہی میں استثناء ہونا چاہئیے تھا جو کہ نہیں ہے۔

روایات میں اِتنے تضادات واختلافات کیوں ہیں؟ اور راویوں میں ایسے لوگوں سے روایت بِلا واسطہ کیوں منسوب ہے جو کہ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ تو پھر اسے نقد ونظر، معیار، واقعیت اور مزاج نبوّت ورِسَالت، سیرتِ انبیاء ورُسل اور سنّتِ اِلٰہیّہ کی میزان پہ پرکھے بغیر کیونکر قبول کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ ذکر کسی معمولی ہستی کا نہیں بلکہ اس عظیم ہستی کا ہے۔ جس کی طہارت ونجابت، وقار وعظمت کے ساتھ عِصمتِ کاملہ میں کائنات میں کوئی دوسرا ہمسر نہیں۔ آخر ان دودھ پلانے والی عورتوں کی کثرت سے کون سا فیض حاصِل ہوتا ہے؟ اس سے کون سے شرعی اَحکام کی وضاحت ہوتی ہے؟ اور اتنی دودھ پلانے والیوں کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ وہ کون سے معارض اور رُکاوٹیں حائل تھیں جنکی وجہ سے آنحضرتؐ کی والدۂ گرامی جناب آمنہؑ نے، آپؐ کو اپنا دُودھ پلانے سے گریز کیا؟ (معاذاللہ) آنحضرتؐ کے پاکیزہ گھرانے کی سیرت، اخلاق وکردار اور عادات تو انتہائی اَعلیٰ وارفع ہیں۔ کیا کسی عام گھرانے میں پیدا ہونے والے بچّوں کو ان کے وَالدین اسی طرح ہر کس وناکس کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ بچّہ جس کا بھی چاہے دُودھ پی لے اور جو بھی چاہے اُسے دُودھ پلا دے بغیر اِس اِمتیاز کے کہ دودھ پلانے والی کس گھرانے سے تعلّق رکھتی ہے اور اس کا حَسَب ونَسَب کیسا ہے جب یہ اَمر عام شریف گھرانے معیوب سمجھتے ہیں تو پھر اس گھرانے کے لئے یہ بات کیونکر ممکن ہو سکتی جو عرب معاشرے میں حَسَب ونَسَب میں سب سے اَعلیٰ ہو۔ اور جس کے اَجداد واُمہات کے سلسلے میں کسی قِسم کی نجاست کا شائبہ بھی نہ ہو۔

اب ذرا سیرتِ اَنبیاء کرام بھی ملاحظہ فرمائیں:۔

(۱) حضرتِ اِبراھیم علیہ السّلام کی پیدائش کا جب وقت آیا تو آپؑ کی وَالدہ ماجدہ نمرود کے خوف سے ایک غار میں جا کر پوشیدہ ہو گئیں۔ جہاں حضرت اِبراہیمؑ کی پیدائش واقع ہوئی۔ آپؑ کی والدہ معظّمہ غار کے دہانے کو ایک پتھر سے بند کر کے بستی میں واپس آگئیں۔ کئی کئی دِن تک آپ کو

حضرت ابراہیمؑ کے پاس جانے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن اس ضرورت کے باوجود حضرت ابراہیمؑ کے لئے نہ کسی دودھ پلانے والی کا بندوبست کیا گیا اور نہ ہی کسی دایہ کا۔ جب حضرت ابراہیمؑ بھوک کا احساس ہوتا آپ اپنا انگوٹھا اپنے دہن مبارک میں لے جاتے اور قدرتِ الٰہی سے اس انگوٹھے سے دودھ جاری ہوجاتا اور اس طرح آپؑ شکم سیر ہو جاتے۔ جب نگاہِ مشیّت نے جناب خلیلؑ کے لئے کسی غیر عورت کے دودھ کو پسند نہیں کیا تو کیا جو فخرِ خلیل اور رحمتِ کائنات ہوں اُسکے حق میں نگاہِ قدرت اس حد تک خاموش تماشائی ہوسکتی ہے کہ آپؐ جس عورت کا چاہیں دودھ پی لیں اور بغیر اس امتیاز کے کہ وہ عورت مسلم ہے یا کافرہ۔ (نعوذ باللہ)۔

(۲) حضرت یحییٰ علیہ السّلام کی جس وقت ولادت ہوئی تھی، آپؑ کے والدین کی عمریں تقریباً نوّے ۹۰ سال کی تھیں۔ اور آپکیؑ والدہ ماجدہ کی عمر اُس منزل پر پہونچ گئی تھی جہاں بچّے کی پیدائش یا دودھ کے جاری ہونیکا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان فطری اُمور کے مانع ہونے کے باوجود قدرتِ الٰہی نے حضرت یحییٰؑ کی والدہ کے علاوہ آپ کے لئے کسی غیر عورت کے دودھ کا انتخاب نہ ہونے دیا بلکہ جناب یحییٰؑ کی مادر گرامی کو اس ضعیف العمری میں اس لائق کردیا کہ وہ آپؑ کی پرورش سے کما حقّہٗ عہدہ برآ ہوسکیں۔ اور کسی دودھ پلانیوالی عورت کی ضرورت لاحق نہ ہوئی۔

(۳) پروردگارِ عالم جب انبیاءِ کرام کو دُنیا میں بھیجتا ہے تو انھیں پاکیزہ اور حلال رزق کے اختیار کرنے کی تمیز بھی عطا فرما دیتا ہے جیساکہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے لئے ارشاد ہوتا ہے "ہم نے موسٰیؑ پر دائیوں کے دودھ کو حرام کردیا کہ کسی کے پستان کو مُنھ نہ لگاتا۔ تب موسٰیؑ کی بہن بولیں کہ میں تمہیں ایسے گھرانے کا پتہ بتاؤں کہ وہ تمہاری خاطر اس بچّہ کی پرورش کردیں گے اور وہ یقیناً اس بچّہ کے خیرخواہ ہوں گے" (سورۂ القصص آیت ۱۲)۔

اس آیتِ کریمہ سے دو۲ امر انتہائی واضح ہیں۔ (۱) حضرت موسٰیؑ عالمِ طفلی میں ہی مرضی و منشاءِ الٰہی کی معرفت رکھتے تھے۔ (۲) حضرت موسٰیؑ عالمِ شیرخوارگی میں ہی حلال و حرام۔ طیّب و

نجس رزق میں تمیز رکھنے کے ساتھ اپنے اور پرائے کے وجود سے بھی آگاہی رکھتے تھے۔
جبھی تو آپؐ نے غیر عورتوں کے دودھ کو قبول نہیں فرمایا۔ اِس سے خارجیت کا یہ نظریہ
اور عقیدہ باطل قرار پاتا ہے کہ آنحضرتؐ چالیس سال تک مقصدِ نبوّت سے آشنا نہ تھے۔ خدا
نے جب حضرت موسیٰ کے لئے اس پُر آشوب دور میں ان کی والدۂ معظّمہ کے پاکیزہ دودھ
کے علاوہ کسی دوسری عورت کے دودھ کو پسند نہیں فرمایا، تو نگاہِ قدرت اِس عظیم ہستی
کے لئے غیر عورتوں کے دودھ کو کس طرح قبول کر سکتی تھی، جسے خود اسی نے حضرت موسیٰ کا
اِمام و ہادی بنایا اور طاہر و اطہر فرمایا ہو۔ ان دودھ پلانے والی روایتوں اور عورتوں کے متعلق
مورّخین کوئی صحیح ضرورت، اِحتیاج اور فقہی و شرعی جواز بھی پیش نہیں کر سکے اور اگر لکھا ہے
تو صرف اتنا کہ عرب رواج کے تحت آپ (آنحضرتؐ) کو دودھ پلانی والی دائی حلیمہ کے حوالے کر دیا
گیا جو آپؐ کو لے کر اپنے خانہ بدوش قبیلہ میں (مکۂ معظّمہ سے دور) چلی گئیں۔

اِس "عرب رواج" کی پناہ گاہ مورّخین نے بے سود اختیار فرمائی۔ اس لئے کہ عربوں
میں مروّج رسم و رواج اور عقائد کے آنحضرتؐ کے بزرگ قطعی پابند اور قائل نہ تھے اور نہ
اُسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ عربوں کے رسم و رواج کے متعلق جو تاریخوں میں حالات
ملتے ہیں۔ وہ مختصراً یہ ہیں کہ بت پرستی عام تھی۔ ہر گھر شراب خانہ تھا۔ جوا۔ قزاقی، زنا، اور
خونریزی کے یہ خوگر تھے۔ جبکہ آنحضرتؐ کا گھرانہ مُصلحین کا گھرانہ تھا۔ جن میں کسی نے ان برائیوں کو
اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ آپؐ کے بزرگ عرب کے بگڑے ہوئے مُعاشرے کی اصلاح میں
منہمک تھے نہ کہ اس کے پابند اور رسم و رواج کے شکار۔ مورّخین کا یہ عرب رواج کی بوسیدہ
بیساکھی کا سہارا لینا درحقیقت آپؐ کے اجداد کرام کی توہین کے مترادف ہے۔ حضرت عبدالمطّلب
کے بارہ ۱۲ بیٹے تھے لیکن کسی کو بھی عرب رواج کے تحت دودھ پلانے والی عورت کے حوالے
نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ آپؐ کے والد بزرگوار جناب عبداللہ ابنِ عبدالمطّلب کے متعلق کوئی بھی
روایت نہیں ملتی کہ انھیں کسی غیر عورت نے دودھ پلایا ہو۔ آخر یہ امتیازی حیثیت جناب حمزہ اور

آنحضرتؐ ہی کے ساتھ کیوں برقرار رکھی گئی ؟

جس وقت کہ آنحضرتؐ کو مکّہ سے دُور ایک خانہ بدوش ماحول میں "عرب رواج کے تحت" بھیجا جا رہا ہے وہ وقت قطعی ایسا نہیں تھا کہ حضرت عبدالمطلب جیسا جہاندیدہ سردار اپنے اس نورِ نظر اور باعثِ تخلیقِ عالَم کو خود کی اور بنی ہاشم کی حفاظت و نصرت سے دُور کر کے مطمئن ہو جائے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت ہاشم کی پیشانی میں نورِ سرکارِ رسالت علیہ جلوہ فگن تھا جس کے سبب یہودیوں نے آپؑ کو قتل کر دینے کی کوشش کی مگر غیبی امداد نے آپکو بچا لیا۔ ان کے بعد خود جناب عبدالمطّلب جب مدینہ سے مکّہ آ رہے تھے تو یہودیوں نے آپؑ کو اس وجہ سے قتل کر دینا چاہا کہ جناب ختمی مرتبت کا نورِ مبارک آپ کی پیشانی میں جلوہ فگن تھا جسے بروقت آپ کی والدہ ماجدہ نے اپنے قبیلے والوں کی نصرت سے کچھ یہودیوں کو قتل کروایا، باقی بھاگ گئے۔ اس کے بعد جب یہ نورِ نبوّتِ محمدیؐ عبداللہ کی پیشانی پر جلوہ فگن ہوا تو اہلِ قریش اور یہودیوں نے مل کر حضرت عبداللہ کو اس وقت ہلاک کر دینے کی کوشش کی جب حضرت عبداللہ شکار کی غرض سے مکّہ کی وادی میں گئے ہوئے تھے لیکن بروقت بنی ہاشم اس سازش سے آگاہ ہو گئے اور وہ وادی میں پہونچ کر یہودیوں اور قریشیوں کا مقابلہ کر کے حضرت عبداللہ کو واپس لے آئے اسکے بعد جبکہ آپ ابھی بطنِ مادر میں تھے تو یہودیوں نے حضرت آمنہ کو قتل کر دینے کی خاطر آپ کی ایک کنیز کو بہکا کر اپنے اس ناپاک منصوبے میں شامل کیا۔ اور اُس کنیز نے عین اس وقت جبکہ تمام بنی ہاشم کسی تقریب میں مصروف تھے اور حضرت آمنہ گھر میں تنہا تھیں تو اُس کنیز نے حضرت آمنہ پر خنجر سے وار کر دیا۔ مگر قدرتِ الٰہی سے اس کا اُٹھا ہوا ہاتھ ساکت ہو گیا اور خنجر اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا جسے دیکھ کر حضرت آمنہ نے شور مچایا جس کو سُن کر تمام بنی ہاشم جمع ہو گئے۔ اور حضرت ابوطالب نے مکّہ کا محاصرہ کرا دیا لیکن سازش تیّار کرنے والی "کاہنہ" شام کیطرف فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔

ان حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اور بڑھتی ہوئی دشمنی کے اس پُرآشوب ماحول میں حضرت عبدالمطلب جیسے شفیق و ناصر اور جہاندیدہ سردار سے یہ کیونکر توقّع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک غیر عورت اور خانہ بدوش لوگوں پر بھروسہ کر کے اپنے اس فخرِ روزگار اور یتیم پوتے کو اپنی حمایت و نصرت سے دُور کر دینے پر برضا و رغبت راضی ہو گئے ہوں گے اور فقط "عرب رواج" کے تحت یہ بات کسی طرح بھی عقلاً قابلِ ذکر نہیں معلوم ہوتی، سوائے اس کے کہ مورّخین نے روایت پرستی کو راہ دی اور بنی اُمیہ کے پروپیگنڈہ کے شکار ہوئے۔ اور واقعی دودھ پلانے والی کی ضرورت تھی تو خود آپؐ کے گھر میں ہاشمیہ خاتون موجود تھیں یعنی حضرت فاطمہ بنتِ اسد جو کہ آپ کی حقیقی (سگی) چچی ہیں اور ان کے بڑے لڑکے حضرت طالب جناب سرکارِ دو عالم کے ہم عمر تھے۔ اگر دودھ کی ضرورت تھی تو وہ بھی گھر ہی میں دستیاب تھا، دُور جانے کی چنداں احتیاج نہ تھی۔

ماں کی صلاحیت و کردار کے اثرات بچّہ پر

جہاں بچّوں کی تربیت، عادات اور اطوار کی ذمّہ دار مائیں ہوتی ہیں، وہیں شیرِ مادر بھی بچّوں کو اپنے اثرات سے متاثّر کرتا ہے۔ اس ضمن میں کسی طویل بحث کو چھیڑنے کی بجائے صرف حضرت علیؑ کا ایک واقعہ درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے اور اس واقعہ سے ماں کے دودھ کی اہمیّت واضح ہو جاتی ہے۔ "حضرت علیؑ نے اپنے بھائی جناب عقیل سے فرمایا کہ میں ایک ایسی خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو کسی بہادر قبیلہ سے ہو تاکہ ایک بہادر بچّہ پیدا ہو۔" جہاں تک بہادری کا تعلّق ہے، حضرت علیؑ کی ذاتِ گرامی ایسی تھی کہ آپ اشجع عرب کہلاتے تھے، پھر ایک بہادر عورت کی آپ کو ضرورت کیوں پیش آئی؟ مقصد یہ تھا کہ آپ بچّہ کو ماں کی طرف سے بھی بہادری کا ورثہ دار چاہتے تھے اس لئے آپؑ نے ماں کے دُودھ کے لئے بھی ایک بہادر عورت کا انتخاب پسند فرمایا۔ اور آگے چل کر آپ کی اس خواہش اور انتخاب کا راز واقعۂ کربلا میں حضرت عباسؑ ابنِ

علیؑ ابنِ ابیطالب اُور آپکے بھائیوں کے صابرانہ، وفا، باوقار شجاعت وہمّت سے واضح ہُوا۔

جہانتک دودھ پلانیوالی عورتوں کا تعلّق ہے تو اس ضمن میں کسی اہم وجہ کسی خاص ضرورت کا کوئی ذکر نہیں ملتا آخر طیّب وطاہر والدہ کے دودھ کو نظر انداز کرکے غیر عورتوںکے دودھ کا کیوں اِنتخاب کیا گیا؟ جبکہ اِس ضمن میں روایتوں کی تکرار اُور مورّخین کے اِتّفاق سے صرف یہ اُمر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت حلیمہؓ بھی نسلِ حضرت اِبراہیم علیہ السّلام سے تھیں اُور آپ بھی مُسلمہ تھیں۔ لیکن کسی مورّخ نے یہ نہیں لکھا کہ حلیمہ درجات ومنزلت میں حضرت آمنہ سے بلند تھیں یا حضرت آمنہ کے برابر تھیں۔ تو افضل واکرم والدہ کی موجودگی میں کسی عام گھرانے کی عورت کا اِنتخاب بلاوجہ ہے۔ اس کے علاوہ حقوق العباد کے تحفّظ کا جہاں تک تعلق ہے اس کا احساس مورّخین کو بھی نظر آتا ہے کہ انبیاء کرام کسی کے حق تلف نہیں کرتے چنانچہ اِس اُمر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے حضرت حلیمہ کی زبانی یہ روایت بھی نقل کردی گئی کہ "میں نے بارہ بچّوں کو صرف ایک ہی پستان سے دودھ پلایا ہے۔ اِس لئے کہ میرا دوسرا پستان خشک تھا۔ لیکن اس بچّہ کے مُنہ لگاتے ہی اس خشک پستان سے دودھ جاری ہوگیا اُور یہ بچّہ (یعنی پیغمبرِ اکرمؐ) صرف اِسی ایک پستان سے دودھ پیتا ہے اور دوسری طرف رُخ بھی نہیں کرتا۔ اگر یہ معجزہ ہے تو ہم انبیاء کرام کے معجزات کا مُنکر نہیں۔ اگر بفرضِ محال والدۂ گرامیِ پیغمبرؐ جناب آمنہ کے ساتھ بھی اگر اِسی قسم کا کوئی عارضہ لاحق ہوتا تو پروردگارِ عالم یہ معجزہ حضرت آمنہ کے حق میں بھی ظاہر فرما سکتا تھا۔ اِس لئے کہ جب ہزاروں برس سے قدرتِ الٰہی اس ذاتِ اقدس کے لئے بہترین "صُلبوں اُور پاک وطاہر رحموں" کا اِنتخاب کرتی رہی تو آخر ولادتِ پیغمبرؐ کے بعد اس طہارتِ نسب کی حفاظت کو کیوں نظر انداز کردیا گیا؟۔

اِس لئے یہ اُمر کسی طرح بھی طہارتِ پیغمبرؐ کے معیار پر پورا نہیں اُترتا کہ ثوبیہ جیسی کنیز جس کے مسلمان ہی ہونے کی سند حاصل نہیں ہوتی تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی ایک مشرکہ کے نجس دودھ کو قبول کرلیتی۔ لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ سب روائتیں

من گھڑت اور صرف زیبِ داستان کیلئے ہیں، حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ بعض اور روائیتیں تاریخ و حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں مثلاً آنحضرتؐ کے متعلق اگلے اور پچھلے گناہوں کا ارتکاب یا آپؐ کا حضرت زینب پر فریفتہ ہو جانا، یا پھر سجدے کے دوران بتوں کی مدح سرائی کرنا وغیرہ۔ جیسے علمائے شیعہ اور علمائے اہلسنّت غلط اور لغو قرار دیتے ہیں۔ جب آنحضرتؐ کے حق میں جھوٹی اور جعلی حدیثوں کا وجود کتابوں میں موجود ہے اور علمائے کرام ان کی سختی کے ساتھ تردید کر رہے ہیں۔ تو پھر انھیں کتابوں میں یہ دودھ پلانیوالی بھی روایت مذکور ہے تو پھر اسے اگر نقد و نظر کے معیار پر صحیح ثابت نہ ہونیکے سبب رد کر دیا جائے تو کون سی مذہب میں خرابی واقع ہو سکتی ہے۔ جبکہ قبول کر لینا رسولِ اکرم کی نجابت و طہارت پر کھلی ہوئی حرف گیری اور بہتان تراشی کے مترادف ہے۔ اب رہا مشیّتِ الٰہی کا تذکرہ تو منشائے الٰہی قرآن میں واضح ہے جیسے میں "آیتِ تطہیر" کے ترجمے کی روشنی میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے، اے اہلبیتِ پیغمبرؐ! پروردگار کا یہ ارادہ ہے کہ تم کو ہر برائی سے پاک و پاکیزہ رکھے جو حق ہے پاک و پاکیزہ رکھنے کا۔" (سورۂ احزاب آیت ۳۳) پروردگارِ عالم کا ارادہ صرف اہلبیتؑ کو پاک و پاکیزہ ہی رکھنے کا نہیں، بلکہ ہر قسم کی برائی سے بھی دور رکھنے کا ہے۔ تو نجاست بھی ایک برائی ہے۔ اور جب اہلبیتؑ اطہار ہر قسم کی نجاست و برائی سے پاک و پاکیزہ ہیں تو اہلبیتؑ کرام کی طہارت کیساتھ ہر فضیلت و منزلت کا سرچشمہ اور ذریعہ ذاتِ گرامی پیغمبرِ اکرمؐ ہیں تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ منشائے الٰہی کیخلاف مشرکہ عورتوں کا دودھ جو برائی بھی ہے اور نجاست بھی تو سرکارِ دو عالم ایسے دودھ کو کیونکر قبول کر سکتے تھے؟ اس طرح آیتِ تطہیر کی روشنی میں بھی یہ امر ناممکن و محال قرار پاتا ہے۔

(واللہ اعلم بالصّواب)

٭

حضرت عبدالمطّلب نے آپؐ کی ولادت کے ساتویں دن آپؐ کا عقیقہ کیا اور آپکا
اسمِ مبارک "محمّد" رکھا۔ ضیافت میں تمام اہلِ مکّہ کو دعوت دی۔ لوگوں نے دعوت کے بعد
پوچھا کہ آپ نے بچّہ کا کیا نام رکّھا ہے تو حضرت عبدالمطّلب نے فرمایا "محمّد" لوگوں نے
کہا کہ آپ نے ویسے ہی نام کیوں نہیں رکّھا جیسے اب تک گھرانے میں رائج ہیں۔ عبدالمطّلب
نے کہا میں نے اس نیّت سے یہ نام رکّھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ممدوح فرمائے سمٰوات میں اور
مخلوقِ خدا زمین پر اس کی مدّاح ہو (تاریخ احمدی ص۸ بحوالہ بیہقی)۔

حضرت عبدالمطّلب نے آخر عمر میں "یمن" کا سفر کیا اور وہاں کے بادشاہ سے اہلِ
مکّہ کے لئے مراعات حاصل کرنے کی خاطر ملاقات کی۔ یمن کے بادشاہ سیف بن ذی یزن
نے حضرت عبدالمطّلب سے کہا کہ ایک ایسے راز میں آپ کو شریک کرتا ہوں جسے آج تک
میں نے کسی سے بیان نہیں کیا اور میں صرف آپ کو اس راز کا اہل سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد
سیف نے آنحضرت کے مبعوث بہ نبوّت ہونے کی خوشخبری سناتے ہوئے کہا، اس بچّے
کے پشت پر ایک نشانی ہے جس میں لکھا ہوا ہے" لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ اور محمّدٌ رّسُولُ اللہ" اور
اس بچّے کے ماں اور باپ دونوں زندہ نہیں رہیں گے اور ان کی پرورش اس کے دادا
اور اس کے بعد اس کے ایک چچا کریں گے۔ اور مجھے گمان ہے کہ اس کے دادا آپ ہی
ہیں۔ عبدالمطّلب نے کہا کہ تمہارا گمان بالکل صحیح ہے۔ اُس نے کہا کہ میں آپ کو اسکا گواہ
قرار دیتے ہوئے اس پر ایمان لاتا ہوں اور اس امر کی گواہی دیتا ہوں کہ جو کچھ وہ اپنے پروردگار
کی جانب سے لایا ہے وہ حق ہے۔ کاش میں اس کی بعثت تک زندہ رہتا اور اُسکی نُصرت
میں اپنی جان اس پر فدا کرتا۔ اے عبدالمطّلب اس کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرنا خاص کر
یہودیوں اور اپنی قوم سے بھی جن کی عداوت سب سے بڑھ کر ہے۔ یہ لوگ حسد کرینگے
اور نقصان پہونچائیں گے۔ اس کے بعد بادشاہ نے اپنا گھوڑا (عقاب) اور شہب (خچّر)
اور ناقہ (عضبا) حضورِ اکرم کے لئے تحفہ بھیجا اور کہا اپنے صاحبزادے کو میرا اسلام کہئے گا اور یہ

تحفے انھیں دیجئے گا۔ اس کے علاوہ عبدالمطلب اور آپ کے ہمراہیوں کو بھی گراں بہا تحائف دیئے اور عزت و احترام کے ساتھ روانہ کیا۔ جب آپ مکہ واپس آئے تو لوگوں سے پوچھا میرے سید و سردار اور آقا کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا وہ آپ کے استقبال کے لئے ایک پتھر پر تشریف فرما ہیں۔ عبدالمطلب نے حضرت رسالتمآبؐ کو گود میں اٹھا کر انھیں بوسہ دیا، اور بادشاہِ یمن کے تحفے پیش کئے۔ آپؐ نے اس کے حق میں دعائے خیر دی اور آپؐ اس کے بھیجے ہوئے گھوڑے پر سوار ہوئے تو وہ خوشی سے اچھلنے لگا۔ (حیات القلوب جلد ۲ صـ ۹۵)۔

"جب آپؐ چھٹے سال کے ہوئے تو حضرت آمنہ آپؐ کو ہمراہ لے کر اپنے شوہر حضرت عبداللہ کی قبر کی زیارت کے لئے گئیں اور مدینہ میں ایک ماہ تک قیام پذیر رہیں۔ واپسی پر مقامِ ابواء (جحفہ سے ۲۳ میل دور ایک گاؤں) پر انتقال کیا اور وہیں پر دفن ہوئیں۔ والدہ کے بعد حضرت عبدالمطلب نے آپؐ کو پہلے سے زیادہ اپنے دامنِ عاطفت و تربیت میں رکھا۔ اور ہمیشہ آپؐ کو اپنے ہمراہ رکھتے تھے اور اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ حضرت عبدالمطلب وہ پہلے شخص ہیں جن کے لئے کعبہ کے سامنے مسند بچھائی گئی۔ چنانچہ علامہ ابن الاثیر تحریر فرماتے ہیں کہ عبدالمطلب کے لئے کعبہ کے سایہ میں فرش بچھایا جاتا اور اس پر ان کے بیٹوں میں سے بھی کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ محض ان کی تعظیم و تکریم کی خاطر۔ لیکن جب رسولِ خدا تشریف لاتے تو آپ اسی پر بیٹھتے۔ پس آپؐ کے چچا جب وہاں سے ہٹانا چاہتے تو آپ فرماتے اس کو یہیں رہنے دو میرے اس فرزند کی بڑی عظیم شان ہے۔ (تاریخ ائمہؑ صـ ۹۸ بحوالہ تاریخ کامل اور اسد الغابہ جلد ا" صـ ۱۷)۔

منقول ہے کہ کئی سال تک بارش نہ ہوئی لوگ حضرت عبدالمطلب کے پاس آئے کہ آپ بارش کے لئے دعا فرمائیں۔ حضرت عبدالمطلب تمام اپنی اولاد کو اور آنحضرتؐ کو لے کر کوہِ ابوقبیس پر گئے اور آنحضرتؐ کے وسیلہ سے دعا مانگی ابھی یہ لوگ اپنی جگہ سے دور بھی نہیں ہوئے تھے۔ ابر گھر کر آئے اور بارش شروع ہوگئی۔

اَب وہ وقت آچکا ہے کہ عبدالمطّلب اپنے میں نقاہت محسوس کر رہے ہیں، بار بار نگاہیں مکین اُوپنے کی جانب اُٹھتی ہیں اور رُک جاتی ہیں۔ اور بھتیجے کی حفاظت کے لئے فکر مند ہیں۔ حضرت عبدالمطلب کے بارے میں مختلف روائتیں ہیں، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی صاحب نے ایکسو چالیس ۱۴۰ برس کی عمر لکھی ہے جبکہ شبلی نعمانی صاحب نے ۸۲ سال کی عمر والی روایت کو تحریر کیا ہے۔ ایک روز حضرت عبدالمطّلب اپنے بیٹوں کو لے کر خانۂ کعبہ میں حاضر ہوئے اور ہر ایک کو مخاطب کر کے فرمایا، تم سب اِن کی نصرت و حفاظت کا عہد کرو اس کے بعد آپ نے حضرت ابو طالب سے فرمایا اِس یگانہ روزگار کی حفاظت کرنا۔ اِس نے نہ باپ کی خوشبو سونگھی ہے۔ اور نہ ماں کی شفقت کا لطف اُٹھایا ہے۔ مَیں اپنے تمام فرزندوں میں سے تمھیں مخصوص طور پر اس کی حفاظت کا ذمّہ دار ٹھہراتا ہوں۔ اِسلئے کہ اِسؐ کا باپ اور تم (دونوں) ایک ہی ماں سے ہو۔ اَے ابو طالب اگر تمہاری حیات میں اسؐ کی جلالت وعظمت (نبوّت) کا ظہور ہو تو جسے میں اچھّی طرح جانتا ہوں تو جہاں تک ممکن ہو سکے پیروی کرنا۔ اور اپنے ہاتھ و زبان اور مال سے اسؐ کی نصرت کرنا۔ خدا کی قسم یہ بہت جلد تمہارا سردار اور اس کو اِقتدار و عظمت حاصل ہوگی ایسی عظمت و رفعت اور منزلت جو ہمارے باپ دادا میں بھی کسی کو حاصل نہ تھی۔ اَے فرزند کیا تم نے میری وصیّت قبول کی۔ اَبو طالب نے اقرار کیا اور عہد کرتے ہوئے کہا کہ جی ہاں۔ اس کے بعد عبدالمطّلب نے اَبو طالب کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا کہ اب موت مجھ پر آسان ہو گئی۔ عبدالمطّلب نے زندگی بھر کبھی بھی آنحضرتؐ کے ساتھ تحکّمانہ انداز اختیار نہیں کیا بلکہ ہمیشہ آپؐ کو سیّد و آقا کہتے رہے، یہاں تک کہ جب عبدالمطّلب کا آخری وقت آیا، تو آپ نے آنحضرتؐ پر اپنا فیصلہ مسلّط کرنا پسند نہیں کیا بلکہ فرمایا، آپؐ میرے بعد کس کی کفالت میں رہنا پسند کریں گے۔ سرکارِ دو عالم نے ایک بار اپنے تمام چچاؤں پر نگاہ کی اور حضرت اَبو طالب کے دامن کو جا کر تھام لیا۔ عبدالمطّلب نے آنحضرتؐ کو اپنے سینے سے

لپٹا لیا اور فرماتے جاتے تھے کہ ایسی خوشبو تو میں اپنے فرزندوں میں نہیں پاتا۔ اے کاش میں آپؐ کے زمانے تک زندہ رہتا یہ آپ فرما ہی رہے تھے کہ آپ کی روح مقدّس ملاءِ اعلیٰ کی جانب پرواز کر گئی۔ اس وقت آنحضرتؐ کی عمر آٹھ سال تھی۔ (حیات القلوب جلد ۲ صفحہ ۶۸)۔

علّامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ "جب عبد المطّلب کا جنازہ اُٹھا تو آنحضرت ساتھ ساتھ تھے اور فرطِ محبّت سے روتے جاتے تھے۔ عبد المطّلب نے مرتے وقت اپنے فرزند ابو طالب کو آنحضرت کی تربیت سپرد کی۔ اس لئے کہ آنحضرتؐ کے پدر بزرگوار حضرت عبد اللہ اور حضرت ابو طالب ماں جائے بھائی تھے۔ ابو طالب، آنحضرتؐ سے اس قدر محبّت کرتے تھے کہ آپؐ کے مقابلہ میں اپنے بچّوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ سوتے تو آنحضرتؐ کو ساتھ لے کر۔ اور باہر جاتے تو ہمراہ لے کر جاتے۔ (کتاب سیرۃ النّبیؐ جلد "۱" صفحہ ۱۲۸)۔

حضرت عبد المطّلب کی اِصلاحات اور اِسلام

"سیرۃ حلبیہ جلد "۱" صفحہ ۴ پر ہے کہ حضرت عبد المطّلب نے ایسے قواعد مرتّب کئے جن میں کثرت کو قرآن نے بحال رکھّا اور کچھ کو سُنّتِ نبویؐ نے۔" اُن قواعد و اصلاحات میں یہ چند ہیں۔

(۱) وَفائے نَذر۔

(۲) دِیت، خوں بہا یعنی اِنسانی زِندگی کے عِوض سَو اُونٹ۔

(۳) محرم عورتوں سے نکاح کی مُمانعت و حُرمت۔

(۴) گھر میں دروازے سے داخل ہونا۔

(۵) چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔

(۶) لڑکیوں کی پیدائش پر نفرت وحقارت کے اظہار اور ان کے قتل سے ممانعت۔

(۷) حرمتِ شراب۔

(۸) حرمتِ زِناء۔

(۹) زِناء کی سزا یعنی حد کا جاری کرنا۔

(۱۰) برہنہ حالت میں طوافِ کعبہ کی ممانعت۔

(۱۱) حج میں صرف پاک (حلال وجائز) پیسہ خرچ کیا جائے۔

(۱۲) فاحشہ عورتوں (جھنڈے والیوں) کو حدودِ حرم میں داخل ہونے کی ممانعت۔

(۱۳) تعظیمِ شہور یعنی سال میں چار مہینے محترم ہیں جن میں کسی قسم کا جدال و قتال اور فساد کی سختی سے ممانعت اور ان کے احترام کی ترغیب۔

(۱۴) میزبانی کی ترغیب اور مہمانوں کا احترام۔

(۱۵) مُباہلہ (مناظرہ)۔

(۱۶) "قُرعہ اندازی"۔ اِسے علّامہ عبداللہ العمادی نے بھی اپنی کتاب تاریخ اِسلام میں ضوابطِ مُطّلبی کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ "آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا، حضرت عبدالمطّلب کی پانچ سُنّتیں ایسی ہیں جنھیں پروردگارِ عالم نے اسلام میں بھی بجنسہٖ برقرار رکھّا۔

(۱) مُحارم مستورات سے نکاح کی ممانعت، جسے پروردگارِ عالم نے سورۂ نِساء آیت نمبر "۲۲" کے ذریعہ برقرار رکھّا۔

(۲) مالِ غنیمت کا پانچواں حصّہ راہِ خدا میں دے دیا جائے، جسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال آیت ۴۱ میں قائم رکھّا۔

(۳) زمزم کو انھوں نے حاجیوں کا "سقایا" قرار دیا۔ جسے خدا نے سورۂ حج، آیت ۹۹

کے ذریعہ قائم رکھا۔

(۴) قتل کا خوں بہا، عبدالمطلب نے سو اونٹ قرار دیا جسے خلاقِ دو جہاں نے برقرار رکھا

(۵) عبدالمطلب سے قبل "طوافِ کعبہ" کی کوئی حد معین نہ تھی، انھوں نے سات مرتبہ طوافِ کعبہ کی حد مقرر کی اور پروردگار نے بھی اسی حد کو قائم رکھا --- اور فرمایا، عبدالمطلب نے کبھی نہ جوا کھیلا اور نہ بتوں کی پرستش کی اور نہ ہی ان جانوروں کا گوشت کھایا جو بتوں کے لئے کاٹے جاتے تھے۔ اور عبدالمطلب خود فرماتے تھے کہ میں اپنے جد ابراہیم کے دین پر ہوں" (حیات القلوب جلد ۲ صفحہ ۹۷)۔

اب قارئین خود فیصلہ کریں کہ ایک طرف حضرت عبدالمطلب کے یہ کردار و اعمالِ صالح ہیں کہ مرنے کے وقت بھی نہ انھیں اپنے مال و دولت کی فکر ہے اور نہ ہی دنیا و عقبیٰ کی وہ فکرمند ہیں تو صرف اس امر پر کہ حضورؐ اکرم کی حفاظت و نصرت کا ایسا انتظام کر جائیں کہ قریش و یہود اور بنی امیہ کی دشمنی سے رسولِ خدا محفوظ رہیں، پہلے آپ نے تمام بنی ہاشم اور اپنے بیٹوں سے خانۂ کعبہ میں نصرت و حفاظت کا عہد لیا اور پھر اسے حضرت ابوطالب کو مخصوص طور پر اس حفاظت و نصرت پیغمبرِ خدا کی ذمہ داری سونپ دی اور جب ابوطالب نے اپنے عہد پر قائم رہنے کا یقین دلایا تو حضرت عبدالمطلب نے اس جہانِ فانی سے عالمِ بقا کی طرف سفر اختیار کیا، وہ عبدالمطلب جو پیغمبرؐ خاتم کی نبوت و رسالت پر کامل ایمان رکھتے تھے وہ آپ کو کسی ایسی عورت کا دودھ پینے دیتے جو کافرہ اور مشرکہ ہو۔ اس سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ثوبیہ اور دیگر عربیہ عورتوں کا ذکر کہ ان عورتوں نے آپؐ کو دودھ پلایا، یہ بعد کا اضافہ ہے اور یہ رضاعی ماؤں، بہنوں اور بھائیوں کا جو ذکر ہے یہ صرف پیغمبرؐ اکرم کے پاک و پاکیزہ نسب نامہ کو داغدار کرنے اور جناب آمنہ مادرِ گرامی پیغمبرؐ اکرم کی کردارکشی اور ان کے مرتبۂ عظمت و وقار کو سبک کر دینے کی ایک ناپاک جسارت ہے۔ جب انبیائے کرام کی سیرت سے یہ امر ثابت نہیں کہ

ان حضرات نے اپنی ماؤں کے علاوہ کسی غیر عورت کے دودھ کو قبول کیا تو ہم امام الانبیاء حضرت ختمی مرتبت کے متعلق اِس قسم کی غلط باتوں کو کیونکر منسوب کر سکتے ہیں۔

قارئین کرام اس میثاقِ انبیاء کی آیت پر غور فرمائیں جس میں پیغمبرِ اکرمؐ پر اِیمان لانے اور آپؐ کی نصرت کا عہد پروردگارِ عالم نے عالمِ ارواح میں لیا تھا۔ اور حضرت عبدالمطّلب نہ صرف یہ کہ پیغمبرؐ پر ایمان رکھتے ہیں، اور نصرت کرتے ہیں بلکہ آپ اپنے لڑکوں سے بھی نصرتِ پیغمبرؐ کا عہد لیتے ہیں۔ یہ عمل حضرت عبدالمطّلب کا وہ ہے جو انبیاءؑ و مرسلین کا تھا۔ اب اس کے بعد ان اذہان باطلہ اور افکار رذیلہ کے بارے میں کیا کہا جائے جو آنحضرتؐ کے آباء و اجداد کو کافر و مشرک کہتے ہیں۔ لیکن تاریخ اسلام کی یہ اعلیٰ شخصیتیں اور ان کے اعلیٰ کردار و عقیدے، اسلام کی اعلیٰ اقدار، پاکیزگی، فکر و شعور اور یقین و عرفان کے یہ روشن چراغ مورّخین کو اس حد تک ناقابلِ اعتناء نظر آئے کہ انھیں کفر و ضلالت (دورِ جاہلیت) میں شمار کر لیا گیا، یا پھر ان حق پرستوں کے ساتھ عسکری قوّتوں کے جاہ و حشم، رُعب و دبدبے، خزانوں میں سیم و زر کی فراوانی، سر پہ تاج شاہی کی چمک اور اقتدار و حکومت کی جھوٹی شان و شوکت نہیں دکھائی دی۔ کتنے افسوس اور بدنصیبی کا مقام ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ تو یہ فرمائیں کہ میرے آباؤ اجداد سب کے سب مسلمان تھے۔ اور مسلمان یہ کہیں کہ وہ عذاب میں مبتلا ہیں اس لئے کہ وہ کافر و مشرک مرے (معاذاللہ) کیا ایمان اور توحید خالص یا ایمان بالرّسول اسی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ "فطرت کی چنگاری جو بُت پرستی کی راکھ میں دبی ہوئی تھی۔ عبدالمطّلب اور ابو طالب میں از سرِ نو چمکی۔ اور پیغمبرؐ صاحب کے بزرگوں میں ہی دو بزرگ ایسے قریب کے بزرگ تھے کہ اگر خارج سے کسی خیالات کا اثر پڑتا تو اِن دونوں بزرگوں کے خیالات کا پڑتا۔ پیغمبرؐ صاحب پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ آٹھ برس کی عمر تک دادا عبدالمطّلب نے پرورش کی۔ ان کی وفات کے بعد

آٹھ برس کی عمر سے چچا اَبو طالب نے ــــ عبد المطّلب اَور اَبو طالب کے حالات سے روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ دونوں دینِ فطرت کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے اور چونکہ ان کا زمانہ فطرت کا زمانہ تھا اس لئے وہ دین فطرت ہی کے مکلّف تھے۔" (اُمّہات الأمۃ)۔ میثاقِ انبیاء کے سلسلے میں آپ پچھلے صفحات پر پڑھ چکے ہیں کہ پیغمبرِ خاتم کی نصرت وحمایت کا عہد پروردگارِ عالم نے عالمِ اَرواح میں اَنبیاء ومرسلین سے لیا۔ اور حضرت عبد المطّلب نے پیغمبرِ خاتم کی نصرت وحمایت کے ساتھ اِتّباعِ پیغمبرؐ کا عہد اپنے خاندان والوں، اپنی اَولاد اَور بالخصوص حضرت اَبو طالب سے لیا اَور اس کے بعد آپ نے اِنتقال کیا۔ اس روشن عقیدے، وَاضح دَلیل کے بعد بھی کیا یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عبد المطّلب (معاذ اللہ) کافر تھے۔ اگر وہ کافر تھے یا ہوتے تو اُن کی اِصلاحات، اُنکے ضوابط اور ان کے رائج کردہ دینی اُمور ورَواسم پروردگارِ عالم اِسلام میں باقی نہیں رکھتا۔ ضوابطِ مُطّلبی کا بجنسہٖ اِسلام میں باقی رہنا ہی اس اَمر کی بیّن دَلیل ہے کہ حضرت عبد المطّلب بھی دینِ اِبراہیمی کے پیرو اَور ملّتِ اِسلامیہ میں شامل تھے جیسا کہ قرآن میں حکم موجود ہے کہ "ملّتِ ابراہیمیؑ کی اِتّباع کرو" اَور خود جناب عبد المطّلب کا آنحضرتؐ کو اَپنا سَیّد وسردار کہنا اور سمجھنا کیا یہ اس اَمر کی روشن دَلیل نہیں ہے کہ وہ آپؐ کو نبی سمجھتے اور ان کا اس اَمر پر یقین و ایمان بھی تھا۔ ورنہ آج تک کبھی بھی اَیسا نہیں ہُوا کہ کسی دَادَا نے اپنے پوتے کا اس طرح احترام کیا ہو اَور مجمع عام میں اسے اَپنا آقا ومَولا کہا ہو۔

اس کے علاوہ غزوۂ حُنین کے وقت جبکہ آپؐ کے ہمراہ صرف چار پانچ اصحاب رہ گئے تھے اَور آپؐ اپنے گھوڑے پر سَوار ہاتھوں میں نیزہ لئے ہوئے برابر رجز پڑھ رہے تھے کہ "میں جھوٹا نہیں ہوں، میں نبی ہوں اَور میں عبد المطّلب کا فرزند ہوں۔" آپؐ کے ان کلمات کی روشنی میں حضرت عبد المطّلب کا قطعی اِسلام اور صاحبِ ایمان ہونا ثابت ہے۔ اگر حضرت عبد المطّلب (معاذ اللہ) کافر ہوتے تو آپؐ ان کی فرزندی پر فخر ومُباہات

ہرگز ہرگز نہیں کرتے۔ آپؑ کا حضرت عبدالمطلب پر فخر کرنا ان کے صاحبِ ایمان ہونے پر دلیلِ محکم اور نصِ قطعی ہے۔

حضرت عمران ابنِ عبدالمطلب (ابوطالبؑ)

آپ کی والدہ کا نام فاطمہ تھا جو عمر ابنِ عائذ بن عمر بن مخزوم کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کے بطن سے حضرت عبداللہ، ابوطالب، زُبیر، عبدالکعبہ اور بیضاء، امیمہ، برہ، عاتکہ پیدا ہوئے۔ یہ چار لڑکے اور چار لڑکیاں، حضرت عبدالمطلب کی بیوی جناب فاطمہ بنتِ عمر ابنِ عائذ سے پیدا ہوئیں۔ جن میں حضرت ابو طالب (عمران) حضرت عبداللہ کے بڑے بھائی تھے۔ حضرت ابوطالب کا اصل نام عمران تھا۔ لیکن آپ اپنی کنیت (ابوطالب) سے زیادہ مشہور رہیں۔ آپ کا ایک نام حضرت مناف ابنِ حضرت عبدالمطلب بھی تاریخوں میں مندرج ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے اپنے دادا حضرت مناف (مُغیرہ) کے نام پر آپ کا بھی ایک نام رکھا ہو۔ مَیں پچھلے صفحات پر لکھ چکا ہوں کہ مناف نام کے کسی بُت کا تذکرہ احقر کی نگاہوں سے کسی معتبر کتاب میں نہیں گزرا۔ لہٰذا لفظ مناف کو خواہ مخواہ کسی بُت کی طرف منسوب کرنا، تاریخ و تحقیق میں بد دیانتی ہے۔ جبکہ اس کا ثبوت ہی نہیں تو بحث سے کیا فائدہ۔ چنانچہ روضۃ الاحباب میں ہے کہ "جناب ابوطالب بھی مکارمِ اخلاق اور انسانی خدماتِ جلیلہ کے اعتبار سے اپنے بزرگوں ہی کی مثل ثابت ہوئے۔ خصوصاً حضرت رسولِ خدا کی حفاظت و حمایت و تربیت تو آپ نے اس طرح کی کہ حقیقی باپ بھی عموماً ایسا نہیں کرتے۔ آپؐ کو اس کا احساس بھی نہ ہونے دیا کہ آپؐ یتیم ہو چکے ہیں یا شفیق دادا کا سایہ سر سے اُٹھ چکا ہے۔ ایک دُرِّ یگانہ کی طرح آپؐ کو اپنے سے لپٹائے اور اپنی جان خطرات میں ڈال کر آپؐ کی حفاظت و کفالت اور خدمات انجام دیتے رہے کسی وقت بھی اپنے سے جدا نہ ہونے دیا۔ سوتے تو اپنے پہلو میں سُلاتے۔ کھانے پینے، پہننے اور دیگر ضروریات میں ہمیشہ

اپنے بچوں پر آپؐ کو فوقیت اور ترجیح دیتے اور اپنے اہل و عیال پر آپؐ کو مقدم رکھتے۔ خصوصاً قریش و بنی امیہ اور اشرار یہود سے آپؐ کی حفاظت و نگہبانی فرماتے۔" (روضتہ الاحباب جلد اول ص ۹۷)

قبل بعثت آنحضرتؐ کے کرامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ اپنے چچا حضرت ابو طالب کے ساتھ مقام ذوالمجاز پر تھے کہ حضرت ابو طالب پر شدید پیاس کا غلبہ ہوا۔ تلاش بسیار کے بعد بھی پانی دستیاب نہ ہوا۔ ابو طالب کا مزاج نبوت آشنا تھا۔ بجائے کسی تگ و دو کے نگاہیں بھتیجے کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں، لب ہلے "بھتیجے مجھے پیاس کی شدت ہے" آنحضرتؐ نے زمین پر ٹھوکر ماری اور ایک سرد و شیریں چشمۂ آب ابل پڑا۔ حضرت ابو طالب سیراب ہوئے۔ اور اس کے بعد آپؐ کی دوسری ٹھوکر سے چشمہ بند ہو گیا۔

حضرت ابو طالبؑ اور جہاد بالنفس کی منزلیں

باپ سے کئے ہوئے عہد پر حضرت ابو طالب سختی سے قائم ہیں۔ وہ عہد جو بظاہر انھوں نے حضرت مطلب سے کیا تھا لیکن اس عہد کا گواہ خود ابو طالب کا پروردگار ہے اور زمانے کے رسولؐ خود اس کے شاہد۔ رات کی تاریکی پھیلی اور لوگ اپنے اپنے بستروں پر محوِ خواب ہیں، مگر ابو طالب کی آنکھوں میں بجائے خواب کے ایک احساس ذمہ داری، فرض کی ادائیگی اور بھتیجے کی حفاظت کی فکرمندی نمایاں ہے۔ اٹھ کر ٹہلتے اور پھر بھتیجے کے قریب آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کچھ سوچ کر اپنے ایک بیٹے کے بستر پر جاتے اور اس سوتے ہوئے بیٹے کو لاکر آنحضرتؐ کے بستر پر سلا دیتے ہیں اور آنحضرتؐ کو اپنے بیٹے کے بستر پر سلا دیتے ہیں۔ تاکہ اگر کوئی دشمن حضورؐ کو گزند پہونچانے کی غرض سے گھر میں داخل ہو تو وہ آنحضرتؐ کو گزند پہونچانے کے بجائے ابو طالب کے کسی بیٹے کو دھوکہ میں نقصان پہونچا دے۔ کیا تاریخ کسی ایسے چچا کی مثال پیش کر سکتی ہے جو بھتیجے کی جگہ اپنی اولاد کو اس طرح خندہ پیشانی سے قربان کرنے کے لئے متواتر اور مسلسل سعی و کوشش کرتا رہا ہو۔ کیا یہ نصرت پیغمبرؐ کا وہ عہد نہیں جو قرآن میں میثاقِ انبیاء کے نام سے مشہور

ہے ؟ حضرت ابوطالب کوئی نبی یا رسول نہیں ہیں لیکن میثاق و عہدِ انبیاء و مرسلین کو عملاً پورا کر رہے ہیں۔ کیا کہنا حضرت ابوطالب کے ایمان و معرفت، ایقان و عمل، اُلفت و محبّت، پیغمبرؐ کے ساتھ جذبۂ فدا کاری و جاں نثاری کا حضرت ابوطالب صرف اپنے پدرِ گرامی کی وصیّت پر ہی عمل پیرا نہیں ہیں بلکہ دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحاؑ کے محافظ و پاسبان ہیں۔ وہ صرف آنحضرتؐ ہی کے محافظ نہیں بلکہ پروردگار کے آخری پیغام اسلام اور آخری پیغامبرؐ کے محافظ ہیں اور قرآن کے محسنین بندوں کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔

شب و روز یونہی گزرتے گئے، یہاں تک کہ آپؐ کی عمر مبارک تقریباً دس سال کی ہوگئی۔ ابنِ عساکر کی روایت کے تحت مکّہ میں سخت قحط پڑا۔ تالاب و کنوئیں خشک ہوگئے تھے۔ لوگ بھوک و افلاس میں مبتلا تھے کسی بزرگ نے لوگوں کو مشورہ دیا، چلو وارثِ خلیلؑ و ذبیحؑ کے پاس وہ ہماری مشکلیں آسان کردے گا۔ لوگ حضرت ابوطالب کے دروازے پر جمع ہوئے۔ ایک باوقار، پُرکشش شخصیّت گھر سے برآمد ہوئی، لوگوں کی فریاد سُنی۔ ایک بچّے کو ساتھ لیا، خانۂ کعبہ کے قریب آئے، بچّے کی پشت کو دیوارِ کعبہ سے ملایا۔ اُس بچّے نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کئے۔ ہاتھ کا بلند ہونا تھا کہ ابر گھر کے آئے اور پانی ٹوٹ کر برسنے لگا لگا، وادی اور نالے، تالاب اور کنوئیں بھر گئے اور سبزہ عام ہوگیا۔ اور ابوطالب کے دیوان میں ایک اور قصیدے کا اضافہ ہوگیا اور حضرت ابوطالب نے پہلے نعت گو شاعر کی فضیلت کو اپنے لئے مخصوص کرلیا۔

حضرت ابوطالب، تجارتی سفر پر شام گئے۔ آنحضرتؐ بھی چچا کے ہمراہ ہیں۔ قافلہ ایک جگہ رُکا۔ صومعہ سے ایک راہب "بحیرہ" باہر آیا، قافلے کو دعوتِ طعام دی۔ لوگ گئے اور آنحضرتؐ کو حضرت ابوطالب نے مصلحتاً سامان کی حفاظت کے لئے باہر ہی رہنے دیا۔ راہب نے اہلِ قافلہ کو بغور دیکھا مگر اس کی ایمانی تشنگی دُور نہیں ہوئی۔ اُس نے آنحضرتؐ کو بھی صومعہ میں داخل ہونے کی تمنّا کی۔ حضرت ابوطالب، سرکارِ رسالتؐ کو لیکر صومعہ میں داخل ہوئے۔

بحیراؔ نے کتاب مقدس کے آئینے میں رسالت و نبوت کے حسن و جمال کا عملاً دلکش و دلربا ضیائے نورانیت کو دیکھا۔ اُسے صحیفہ ہائے سماوی کے الفاظ کی تشریح پیکرِ بشری میں مجسّم دکھائی دی۔ کھانے کے بعد اہلِ قافلہ، صومعہ سے باہر نکلے۔ بحیرا نے حضرت ابوطالب کو روک لیا۔ پوچھا اس بچے سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ حضرت ابوطالب نے امتحاناً اور مصلحتاً کہا، میرا لڑکا ہے۔ بحیرا تقریباً چیخ اٹھا، ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کے باپ کو زندہ نہ ہونا چاہیئے۔ حضرت ابوطالب نے فرمایا، ہاں یہ میرا بھتیجہ ہے۔ پوچھا باپ کہاں ہے؟ ابوطالب نے فرمایا، ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ بحیرا نے کہا سچ ہے۔ اس کے بعد رازدارانہ اور ہمدردانہ طور پر مشورہ دیا کہ آپ اس بچّہ کو لے کر فوراً واپس چلے جائیں اور اسے یہودیوں سے پوشیدہ رکھیں۔ خدا کی قسم اگر انھوں نے پہچان لیا تو اذیت دیں گے اور قتل کر دیں گے۔ بخدا یہ بچّہ ایک عظیم انسان ہے۔

حضرت ابوطالب کے لئے بحیراء راہب کی پیشین گوئی کوئی نئی بات نہ تھی۔ آپ نے اپنے بزرگوں سے اس بچّے کی عظمت، نبوّت اور رسالت کے بارے میں ہزاروں بار سُنا ہے اور انھیں اپنے والد ماجد حضرت عبدالمطّلب کی وصیّت کے الفاظ حرف بہ حرف یاد ہیں اور ابوطالب اپنے عہد (نصرتِ پیغمبرؐ) پر مستحکم طور پر قائم ہیں۔ راہب سے یہودیوں کے شر کو سن کر ابوطالب متفکّر ہوئے اور اپنے سامان کو اونے پونے بیچ کر اسی منزل سے واپس مکّہ لوٹ گئے۔ مکّہ پہونچکر ابوطالب نے اس واقعہ کو قلبِ تاریخ پر ایک نعتیہ قصیدے کی شکل میں اس طرح رقم کر دیا۔ "آمنہ کا لال محمّدؐ نبی ہے۔ میں اسے اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ جب اس نے میری سواری کی لگام تھام لی تو میں نے باوجود اہتمام نہ ہونے کے اُسے ہمراہ لے لیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے اپنی قرابت کا بھی لحاظ رکھا اور باپ کی وصیّت کا بھی۔ اسے اپنے اس قافلہ کے ہمراہ لے کر نکلا جس میں سرفروش، ہمدرد اور بہادر شامل ہیں جن کا ارادہ مصمّم اور عزم محکم ہے۔ اور جب مقام بصریٰ تک پہونچا ایک عالم یعنی

بحیرا راہب نے ملاقات کی اور یہی خبر سنائی اور حاسدوں کی روک تھام کا مشورہ دیا" حضرت ابوطالب کا یہ مشہور زمانہ قصیدہ ہے جو انھوں نے سفرِ شام کے بعد کہا جس کا مختصراً ہیں نے اوپر ذکر کیا۔ ابوطالب جیسے تجارت پیشہ شخص پر حفاظت و نصرتِ پیغمبرؐ کی وجہ سے اب وقت نہیں کہ وہ تجارت میں اپنا انہماک باقی رکھ سکیں اور نصرت و حفاظتِ پیغمبرؐ سے لمحہ بھر بھی غافل ہو سکیں۔ دن اور رات تحفّظِ پیغمبرؐ کی فکر ہے اور ابوطالبؑ کی تجارت موقوف ہو گئی۔ عسرت و تنگدستی نے دروازے پر دستک دینا شروع کر دیا۔ حسّاس دل اور روشن ضمیر بھتیجے نے چچا کی عسرت و فکرمندی کو محسوس کرتے ہوئے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مال تجارت کے ہمراہ جانے کی اجازت طلب کی۔ جناب خدیجہ نے حفاظت و نصرتِ پیغمبرؐ کا یقین دلایا اور حضورؐ پرنور، حضرت خدیجہ کے مالِ تجارت کو لے کر پھر روانہ ہو گئے۔ وہ رسولؐ جو کسی خشک کنوئیں میں لعابِ دہن ڈال دیں تو اس میں سرد و شیریں پانی اُبل پڑے۔ اگر کسی خشک درخت کے نیچے بیٹھ جائیں تو وہ سرسبز و شاداب درخت میں تبدیل ہو جائے۔ کسی دسترخوان پر بیٹھ جائیں تو وہ کھانے کی مقدار باوجود کم ہونے کے تمام شرکاء کے لئے کافی ہی نہیں بلکہ بچ بھی جائے۔ تو اب یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس تجارت میں فائدہ نہ ہوتا جس تجارت میں عالمینؐ کی رحمت شریک ہو۔ تجارت میں حضرت خدیجہ کی توقعات سے بھی زیادہ فائدہ ہوا۔ میسرہ نے سفر سے واپس آکر سفر میں حضورِؐ اکرم کی کرامات اور آپؐ کے بصیرت افروز واقعات کا جناب خدیجہ سے ذکر کیا، ویسے ہی جناب خدیجہ منتظر تھیں اور یقین کامل تھا کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ ان واقعات کو سن کر اور بھی ان کے ایمان و ایقان میں اضافہ ہوا۔ اور انھوں نے آپؐ کی رفاقت کو پسند فرمایا۔ ایک کنیز کے ذریعہ حضرت ابوطالب سے اپنا مدّعا کہلوا بھیجا۔ حضرت ابوطالب نے آنحضرت کی مرضی معلوم کی اور پھر تاریخ نکاح کا تعین ہو گیا۔

خطبۂ نکاح اور حضرت ابوطالبؑ

محفل عقد کا اہتمام ہوا، عمائدینِ قریش جمع ہوئے۔ اس محفلِ سعید میں تمام اہلِ قریش و ساکنانِ مکہ مدعو

تھے۔ حضرت ابوطالب نے دیکھا اس سے بہتر موقع اور کب حاصل ہوگا کہ خوابِ براہیمی اور نویدِ مسیحا کا تعارف ہو۔ ایک مصلحانہ وجاہت، عزمِ محکم، ایمان و یقین اور فخر انبساط کے جذبے کے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور حمد و ثنائے الٰہی سے اس طرح اپنے خطبے کا آغاز کیا۔

ترجمہ:۔ حمد و ثنا کے لائق ہے وہ ذات (پروردگار) جس نے ہمیں نسلِ ابراہیم اور ذرّیتِ پاک معدّ و مضرّ میں پیدا کیا۔ ہمیں اپنے گھر (بیت اللہ) کا نگہبان اور اس بیتِ حرم کا محافظ بنایا۔ قابلِ حج و زیارت گھر کا پڑوسی اور محفوظ و مامون وطن بخشا۔ ہمیں لوگوں کا حاکم بنایا۔ میرے بھائی کا فرزند (محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) وہ ہے کہ قریش کا کوئی فرد بھی اگر اسکے مدّمقابل آئے گا تو سبک سر اور کم مرتبہ رہے گا۔ اس کے پاس گو دولت کی فراوانی نہیں اور مال کی حقیقت ایک ڈھلتے ہوئے سائے اور گرتے ہوئے درخت کے پتّے کے علاوہ اور کیا ہے۔ یہ فرزند تو ایک عظیم المرتبت انسان ہے جس کے متعلّق پیشین گوئیوں کے انبار کے انبار ہیں"

اس کے بعد حضرت ابوطالب نے خود مہر ادا کیا اور اہلِ قریش و مکّہ کی دعوتیں کیں۔

تبصرہ کیا کہنا حضرت ابوطالب کے ایمان و بصیرت پیغمبر اور معرفتِ دینی کا کہ ابھی نزولِ قرآن میں تقریباً پندرہ[۱۵] سال باقی ہیں اور ابوطالب اپنے خطبہ کا آغاز سورۂ حمد کی پہلی آیت سے کر رہے ہیں۔ آخر کیا فرق ہے ابوطالب کے اس جملہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ" اور قرآن کے اس آیت "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" آخر کیا فرق ہے قرآن مجید کی اس آیت "مَنْ دَخَلَہٗ کَانَ آمِنًا" اور ابوطالب کے اس جملہ "محفوظ و مامون وطن" آخر ابوطالب کے اس جملہ "میرے بھتیجے کو سربلند پائے گا" اور قرآن کی اس آیت "اِنَّ عَرَفْنَالَکَ ذِکْرَکَ"

لیکن اسلام پر اس سے بڑا ظلم اور سرکارِ دو عالم کے آبا و اجداد کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایسے محسنِ اسلام اور محسنِ رسول ہستید کو معاذ اللہ غیر مسلم کہا اور لکھا جا رہا ہے۔ بہر طور ابوطالب نے اپنے حالات، ایمان و جذبات، اُخوت و محبّت پیغمبر کو مورّخین کی منوابدید اور بادشاہانِ دُنیا کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دیا تھا کہ عہد مورخین کی تحریر و تصنیف اور انکی آراء

کی پرواہ ہو۔ ابوطالب نے اپنی سوانح حیات، اپنے جذبات و عمل، ایمان و یقین کی حقیقت خود اپنے قصیدوں میں محفوظ کر دیا جو آج بھی دیوان شیخ البطحاء کے نام سے دستیاب ہے۔

فرشتوں کا پہلا عمل جراحت ناکام ثابت ہوا اور دوبارہ آپریشن کرنا پڑا !!

روایت ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم ابھی کمسن ہی تھے اور آپ ان ایام میں حضرت بی بی حلیمہ کے یہاں قیام پذیر تھے " آنحضرت جب چار برس کے ہوئے تو دو فرشتوں نے آکر آنحضرت کا شکم چیر کر ایک سیاہ نقطہ نکالا کے اس کو پھینک دیا اور سونے کے ایک طشت میں رکھ کر برفاب سے شکم کو دھویا۔ (طبقات حصہ اول صفحہ ۱۷) ۔ بخاری و طبری کی روایت کے مطابق فرشتے نے کہا ! " اقراء باسم " (الخ) ۔ آپ نے فرمایا مجھ سے پڑھا نہیں جاتا اس لئے کہ میں جاہل (اُمی) ہوں۔ اس کے بعد فرشتے نے آپ کا سینہ کھولا اور دل کو باہر نکالا جس میں تھوڑی سی ضلالت باقی تھی پھر اسے لے جا کر آب کوثر سے پاک کیا اور دوبارہ اسے لگا دیا تو آپ روانی کے ساتھ پڑھنے لگے۔ یہ واقعہ فطرت و مزاج انبیاء کے ساتھ سنت الٰہی سے بھی کتنا مخالف ہے۔ اس سے تو آپ قارئین کتاب بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ اس واقعہ سے سوائے توہین رسول اکرم کے اور کوئی دوسرا مقصد وابستہ نہیں۔ تاریخ انبیاء و رسل میں ایسی ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ اُمت تو پڑھی لکھی عالم ہو اور ہادی و رہبر جاہل ہو۔ کیا اس واقعہ کو کسی حقیقت پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے کہ کسی شخص سے آپ خود اپنے الفاظ دہرانے کو کہیں اور وہ یہ کہے کہ میں جاہل ہوں۔ تو کیا جبرئیل نے پہلی وحی کے الفاظ پیغمبر اکرم کو تحریر میں دیئے تھے کہ پیغمبر کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ اس واقعہ کے ساتھ جب میں مسلم گھرانے کے واقعات کا انطباق کرتا ہوں تو میرے حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہیں ہوتی کہ جب ہمارے بچے پہلی مرتبہ مکتب

میں بٹھائے جاتے ہیں تو باوجود ان کی مادری زبان عربی نہ ہونے کے وہ معلّم کے الفاظ بلا کسی تردّد، ہچکچاہٹ کے اس قرآنی آیت کو رَوانی کے ساتھ دُہرا دیتے ہیں۔ مگر کیا کیا جائے اس جذبۂ دشمنیٔ پیغمبر کو کہ یہ واقعہ اس شخص کے لئے اِختراع کیا گیا جو طفل نہیں بلکہ چالیس سال کا ایک صحتّمند، فکر و شعور کا حامل اور اسی عرب معاشرے کا پروَردہ اور جس کی نہ یہ کہ مادری زبان بھی عربی ہے بلکہ فصاحت و بلاغت میں اَب تک تو عرب اس کی مثل پیدا نہ کرسکے اَور نہ ہی کوئی عرب عورت اَیسا بچّہ پیدا کرسکی اَور نہ تا بہ قیامت پیدا کرسکتی ہے۔

اب جب وحیِ الٰہی کا ذکر آگیا ہے تو وحی کے بارے میں خود اس کا اِرشاد ملاحظہ فرمائیں جو حضوؐرِ اکرم کے ساتھ برسوں غارِ حرا میں ساتھ رَہا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں کہ ”میں نے وَحی کے نور کو دیکھا اَور وَحی کے خوشبو کو سونگھا۔“ اَور قرآن یہ کہتا ہے کہ :۔ ”جبرئیل تیرے قلب پر نازل ہوا۔“ تو پھر اِدراکِ نور کے لئے پڑھنے اَور لکھنے کی ضرورت کو کیوں لازمی قرار دیا جارَہا ہے۔ نوری پیغام نوری بندے کی طرف موصول ہوا، جس نے اسے سمجھا اَور تبلیغ کی۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس داستان کی اِختراع کے لئے لفظ ”اُمّی“ کو عمداً غلط استعمال کیا گیا ہے تاکہ توہینِ رسُول کے جذبہ کو کسی حد تک آسودہ کیا جاسکے اَور اس لفظ ”اُمّی“ کا ترجمہ جاہل کیا گیا ہے اور کیا جارَہا ہے۔ ”اُمّی“ ”اُمّ القریٰ یعنی مکّہ کے رہنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ اور لفظ اُمّی کا اِطلاق اَیسے شخص پر ہوتا ہے جس نے کسی اُستاد یعنی اپنے جیسے بشر سے پڑھنا لکھنا نہ سیکھا ہو۔ اَور قرآن مجید میں تقریباً پانچ مقامات پر لفظ ”اُمّی“، پیغمبرِ اکرم کے لئے اِستعمال ہوا ہے اَور ان تمام مقامات پر سوائے ان دونوں معنی کے تیسرے معنی کو اختیار نہیں کیا جاسکتا، ورنہ آیات کے مفہوم میں پھر نقص نمایاں ہوتا ہے اور یہ فصاحتِ قرآن کے سراسر مخالف ہوگا۔ اِس لئے لفظ ”اُمّی“ کا یہی مطلب ہے کہ آپؐ درسگاہِ فطرت سے ہی زیورِ علم و حکمت سے آراستہ ہوکر تشریف لائے تھے۔

آپؐ کے اعلانِ نبوّت کے بعد حضرت ابوطالب کی ذمّہ داریوں میں اب مزید اِضافہ

ہو گیا۔ ابو طالب پہلے ہی پیغمبرِ اکرمؐ کی نصرت و حفاظت میں منہمک ہونے کی بناء پر اپنی تجارتی مصروفیتوں کو ترک کر بیٹھے تھے جس کی وجہ سے افلاس و عسرت نے دروازہ پر دستک دینا شروع کر دی ہے۔ لیکن اس مجاہد کے پائے استقامت میں کوئی لرزش نہیں۔ اب تنگدستی کی وجہ سے معاشی مشکلات میں بھی مبتلا ہیں۔ لیکن قریش و بنی اُمیہ کے مخالفانہ رویّے کے خلاف سینہ سپر ہیں اور چاہتے ہیں کہ پیغمبرِ اکرمؐ کا پیغام عام ہو جائے اور لوگ اپنا رویّہ ترک کر کے حضورؐ اکرم کے ارشاد کو سنیں اور اس پر عمل کریں۔ مگر قریش و بنی اُمیہ کا مخالفانہ رویّہ اب شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے پیغمبرِ اکرمؐ کی دشمنی میں جھلستے ہوئے دل و دماغ اور مفلوج فکر و عقل، ابو طالب جیسے سردارِ قوم سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن ابو طالب کی بصیرانہ فکر و عقل بغیر کسی جنگ و جدل کے پیغمبرِ اکرمؐ کے مشن کو جاری رکھنے پر آمادہ و مستعد ہے۔ مگر خزاں رسیدہ دل و دماغ بہار انسانیت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ آپؐ کی پُراثر تبلیغ نے پیروکاروں میں اضافہ کیا لوگ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ انسانیت اپنے بھٹکے ہوئے راستے پر دوبارہ گامزن ہوئی۔ بنی اُمیہ اور قریش، قتلِ پیغمبرؐ کی باتیں کرنے لگے کہ ایک دن آپؐ طویل ساعت تک کسی جگہ عبادت میں مصروف تھے۔ ادھر ابو طالب کو مختلف قسم کی تشویش و فکر نے آگھیرا۔ بنی ہاشم کو جمع کیا اور کہا! تم سب اپنی تلواریں لے کر خانۂ کعبہ کے گرد جمع ہو جاؤ۔ میں پیغمبرؐ کی تلاش میں جاتا ہوں اگر ان بدبختوں نے ان کے حق میں کوئی ناپاک جسارت کی ہے تو آج انھیں زندہ نہیں چھوڑنا"۔ لیکن ابو طالب ابھی کچھ دُور بھی نہ گئے تھے کہ پیغمبرِ اکرمؐ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ سرکارِ دوعالمؐ کو لے کر سیدھے خانۂ کعبہ کے پاس گئے جہاں قریش و بنی اُمیہ کے سربرآوردہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ابو طالب نے سردارانِ قریش کو مخاطب کر کے فرمایا! اگر آج محمدؐ زندہ نہ ملتے تو تمہیں معلوم ہے کہ میں آج تمہارا کیا حشر کرنے والا تھا؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ ابو طالب نے بنی ہاشم کے افراد کو حکم دیا کہ تم میرے ارادے کو ان پر ظاہر کر دو۔ سبھوں نے اپنی عباؤں میں سے چھپی ہوئی تلواریں باہر نکال لیں۔ پھر ابو طالب نے کہا۔ اگر محمدؐ نہ ملتے تو آج تم سب کے سب قتل کر دیئے جاتے

اِس لئے کہ محمدؐ کا خون تمام قریش سے زیادہ عظیم اور بھاری ہے۔

اِس قسم کا دوسرا واقعہ اُس وقت پیش آیا جب آپؐ نماز میں مشغول تھے۔ ابنِ زبعری نے غلاظت آپؐ پر لاکر اُس وقت ڈال دی جب آپ سجدے میں تھے۔ آپؐ کے قلب پر اس ذلّت اور ہتک آمیز سلوک نے بہت اثر کیا۔ آپؐ کا سوائے ابوطالب کے مونس و غمخوار اور محافظ و مددگار اور کون تھا۔ آپؐ مضطرب و پریشان روتے ہوئے اپنے غمگسار چچا کے پاس آئے۔ ابوطالب نے جو آپؐ کو اس حالت میں دیکھا، کانپ گئے۔ غصّہ سے چہرہ سرخ ہوگیا۔ پوچھا بیٹے یہ ذلیل حرکت کس نے کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا، ابنِ زبعری نے۔ بھتیجے کی اُلفت، ہاشمی عظمت و وقار نے ابوطالب کے خونِ شجاعت میں جوش پیدا کیا۔ بھتیجے کو آقا و مولا سمجھنے والا چچا اپنے سیّد و سردار بھتیجے کی توہین کا انتقام لینے اور مرتکبِ جرم کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے اپنی تلوار لے کر گھر سے بھتیجے کے ہمراہ چل پڑا۔ قریب پہونچ کر آپؐ نے ابنِ زبعری کی طرف اشارہ کیا لوگ بھاگنا چاہتے تھے کہ ابوطالب نے للکارا، خبردار اگر ایک بھی یہاں سے گیا تو سر سلامت نہ ہوگا۔ اُٹھے ہوئے قدم رُک گئے۔ ابوطالب نے ابنِ زبعری کے مُنھ پر تھپّڑ مارا جس سے اُس کی ناک زخمی ہوگئی اور غلاظت منگوا کر وہاں پر موجود لوگوں کے چہروں پر مَل دی۔ اس کے بعد آپؐ کی طرف دیکھ کر فرمایا! بیٹے تم اس سے خوش اور راضی ہو؟ آپؐ مُسکرا دیئے۔ تو ابوطالب نے قوم سے کہا کہ آج تو میں اسی حد تک رُک گیا ہوں اگر آئندہ تم لوگوں نے ایسی حرکت کی تو مکّہ کی وادیاں خون سے رنگین ہوجائیں گی۔

قارئین غور فرمائیں کہ اگر اس وقت قریش و بنی اُمیّہ میں جراٗت و جسارت ہوتی اور وہ ابوطالب جیسے سردارِ قوم سے ٹکرا جاتے اور جنگ شروع ہوجاتی اور اس جنگ میں اگر ابوطالب قتل ہوجاتے تو آج اسلام میں حضرت ابوطالب کا موقف کیا ہوتا؟

اس واقعہ کے بعد ابوطالب نے اپنے جذبات و عقیدے کا اس طرح اظہار فرمایا:۔

(ترجمہ) محمّدؐ تم نبی ہو، روشن پیشانی والے بزرگ اور سردار ہو۔ تمہارے بزرگ بھی

طیّب وطاہر تھے۔ عرفات، مشعر، اور منٰی کے درمیان کی بستیاں اس وقت تک مطمئن ہیں جب تک مجھ جیسا بہادر اور زور آور زندہ ہے۔ اب مکّہ کی وادیوں میں سیاہ گھاس نظر نہ آئیگی۔ اور تمہارے خاندان والے شیر بیشۂ شجاعت ہیں۔ میں نے تم کو بہت زیادہ صادق القول پایا ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ بچپنے سے ہی تمہیں سچا پایا ہے۔" (دیوانِ ابی طالب)۔

قارئین غور فرمائیں کہ کلمۂ شہادت "اشہد ان محمّد رسول اللّٰہ" اور ابو طالب کے اس مصرعہ "انت النّبی محمّد" میں کیا فرق ہے۔ کیا اس سے بہتر طور پر بھی عقیدۂ نبوتِ محمدی کا اعلان اس دَور میں ممکن تھا؟ حقیقتِ امر تو یہی ہے کہ حضرت ابو طالب ایمان باللّٰہ کے ساتھ رسُول کی رسالت و نبوّت کے بھی قائل اور معترف تھے۔ لیکن کیا کیا جائے بنی ہاشم کی مخالفت اور پیغمبرؐ اکرم کی دشمنی میں گرفتار اذہان و طبائع اور پست ترین اغراض و مقاصد کے حامل افراد کا کہ جن کے قلب سیاہ اور ضمیر اس حد تک مُردہ ہو چکے تھے انھوں نے سرکارِ دو عالم کے اس شفیق، جاں نثار، وفا شعار، خدمتگار و محافظ اور وفادار چچا کے دامنِ کردار کو بھی داغدار بنانے کی ناپاک لیکن ناکام کوششیں کیں حضرت ابو طالب، حضرت علیؑ سے فرماتے ہیں کہ "اے علیؑ، محمّد کی اتّباع کرو اس میں اطمینان و سکون ہے لہٰذا ان کے ساتھ رہو۔"

جب کفّارِ قریش و بنی امیّہ کی مخالفت و عداوت شدّت اختیار کرنے لگی تو ابو طالب نے بھی اپنی حمایت و نصرتِ پیغمبرؐ کے اعلان میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے دی، آپ فرماتے ہیں کہ "خدا کی قسم جب تک میں زندہ ہوں کوئی تمہیں گزند نہیں پہنچا سکتا۔ تم نہایت ہی اطمینان کے ساتھ اپنے امر کا اظہار اور اعلان کرو۔ تمہاری دعوت صادق، تم خود ناصح کامل اور امین و معتمد ہو۔ میں بخوبی جانتا ہوں محمّد کا دین تمام ادیان سے بہتر ہے۔"

اور پھر ابو طالب نے اپنے عہدِ وفا اور نصرت کا اس طرح پیغمبرؐ اکرم کو یقین دلاتے ہیں۔ "آپؐ اپنی تبلیغ میں نہ کسی بات کا خیال کریں اور نہ کسی ہاتھ کا۔ میں آپؐ کے ساتھ ہوں، فائدہ ہو تو آپؐ کا اور قربانی کی ضرورت ہو تو میری جان حاضر ہے۔" اس کے علاوہ جب

حضرت ابوطالب کو اس بات کا علم ہوا کہ کفارِ قریش و بنی اُمیہ نے آنحضرتؐ سے معاشرتی مقاطعہ کا عہد کیا ہے۔ اور اس پر تمام قبیلے متحد ہو گئے ہیں تو آپ نے فرمایا۔ " ارے میرا پیغام لُوی اور بالخصوص بنی کعب تک پہونچا دو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ محمدؐ بھی موسیٰ کی طرح نبی ہیں اور ان کا ذکر سابقہ کتب میں موجود ہے۔ ان کی محبت لوگوں کے دلوں میں ہے اور یہ اللہ کا عطیہ ہے اس میں کیا جائے دَم زدن ہے۔ یہ جو تم نے معاہدہ لکھا ہے یہ ایک دن سخت مصیبت بن جائے گا۔ ہوش میں آؤ ہوش میں، ایسا نہ ہو کہ گناہگاروں کے ساتھ بے گناہ بھی پس جائیں۔ ان گمراہوں کے پھندوں میں نہ آؤ اور اپنی محبت و قرابتداری کو قطع نہ کرو۔ دیکھو مسلسل جنگ کا انتظام نہ کرو اس لئے کہ جنگ کا مزہ انتہائی تلخ ہوتا ہے۔ خدا کے گھر کی قسم ہم محمدؐ کو زمانہ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے۔ ابھی تو نہ گردنیں کٹی ہیں اور نہ چمکتی تلواروں کے چلانے والے ہاتھ اُٹھے ہیں۔ ابھی نہ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور بجّوؤں نے مقتولین کی لاشوں پر اجتماع کیا ہے نہ ایسا معرکہ جس میں گھوڑوں کی دَوڑ ہو اور بہادروں کا شور و غوغا ہو۔ کیا ہمارے بزرگ ہاشم نے اس کی تائید نہیں کی ہے اور کیا انھوں نے اپنی اولاد کو حرب و ضرب کی وصیت نہیں کی ہے۔ یاد رکھو ہم نہ تو جنگ کرنے سے خستہ ہوتے ہیں اور نہ زمانہ کی مشکلات کی شکایت کرتے ہیں۔ ہماری فکر اس وقت بھی کام کرتی ہے۔ جب پہلوانوں کے ہوش اُڑے ہوتے ہیں۔"

اور جب حضرت ابوطالب کو یہ علم ہوا کہ قریش و بنی اُمیہ، آنحضرتؐ کو قتل کر دینے کی سازش کر رہے ہیں، تو فرمایا۔ "کیا تمہیں خبر نہیں کہ یہ مقاطعہ غیر عاقلانہ اور ایک اچھی خاصی مصیبت ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ کل سیدھا راستہ معلوم ہو جائے گا۔ اور یہ کہ دُنیا کو بقاء نہیں ہے۔ دیکھو محمدؐ کے بارے میں بیوقوفی نہ کرو اور ان منحوس گمراہوں کا ساتھ چھوڑ دو۔ تمہاری یہ تمنا کہ محمدؐ کو قتل کر دو، ایک خوابیدہ انسان کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ خدا کی قسم محمدؐ اس وقت تک قتل نہیں ہو سکتے، جب تک کہ سر اُڑتے ہوئے نظر نہ آجائیں۔ تمہارا خیال ہے کہ ہم بغیر کسی جنگ و جدل کے محمدؐ کو تمہارے حوالے کر دیں گے یہ سراسر غلط ہے۔

محمدؐ حق پرست، صادق القول اور بنی ہاشم کا نجیب الطرفین انسان ہے، یہ امین ہے، محبوب خلق ہے، اور اللہ کی طرف سے مہر نبوت کا حامل ہے، یہ وہ باہیبت انسان ہے، جس کی صداقتوں کے براہین واضح ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جاہل و عالم برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ وہی نبی ہے جس کے پاس وحی آتی ہے۔ آج جو اس کا انکار کرے گا اسے ندامت کا منہ دیکھنا پڑیگا۔
اور آپ اپنے دوسرے قصیدے میں اس طرح فرماتے ہیں۔ قریش اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ شمشیر و سناں درمیاں میں حائل نہ ہو جائیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہم محمدؐ کو ان کے حوالے کر دیں، حالانکہ ابھی نیزے خون سے رنگین نہیں ہوئے ہیں۔ خدا کے گھر کی قسم! یہ خیال ہی غلط ہے۔ جب تک کہ سر شگافتہ نہ ہو جائیں۔ اور قرابت کا خیال ختم نہ ہو جائے اور عورتوں اور شوہروں میں جدائی نہ ہو جائے اس وقت تک ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ سب کیوں ہو گا، ان کی عداوتوں، نافرمانیوں اور مکاریوں کی بنا پر اس لئے کہ صاحب ہدایت، رسول خدا جیسے انسان پر ظلم کیا گیا ہے۔ یاد رکھو ہم محمدؐ کو تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ بھلا کوئی قوم ایسے انسان کو بھی موت کے منہ میں دے سکتی ہے "

قارئین کرام غور فرمائیں کہ ابو طالب کے تمام الفاظ ان کے ایمان کامل اور معرفت رسول سے نورانی دل و دماغ کی عکاسی کر رہے ہیں۔ ابو طالب قسم بھی کھاتے ہیں تو خدا کی یا خدا کے گھر کی اور حفاظت و نصرت پیغمبرؐ میں صرف اپنی ہی جان نہیں بلکہ اپنے قبیلے بنی ہاشم کو قربان کر دینے کو تیار بیٹھے ہیں۔ حضرت ابو طالب کا خدمت پیغمبرؐ میں یہ انہماک، نصرت و وفا اور جذبۂ جہاد و قربانی سے سرشار دل و دماغ اور درجۂ شہادت پر فائز ہونے کی تمنائیں، پروردگار عالم کو اس حد تک پسند آئیں کہ شہادت عظمیٰ کا درجہ حضرت ابو طالب کی اولاد کا مقدر بنا دیا اور یہ سعادت عظمیٰ حضرت ابو طالب کے گھرانے کے لئے مخصوص ہو گئی۔ حضرت ابو طالب نصرت پیغمبر اکرمؐ میں قربان ہو کر درجۂ شہادت پر اس لئے فائز نہ ہو سکے کہ ان کی حیات میں پیغمبر اکرم کو اذن جہاد حاصل نہ تھا۔ لیکن امام عالی مقام حضرت امام حسینؑ جو بفرمان رب العزت اور بنص قرآنی کی رو سے آنحضرت

یعنی نبوّت و رسالت کے بیٹے قرار دیئے گئے۔ اور آنحضرت کے ارشاد کے بموجب "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔ سرکارِ دو عالم نے یہ بھی فرمایا کہ "یہ میرے دونوں بیٹے اہلِ جنّت کے سردار ہیں۔ ان کی صلح میری صلح ہے، اور ان کی جنگ میری جنگ ہے"۔ تو ان اقوالِ مقدّسہ اور معتبرہ کی روشنی میں نصرتِ حسینؑ، نصرتِ پیغمبرؐ ہی قرار پائی اور کربلا میں شہادتِ عظمیٰ کے وقت حضرت ابوطالب موجود نہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ حضرت ابوطالب کا جذبۂ جہاد و فدا کاری اور اور تمنّائے قربانی کا حق ان کی اولاد نے کس طرح سے ادا کیا تو آیئے عالمِ اہلسنّت مولانا عبدالرّب صاحب نے جو شہدائے کربلا کی فہرست دی ہے ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت ابوطالب کی اولاد احیاءِ بقائے دین اور سرافرازی و سربلندیٔ اسلام کی خاطر کس طرح قربان ہوئی۔

(۱) حضرت مسلم ابنِ عقیل ابنِ ابی طالب۔

(۲) " محمّد ابنِ مسلم ابنِ عقیل ابنِ ابی طالب۔

(۳) " ابراہیم ابنِ مسلم ابنِ عقیل ابنِ ابی طالب۔

(۴) " عبداللہ ابنِ عقیل ابنِ ابی طالب۔

(۵) " عبدالرّحمٰن ابنِ عقیل ابنِ ابی طالب۔

(۶) " محمّد ابنِ سعد ابنِ عقیل ابنِ ابی طالب۔

(۷) " عبداللہ ابنِ مسلم ابنِ عقیل ابنِ ابی طالب۔

(۸) " محمّد ابنِ عبداللہ ابنِ جعفر ابنِ ابی طالب۔

(۹) " عون ابنِ عبداللہ ابنِ جعفر ابنِ ابی طالب۔

(۱۰) " ابوبکر ابنِ حسنؑ ابنِ علیؑ ابنِ ابی طالب۔

(۱۱) " عمر ابنِ حسنؑ ابنِ علیؑ ابنِ ابی طالب۔

(۱۲) " عبداللہ ابنِ حسنؑ ابنِ علی ابنِ ابی طالب۔

(۱۳) " قاسم ابنِ حسنؑ ابنِ علیؑ ابنِ ابی طالب۔

(۱۴) حضرت محمدؑ ابنِ علیؑ ابنِ اَبی طالب۔

(۱۵) 〃 عثمان ابنِ علیؑ ابنِ اَبی طالب۔

(۱۶) 〃 عبداللہ ابنِ علیؑ ابنِ اَبی طالب۔

(۱۷) 〃 جعفر ابنِ علیؑ ابنِ اَبی طالب۔

(۱۸) 〃 عباسؑ ابنِ علیؑ ابنِ طالب۔

(۱۹) 〃 علی ابنِ حسینؑ ابنِ علیؑ ابنِ اَبی طالب۔

(۲۰) 〃 علی (یعنی علیؑ اصغر) ابنِ حسینؑ ابنِ علیؑ ابنِ اَبی طالب۔

(۲۱) 〃 امام حسینؑ ابنِ علیؑ ابنِ اَبی طالب۔

(کتاب مرج البحرین از مولانا عبد رب صاحب صفحہ ۸۰۔)

قارئین کرام غور فرمائیں کہ اس جہادِ اسلامی میں سوائے اولادِ اَبی طالب کے کسی اَور کی اَولاد نے امام عالی مقام کے قدموں پر اس طرح سے جان نثار نہیں کیا اَور تو اَور خود بنی ہاشم میں سوائے آلِ ابی طالب کے کسی کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ اس سے قبل جنگ موتہ میں حضرت جعفر ابنِ اَبی طالب نے جامِ شہادت نوش فرمایا اور ۴۰ھ ہجری میں خود حضرت علیؑ نے مسجدِ کوفہ میں شہادت پائی۔ وہ ابو طالب کہ جس کی اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ نصرت و تحفظ، جذبۂ صادق پر خود سرکارِ دو عالم کو اعتماد اور ناز تھا اور جس کی اَولاد دینِ اسلام کے تحفظ، سربلندی و سرافرازی کے لئے قربان ہوتی رہی۔ اُسے اب کافر ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں۔ ابو طالب سے دشمنی صرف اس وجہ سے کی جا رہی ہے کہ اگر ابو طالب نصرتِ پیغمبر پر کمربستہ نہ ہوتے تو ان خارجیوں کے بزرگوں کو قتلِ پیغمبرؐ میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ اور اگر ابو طالب کے بیٹے حضرت علیؑ نے بدر و اُحد و خندق میں شرکت نہ کی ہوتی تو ان کے بزرگ رسولؐ کو قتل کر کے اسلام کا قصّہ ہی (معاذ اللہ) پاک کر دیتے۔ اب جبکہ اسلام سربلند و سرافراز ہو چکا ہے تو یہ اپنے بزرگوں کا بدلہ حضرت ابو طالب پر حرف گیری اور ان کی کردار کشی کر کے لے رہے ہیں۔

اور اس طرح یہ اپنے جذباتِ انتقام کو آسودہ کر رہے ہیں۔ جبکہ حضرت ابو طالب اپنی حیات میں پیغمبرِ اسلام کے ناصر و مددگار رہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ حضرت ابو طالب کی ذات وہ عظیم المرتبت ذات تھی جس نے اسلام کی سرپرستی اُس وقت کی جب اِسلام اپنی ابتدائی منزل پر تھا۔ ابو طالب کی ذات گرامی اور اُن کا دورہ وہ دور ہے جس میں ترقّی پذیر دین اور کامل ترین دین دونوں کا سنگھم ہے۔ اور ابو طالب ان دونوں طرح کے دین کے پاسبان اور محافظ تھے۔

شعبِ ابی طالب میں پیغمبرِ اکرمؐ اور بنی ہاشم کو صعوبتیں اور اذیّتیں اُٹھاتے ہوئے تین سال کی طویل مدّت گزر رہی ہے کہ ایسے میں سرکارِ دو عالم نے حضرت ابو طالب سے فرمایا کہ پروردگارِ عالم نے قریش کے معاہدے پر دیمک کو مسلّط کر دیا۔ جس نے معاہدے کے تمام الفاظ کا سوائے نامِ خدا کے صفایا کر دیا ہے۔ حضرت ابو طالب نے جب اس خبر کو سُنا تو جوشِ مسرّت سے ان کے چہرے پر سُرخی دَوڑنے لگی۔ اپنی تلوار حمائل کر کے خانۂ کعبہ کی سمت روانہ ہوئے جہاں عمائدین قریش بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے قریب پہونچ کر فرمایا' اِس معاہدے کو لاؤ۔ جب دستاویز سامنے آگئی تو اس مجاہدِ حق پرست نے نہایت ہی اطمینان و سکون اور یقین کامل کے ساتھ فرمایا۔" میں تمہارے درمیان انصاف کی خاطر آیا ہوں۔ میرے بھتیجے نے مجھے خبر دی ہے کہ اللہ نے تمہارے اس معاہدے پر دیمک کو مسلّط کر دیا ہے جس نے تمہارے اِس معاہدے سے تمام الفاظ کا صفایا کر دیا ہے اور اس میں اب سوائے پروردگار کے نام کے اور کچھ باقی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اس کا کلام صحیح ہے تو اب تم لوگوں کو ہوش میں آجانا چاہیئے۔ ورنہ جب تک ایک بھی ہاشمی زندہ ہے ہم محمدؐ کو تمہارے رحم وکرم کے حوالے نہیں کرینگے اور اگر اس کی اِطّلاع غلط ثابت ہو جائے تو وہ تمہارے حوالے ہے' چاہے زندہ رکھّو یا قتل کر دو" (تاریخ طبری جلد اوّل و ابو طالب مومنِ قریش ص۱۷۷ و تاریخ کامل جلد ۲ ص۳۳ اور تاریخ ائمہ ص۱۱۵) وغیرہ۔

معاہدہ کھولا گیا۔ اور حضرت ابوطالب کی اطّلاع حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ لیکن بُرا ہو قریش و بنی اُمیّہ کی سنگدلی و شقاوتِ قلبی، ناحق شناسی اور بنی ہاشم دشمنی کے جذبات کا کہ بجائے اس دلیل قطعی اور برہان واضح کو قبول کرنے کے عداوت و عناد کے ساتھ کہنے لگے کہ "یہ تمہارے بھتیجے کا جادو ہے"۔ حضرت ابوطالب کی اس اطّلاع اور قریش کے ذاتی مشاہدے کے بعد اہلِ قریش نے اس غیر منصفانہ معاہدے کو منسوخ کر دیا اور بنی ہاشم، شعبِ ابی طالب سے واپس اپنے گھروں میں دوبارہ سکونت پذیر ہوئے۔ تقریباً نصف صدی سے حضرت ابوطالب انتہائی ذمہ داری، خلوص و محبّت کے ساتھ پیغمبرِ اکرمؐ کی نُصرت و حفاظت پر مستعدی کے ساتھ کمربستہ چلے آرہے ہیں، لیکن اِس مُجاہدِ حق کے چہرے پر کسی قسم کا حُزن و مَلال اور تھکاوٹ کے آثار نہیں پائے جاتے۔ بلکہ جس قدر آلام و مصیبت میں زیادتی ہوئی، ثباتِ قدم اور عزمِ محکم میں اور بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کتنا یقین ہے ابوطالب کو اپنے بھتیجے کی صداقت پر کہ فرماتے ہیں کہ "اگر یہ خبر غلط ثابت ہو جائے تو ہم محمّدؐ کو تمہارے حوالے کر دیں گے"۔ حقیقت میں حضرت ہاشم کا گھرانہ وہ گھرانہ ہے کہ جس گھرانے کی تمنّا حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے شدّت سے کی تھی تاکہ اِس مسلم گھرانے (یعنی اُمّتِ مُسلمہ) میں ایک رسُول مبعوث ہو، اور اسی صاحبِ عزّ و شرف گھرانے کے افراد حضرت قصیؑ، عبدمناف، ہاشم، مطّلب، اسد، عبدالمطّلب، عبداللّٰہ، اور اُن کے بعد اس سلسلہ کی آخری فرد حضرت ابوطالب ہوئے۔

حضرت ابوطالب کے آخری ایّام

اَب وہ "شجرِ طیّبہ" جس کے سائے میں اِسلام اور رسُولِ اسلام کو آرام و سکون اور اطمینان حاصل تھا، اب رُو بخزاں ہے۔ حضرت ابوطالب اب حسرت و یاس سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں۔ والدِ گرامی حضرت عبدالمطّلب کے الفاظ اور وصیتیں یاد آرہی ہیں کہ "میرا یہ فرزند نبی ہے اور اس کی شخصیّت بہت عظیم ہے۔ ابوطالبؑ میں اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔

تم مجھ سے عہد کرو کہ تم اس کی اتباع و پیروی اور حفاظت و نصرت میں کوئی کوتاہی نہ کرو گے۔ جس صاحب نبوت فرزند کی حفاظت و نصرت کا ذمّہ دار حضرت عبدالمطّلب نے تنہا جناب ابوطالب کو قرار دیا تھا۔ اب ابوطالب اس حاصل ہدایت و نبوت، ذات کی نصرت و حفاظت کی ذمّہ داری کا بارِ گراں کس کے کاندھوں کے حوالے کریں۔ عمائدین قریش عیادت کے لئے گھر میں آئے ہوئے ہیں گو کہ ان کی خباثتِ نفس اور دشمنی پیغمبرِ اکرم سے حضرت ابوطالب واقف ہیں پھر بھی حجّت تمام کردینے کی خاطر سلسلۂ تخاطب اور اپنی وصیّت کو اس طرح شروع کیا "تم سب کا فریضہ ہے کہ خانہ کعبہ کی تعظیم کرو۔ اس میں اللہ کی خوشنودی، معاش میں وسعت اور ثباتِ قدم پوشیدہ ہے۔ صلہِ رحمی کرو اور قطعہِ تعلق نہ کرو۔ صلہِ رحمی سے عدد میں ترقّی اور حیات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ظلم و نافرمانی کو ترک کرو، اس سے قومیں ہلاک ہوچکی ہیں۔ سائل کا سوال رد نہ کرو، طالب کی طلب کو پورا کرو۔ اسی میں حیات و ممات کا شرف ہے۔ سچ بولو امانت ادا کرو۔ اسی میں محبّت کا انحصار اور عمومی کرامت ہے۔ دیکھو میں محمّدؐ کے ساتھ نیکی کی وصیّت کرتا ہوں۔ یہ قریش میں "امین" اور عرب میں "صدّیق" ہیں۔ ان کا پیغام ایسا ہے جسے قبول کرلیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خوف و اختلاف سے زبان پر نہ آسکا، خدا کی قسم، میں دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے فقراء، مساکین و ضعفاء اور بے مددگار ستم رسیدہ اس کے دین کو قبول کرکے اس کی عظمتوں کو بڑھا رہے ہیں۔ جس کے بعد قریش کے رؤساء اور زعماء پست ہو رہے ہیں۔ ان کے گھر برباد، ان کے بزرگ محتاج نظر آرہے ہیں۔ تمام عرب اس محمّدؐ کے دوست بنتے جارہے ہیں۔ اور ان کی قیادت کو تسلیم کرتے جارہے ہیں۔ اے قریش یہ تمہارے ہی خاندان کی ایک فرد ہیں۔ ان کا ساتھ دو اور ان کی حمایت کرو۔ خدا کی قسم، ان کا متّبع رشید اور ان کا تابع نیکبخت ہے۔ اگر اب بھی میری حیات میں اور اضافہ ہوجاتا تو میں ان کی طرف سے تمام مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرتا۔" (ابوطالب مومنِ قریش، از عبداللہ الخنیزی سعودیہ عربیہ ص ۱۸۶ بحوالہ السیرۃ النبویہ ص ۸۶ و ایمانِ ابوطالب جلد "۱" ص ۴۲ از صائم چشتی اہلِ سنّت والجماعت)۔

یہ رسولِ اکرم کے گھرانے کی وہ آخری فرد ہے جو باوجود حقیقی چچا ہونے کے حضورؐ کے عظمت و تقدّس اور مرضی و احترام ہیں نہ صرف یہ کہ شہرِ دِل سے ہمہ وقت خدمت میں حاضر ہے بلکہ اس عظیم المرتبت شخصیّت کے کردار و عمل کی پاکیزگی کے ساتھ اس کی پُر خلوص محبّت دیوانہ وار فریفتگی، نُصرت و حفاظت اور مُعاملہ فہمی، حُسنِ تدبّر کے خود سرکارِ دو عالم معترف و مدّاح تھے۔ قارئین کرام حضرت ابوطالب کی وصیّت کے ان الفاظ پر تھوڑی دیر کے لئے اِسلامی تعلیمات کی روشنی میں غور فرمائیں:۔

(۱) — صِلہ رحمی کی ہمّت اَفزائی اور قطع تعلّق کی ہمّت شکنی و مذمّت۔

(۲) — بَیت اللہ کی تعظیم و محافظت کی فرمائش۔

(۳) — بغاوت، سرکشی و نافرمانی کی ہمّت شکنی و مذمّت۔

(۴) — سائل کی اِحتیاج براری کی فرمائش۔

(۵) — اسے مایوس کرنے کی مذمّت۔

(۶) — صداقت و اَمانتداری کا حکم۔

(۷) — کِذب و خیانت کی مذمّت۔

(۸) — سرکارِ دو عالمؐ کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے کی تلقین اور آپؐ کی صفت اَمین و صدّیق کا برملا اِعلان و اِقرار۔

(۹) — سرکارِ رسالتمآبؐ کے اُمور کو قبول کرنے اور آپؐ کی اِطاعت و اِتّباع کی وصیّت۔

(۱۰) — خدا کی قسم کے ساتھ اپنی بصیرتِ قلب و نظر اور عقیدے کا اِس طرح اِعلان کہ۔
"میں دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے باشندے اور اطراف و اکناف کے لوگ دعوتِ اِسلام قبول کر رہے ہیں۔ اور رسولؐ کے کلمے کی صداقت پر ایمان لا کر اَمرِ توحید و رِسالت کو سرافراز و سربلند کر رہے ہیں۔

(۱۱) — اور میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ اُمرائے قریش ذلیل و پست اور اُن کے گھر ویران و

برباد ہو رہے ہیں۔ اور پھر آخر وصیّت میں یہ تمنّا کہ :۔

(۱۲) ـــــ اے کاش، میری موت میں کچھ تاخیر ہو جاتی اور مجھے مزید زندگی مل جاتی تو میں اُنکی طرف آنے والی ہر مصیبت و مشکل کا دفاع کر جاتا۔

کیا ان میں کا ایک لفظ بھی اسلامی تعلیمات کے منافی ہے ؟ اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ آگے چل کر یہی حضرت ابو طالب کی تمنّا اور وصیّت کے الفاظ اِسلام میں زرّیں اصول بن گئے۔ ایسا کہنا، کرنا اور اس پر عمل کرنے کا حکم دینا یہ صرف سرکارِ دو عالم کے ہی بزرگوں کو زیب دے گیا۔ کیا کسی کافر اور مشرک گھرانے کی فرد ایسا بھی کلام اور وصیّت کر سکتی ہے ؟ سوائے ہاشمی گھرانے کے کسی اور عرب گھرانے میں بھی کوئی فرد گزری ہے جسے کہ پیغمبرِ اکرم کی اس طرح سے معرفت و بصیرت اس وقت حاصل تھی ؟ یہ یقین و معرفت صرف حضرت اِبراہیم علیہ السّلام کے گھرانے کی دولت ہے جس سے سرکارِ دو عالم کے گھرانے کے بزرگ فیضیاب و سرافراز تھے۔

اہلِ قریش کے چلے جانے کے بعد حضرت ابو طالب نے بنی عبد المطّلب کو مخاطب فرماتے ہوئے وصیّت فرمائی۔ "عبد اللہ ابنِ ثعلبہ بن معیر العذری سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے حضرت عبد المطّلب کی اولاد کو بلایا اور کہا ! تم ہمیشہ اچھی حالت میں رہو گے جب تک کہ محمّد مصطفٰے کی بات سنتے رہو گے اور اُن کے احکام کی اِتّباع کرتے رہو گے۔ ان کی اِتّباع کرو۔ ان کی مدد کرو ہدایت پا جاؤ گے" (کتاب ایمانِ ابو طالب جلد ۲ صفحہ ۱۴۰ از حضرت صائم چشتی صاحب بہ حوالہ خصائص الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۲۱۵ از علّامہ جلال الدّین سیوطی رح) حضرت ابو طالب بنی ہاشم سے تخاطب جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "اے بنی ہاشم ! محمّد کی اطاعت اور اُنکی تصدیق کرو، اس میں فلاح بھی ہے اور عقل مندی بھی" اس کے بعد آپ نے حمایت و نصرت اور تحفّظِ پیغمبرِ اکرم کی ذمّہ داریوں کے بارِ گراں کو جسے وہ اب تک تنہا اٹھائے ہوئے تھے۔ بنی ہاشم کے چار افراد کے سپرد فرمائی۔ آپ حضرت حمزہ، حضرت علیؑ، حضرت جعفرؑ،

اور حضرت عباس کو مخاطب فرماتے ہوئے وصیّت فرماتے ہیں "میں پیغمبرِ خیر و برکت کی نُصرت کے لئے اپنے بیٹے علیؑ و جعفر اور شیر بیشۂ شجاعت حمزہ و عبّاس کو وصیّت کرتا ہوں، اِن لوگوں کا فرض ہے کہ ان کا دفاع کریں۔ میرے شیرو میں تم پر قربان، تم سب محمدؐ کے لئے ایک محکم سپر بن جاؤ۔ تمہارے ہاتھوں میں ایسی تلواریں ہوں جو تاریکیٔ شب میں مشعلِ راہ معلوم ہوں"۔ کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ محمدؐ کے پیغام کو فلاح و رُشد اور خیر و سعادت قرار دے کر دُنیا کو آپؐ کی اِتّباع و اطاعت کی دعوت دینے والا انسان خود ہی اس کا مخالف بھی ہو؟ خدا کی قسم یہ بات عقل کے خلاف ہے، انسان کسی کی بات کو دانشمندی، خیر و فلاح تسلیم بھی کرے اور پھر اس کا مُنکر بھی ہو۔ ہدایت کا اعلان بھی کرے اور پھر گمراہی پر باقی بھی رہے (معاذ اللہ، استغفر اللہ)"۔ کتاب ابوطالب مومنِ قریش صہ ۱۹۱۔

"کس کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں"

اِس کے بعد آپ بالخصوص حضرت علیؑ سے وصیّت فرماتے ہیں "اے بیٹے صبر کرو اس لئے کہ صبر ہی مناسب ہے اور ہر زندہ موت کی طرف جا رہا ہے اگرچہ سخت آزمائش کا وقت ہے۔ لیکن ہم نے تم کو شریف ابنِ شریف پر فدا کیا ہے اور اس شخص پر فدا کیا ہے جو صاحبِ عزّت اور صاحبِ حسب و نسب اور عالی ظرف ہے اور کشادہ صحن والا یعنی سخی ہے"۔ حضرت علیؑ کا تجدیدِ عہد "اے والدِ گرامی، کیا آپ مجھے احمدِ مجتبیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی مدد میں صبر کا حکم فرماتے ہیں۔ بخدا میں نے جو کیا ہے گھبراہٹ میں نہیں کیا ہے۔ البتّہ میری یہ خواہش ضرور رہی کہ آپ میری نصرت ملاحظہ فرمالیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں ہمیشہ سے آپکا فرمانبردار ہوں، میری کوشش احمدِ مجتبیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم جو کہ ہدایت کے پیغمبر اور بچپن و جوانی میں بھی قابلِ ستائش رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کیواسطے ہے"۔ (کتاب ایمانِ ابی طالب جلد دوم صہ ۱۳۸ از قلم حضرت صائم چشتی بحوالۂ دیوانِ حضرت علی علیہ السّلام)۔

حضرت صائم چشتی صاحب کشف الغمہ کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں "حضرت ابنِ عباس سے روایت ہے کہ جناب ابوطالب نے نبوت کے دسویں سال انتقال فرمایا اور اس وقت ان کی عمر ۸۵ سال تھی اور ان کے مرض الموت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا "چچا جان کہہ دیجئے یعنی کلمۂ شہادت پڑھیئے تاکہ آپ کی شفاعت کرنا میرے لئے جائز ہو جائے۔ پس جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ کے ہونٹ ہل رہے تھے تو جناب عباس نے آپ کے ہونٹوں پر کان لگا دیئے اور فرمایا کہ اے ابنِ اخی، خدا کی قسم، ابوطالب نے وہ کلمہ کہہ دیا ہے جس کا آپ نے انھیں ارشاد فرمایا ہے۔ یہ سن کر حضور پرنور نے ارشاد فرمایا۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ" چچا جان اللہ تبارک تعالیٰ آپ کو بھی ہدایت نصیب فرمائے۔" (کتاب ایمانِ ابی طالب جلد ۱ صفحہ ۳۸۳ بحوالہ کشف الغمہ صفحہ ۱۲ از امام عبدالوہاب شعرانی)۔

علامہ اُلغُذیزی تحریر فرماتے ہیں "بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ رسولؐ جو عدالت و انصاف اور وفاداری کے لئے نمونۂ عمل تھا کسی منعم کے کرم یا کسی محسن کے احسان کو فراموش کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ ابوطالب کے مرنے کا غم دل کی گہرائیوں سے گزر کر چہرے کے خطوط تک آ گیا۔ خیال یہ تھا کہ اب مصائب سے مقابلہ سخت اور تبلیغِ اسلام میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ حضرت علیؑ نے اپنے والدِ گرامی کے انتقال کی خبر دی اور ادھر آپؐ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنسوؤں کو روکا، دل کو سنبھالا اور ایک نحیف و غم انگیز لہجے میں حضرت علیؑ سے خطاب فرمایا "جاؤ باپ کو غسل و کفن دے کر دفن کرو۔" علیؑ گئے، تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے۔ اسلام کے ناصرِ اوّل کا جنازہ مسلمانوں کے کاندھوں پر اُٹھا۔ علیؑ نے دوڑ کر رسولِ اکرمؐ کو خبر پہونچائی اور حضورؐ جنازے کی مشایعت کو پہونچ گئے۔ آگے آگے جنازہ اور پیچھے پیچھے اسلام کا پیغمبرؐ، ناصرِ اسلام کا قصیدہ پڑھتا ہوا چلا "چچا آپ نے صلۂ رحم کیا، خدا آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے مجھے پالا، میری ذمہ داری

کی اور بڑا ہونے کے بعد میری نصرت کی اور میرا ہاتھ بٹایا" جنازہ آگے بڑھا اور قبر کے قریب پہونچا اور رسول اکرم کی زبان پر یہ کلمات جاری ہوئے" خدا کی قسم، میں استغفار کروں گا اور شفاعت بھی۔ چچا ایسی شفاعت جس سے جنّ و انس دونوں متحیّر ہو جائیں، چچا آخر کس طرح صبر کروں آپ نے بچپنے سے پالا، بڑا ہونے کے بعد شفقت و محبّت کا سلوک کیا میں تو آپکی آنکھوں کا نور اور آپ کے لئے روح رواں تھا" میں آپ کی آنکھوں کا نور تھا" کیا جس کی آنکھونکا نور رسول اکرم جیسا ہادی و مرشد ہو وہ بھی تاریکیوں میں رہ سکتا ہے؟ (کتاب ابو طالب مومن قریش صفحہ ۱۹۵ و صفحہ ۱۹۶ بحوالہ سیرۃ النّبویہ جلد ۱" صفحہ ۸۴ و شیخ الابطح صفحہ ۴۴ و معجم القبور جلد ۱" صفحہ ۲۰۴ و ایمانِ ابی طالب صفحہ ۱۰ و الاصابہ جلد ۷ صفحہ ۱۱۲) ۔حضرت علّامہ کاشفی رح تحریر فرماتے ہیں "آنحضرتؐ جناب ابو طالب کے جنازے کے ساتھ روتے ہوئے جا رہے تھے اور فرماتے تھے اے چچا آپ نے صلہ رحمی کے حق کو ادا کر دیا اور میرے حق میں کبھی کوئی خطا نہ کی، اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے ۔(معارج النّبوۃ جلد ۳ صفحہ ۱) ۔

مسالک الحنفاء میں علّامہ سیوطی تحریر فرماتے ہیں" انّ اٰباء النّبیّ لم یکن فیھم مشرک" یعنی آنحضرتؐ کے آباء و اجداد میں ایک شخص بھی مشرک نہ تھا" اور امام فخر الدّین رازی نے اپنی کتاب" اسرار التنزیل" میں لکھا ہے" انّ اٰباء الانبیاء ما کانوا کفارا" یعنی انبیاء کے آباء و اجداد کافر نہیں ہوتے" چنانچہ عالمِ اہلِ سُنّت حضرت صائم چشتی صاحب" سورۂ شعراء کی اِس آیت" وتقلّبک فی السّٰجدین" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ" ائمّۂ تفسیر نے لکھا ہے کہ نبی اکرم علیہ التحیّۃ والثّناء کا نور مقدّس ساجدین میں منتقل ہوتا رہا اور اس کی دلیل میں رسول پاک علیہ السّلام ہی کا یہ فرمان پیش کرتے ہیں کہ" ہمارا نور مبارک اصلاب و ارحام طیّبات و طاہرات میں منتقل ہوتا رہا ۔ چنانچہ عبارت ملاحظہ ہو ۔حضرت علی ابنِ ابیطالب کرم اللہ وجہ الکریم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا" ہماری ولادت مبارکہ نکاح سے ہوئی، سفّاح

سے نہیں ہوئی۔ حضرت آدمؑ سے لے کر ہمارے وَالد و وَالدہ تک کسی نے بھی جاہلیت کے سفاح میں سے کوئی چیز نہیں دیکھی۔" اور حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسُول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ "ہمارے اَجداد کرام میں سے کسی نے سفاح کو نہیں دیکھا، اللہ تبارک و تعالےٰ ہمیشہ ہمیں اصلابِ طیّبہ اور اَرحامِ طاہرہ میں صاف و شفّاف منتقل فرماتا رہا۔" حضرت عبداللہ ابن حارث ابنِ نوفل، حضرت عباس ابنِ عبدالمطّلب سے روایت کرتے ہیں کہ مَیں نے رسُول اللہ کی بارگاہ بیکس پناہ میں عرض کیا، یارسُول اللہ جب ہم اَہلِ قریش اِکٹھے ہوکر بیٹھتے ہیں تو ان کے حسب و نسب کا تذکرہ چلتا ہے تو مجھے کہتے ہیں کہ تمہاری مثل ایسے دَرخت کی ہے جو زمین میں کسی ٹیلے پر اُگ آیا ہو، فرمایا کہ جب رسُول اللہ نے اپنے شجرۂ مبارکہ کے متعلّق یہ الفاظ سُنے تو آپؐ نے غضبناک ہوکر فرمایا "بے شک اللہ تبارکِ تعالےٰ نے جب مخلوقات کو پیدا کیا تو میرے لئے بہترین مخلوق کا اِنتخاب فرمایا اور پھر جب اس بہترین مخلوق کو قبائل کی صورت دی گئی تو میرے لئے تمام قبیلوں میں سے بہترین قبیلہ منتخب کیا گیا۔ اور جب اللہ تعالےٰ نے جانوں کو پیدا کیا تو میرے لئے ان میں سب سے بہتر جان مقرّر فرمائی۔ اور جب اللہ تعالےٰ نے گھروں کو تخلیق فرمایا تو میرے لئے سب سے بہتر گھر چُنا گیا۔ اور مَیں ان سب میں اپنے آباء و اَجداد کے ذریعے سے بہتر ہوں۔" اور حضرت ابنِ عمر سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا۔ "اللہ تبارک تعالےٰ نے سات آسمان پیدا کئے تو مجھے اختیار فرمایا گیا کہ میں ان تمام آسمانوں میں سے جسے پسند کروں، اسے اپنا مسکن بنا سکتا ہوں، اور اللہ تبارک تعالیٰ نے سات زمینوں کو پیدا کیا تو مجھے اِختیار دیا گیا کہ جہاں چاہوں سکونت اِختیار کروں اور اللہ تبارک تعالیٰ نے بنی آدم کو خلق فرمایا تو مَیں نے بنی آدم سے عرب کو پسند کیا اور عرب میں "مضر" کو پسند کیا اور "مضر" میں سے قریش کو پسند فرمایا، اور قریش میں سے بنی ھاشم کو پسند کیا۔ پس مَیں بہترین سے بہترین لوگوں تک آیا ہوں۔" (کتاب ایمانِ اَبیطالب ص ۱۰۳ تا ۱۰۴، بہ حوالہ دلائل النّبوۃ، ص ۲۴ تا ۲۶) اور اسی مضمون و مَتن کی تصدیق

تفسیر قرطبی، ابنِ کثیر، تفسیر خازن، خصائصِ کبریٰ، مواہب لدنیہ اور صحیح بخاری سے بھی ہوتی ہے۔

قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا کہ آنحضرتؐ کے آباء و اجداد، اُمّہات و جدّات حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عبداللہؓ تک تمام کے تمام صاحبِ شرف و بزرگی اور عظمت و وقار کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ دین و دیانت اور پروردگارِ عالم کے مطیع و فرمانبردار بندے تھے، اور آپؐ کے گھرانے میں کبھی بھی کفر و شرک کی نجاست داخل نہ ہوسکی، آپؐ کا گھرانہ ہر دور میں مصلح اور قابلِ تقلید و اتّباع گھرانہ تھا۔ اس گھرانے کی عظمت و تقدس، سیادت و قیادت کے ساتھ مصلحانہ روش کو عربوں نے ہمیشہ تسلیم کیا اور جب بھی ان پر کوئی آفت آئی یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوئے تو اسی گھرانے کی بزرگوں سے نصرت و ہدایت کے طلبگار ہوئے۔ جیسا کہ تمام تاریخوں سے یہ ثابت ہے کہ اہلِ مکّہ قحط اور خشک سالی کی وجہ سے جب فقر و فاقہ میں مبتلا ہوئے تو آنحضرتؐ کے جدِّ اعلیٰ حضرت ہاشم نے دسترخوانِ عام بچھوا دیا تاکہ عرب بھوک و پیاس میں مبتلا ہوکر ہلاک نہ ہو جائیں اور انکی غربت و افلاس سے نجات کی یہ صورت نکالی کہ ان کے تجارتی قافلوں کو شام و یمن میں تجارت کی راہ دکھائی، جس کا پروردگارِ عالم نے قرآن میں سورۂ قریش میں مدح کے طور پر ذکر فرما کر اِس اَمر پر مُہر ثبت فرما دی کہ حضرت ہاشم مؤمن تھے ورنہ ان کا ذکر قرآن مجید میں پروردگارِ عالم مثبت حیثیت سے نہیں فرماتا۔ حضرت ہاشم کے بعد جب حضرت عبدالمطّلب سردارِ قریش و مکّہ ہوئے اور آپؐ نے اہلِ مکّہ کی اصلاح کے خاطر ضوابط بنائے جسے "ضوابطِ عبدالمطّلبی" کہا جاتا ہے اور اس میں زناء، شراب خوری، جوا، قتل، ظلم و ستم وغیرہ کی ہمّت شکنی کے ساتھ تعزیرات معیّن فرمائی تو پروردگارِ عالم نے بھی ان تعزیرات اور اصلاحات کو بجنسہ اسلام میں برقرار رکھا۔ اس کے علاوہ حضرت عبدالمطّلب کو "چاہِ زم زم" کو برآمد کرنے کے لئے خواب میں الہامی حکم ہوا، جس طرح حضرت ابراہیمؑ پر خواب کے ذریعے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربان کرنے کی ترغیب دی گئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کے عرب کے قبائل میں حضرت عبدالمطّلب

ابراہیم ثانی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اس کے علاوہ آپؑ کو اپنی مقبولیت دعا پر کتنا یقین اور پروردگارِ عالم کے حضور اپنی دعا کے رد نہ کئے جانے کا اِس حد تک یقین تھا کہ جب ابرہہ نے خانۂ کعبہ پر حملہ کیا اور قریش و بنی اُمیہ مکّہ سے فرار کر گئے، اور صرف حضرت عبد المطّلب اپنے اہل و عیال کے ساتھ تنہا مکّہ میں رہ گئے تو آپ نے اپنی اولاد سے فرمایا "تم سب کوہِ ابوقبیس پر چلے جاؤ اور وہاں سے قدرتِ الٰہی کا تماشہ دیکھو" اور پھر واقعی قدرتِ الٰہی کا کرشمہ نظر آیا کہ ابابیل کا لشکر ابرہہ کے لشکر کو ہلاک و برباد کردینے کی خاطر رونما ہوا اور انھوں نے تمام ابرہہ کے لشکر کو کنکریاں مار مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے علاوہ جب بارش نہ ہونے کی وجہ سے عربوں میں قحط پھیلا تو عرب حضرت عبد المطّلب کے درِ دولت پر حاضر ہوئے اور آپ سے دعا کے طلبگار ہوئے۔ تو حضرت عبد المطّلب نے دُعا کی اور پروردگارِ عالم نے دعا کو قبول کیا۔ ابر چھائے اور پانی ٹوٹ کر برسا۔ آخر آنحضرتؐ کے آباء و اجداد کی ایک خاص اِمتیازی حیثیت و منزلت اگر پروردگارِ عالم کے حضور نہ تھی تو قدرتِ الٰہی نے ان کے حق میں اس طرح سے اِمتیازی سلوک کیوں روا رکھا اور عرب کسی دوسرے قبیلے کے سرداروں کے پاس کیوں نہیں گئے؟

آخر کیا وجہ تھی کہ یہ بُت پرست جب بتوں کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتے تو وہ آنحضرتؐ کے بزرگوں کو اپنی احتیاج برآری اور دُعاؤں کی قبولیت اور عبد و معبود کے مابین وسیلہ قرار دیتے۔ اور تاریخیں شاہد ہیں کہ عربوں کو آنحضرتؐ کے آباء و اجداد کے دروازے سے کبھی مایوس نہیں لوٹنا پڑا۔ کیا ان تمام واقعات کو مدِّ نظر رکھنے کے بعد کوئی بھی عقل سلیم رکھنے والا انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ (معاذ اللہ) کافر و مشرک تھے۔ حقیقتِ امر تو یہی ہے کہ یہ حضرات نہ صرف یہ کہ مسلم و مومن تھے بلکہ ان کا شمار پروردگارِ عالم کے مصطفےٰ بندوں میں تھا جیسا کہ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے "بیشک اللہ نے آدمؑ، نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کو عالمین پر مصطفےٰ (برگزیدہ) کیا۔ بعض کی اولاد کو بعض سے۔ اور اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔" (آلِ عمران، آیات نمبر ۲۲ تا ۲۳)۔ ان آیات کی روشنی میں آنحضرتؐ کے آباء و اجداد جو یقیناً

آلِ ابراہیم میں شامل ہیں اور مصطفٰے بندوں میں ان کا شمار ہے اور اس سلسلہ کے تمام بزرگ از حضرت آدم تا حضرت عبداللہ ابنِ عبدالمطلب سب کے سب پروردگارِ عالم کے برگزیدہ اور مصطفٰے بندے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا یہ قرآنی استدلال کچھ اذہان و افکار کے لئے بارگراں اور ان کی طبائع و فطرت کے منافی ہو۔ اس لئے میں تھوڑی سی تفصیل ضروری سمجھتا ہوں۔

۱ —— ● یہ آیت سلسلۂ انبیاؑ سے ضرور متعلّق ہے لیکن آلِ ابراہیم میں سلسلۂ رسولِ خاتم تک حضرت اسمٰعیل کے بعد کوئی نبیؐ نہیں ہے۔ یہ دَورِ فطرت ہے جس میں اولادِ ابراہیم کے وہ افراد شامل ہیں جو نبی تو نہیں لیکن پروردگارِ عالم کے منتخب اور برگزیدہ بندوں میں شامل ہیں۔ جو موحّد و مسلم اور مومن بندگانِ خدا ہیں اور ان پر آلِ ابراہیم کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ پیغمبرِ خاتمؐ کے اس قول سے بھی اِسکی وضاحت ہوتی ہے کہ "میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں" ایک ذبیح تو حضرت اسمٰعیلؑ ہیں اور دوسرے ذبیح آنحضرتؐ کے والدِ گرامی حضرت عبداللہ بن عبدالمطلّب ہیں۔ اگر حضرت عبداللہ یا حضرت عبدالمطلّب یا آپؐ کے خاندان میں ایک بھی بزرگ کافر و مشرک ہوتے تو سرکارِ دوعالم، حضرت اسمٰعیلؑ جو ایک نبی ہیں آپؐ ان کے ذکر کے ساتھ حضرت عبداللہ کے ذکر کو کبھی شامل نہ فرماتے۔ پیغمبرِ اکرمؐ کا اپنے والدِ گرامی حضرت عبداللہ کو حضرت اسمٰعیلؑ کے ذکر کے ساتھ فخریہ طور پر شامل کرنا ہی اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ حضرت عبداللہ کی بھی حیثیت و منزلت عظیم ہے۔ حضرت عبداللہ اگر (معاذاللہ) کافر و مشرک ہوتے تو آپ ہرگز ہرگز حضرت اسمٰعیلؑ کے ذکر میں ان کو شامل نہ کرتے اور نہ ہی آپؐ ابنیت حضرت عبداللہ پر فخر و مباہات فرماتے۔

۲ —— ● حضرت عمرانؑ کی شادی "حنہ" سے ہوئی جن سے ایک لڑکی حضرت مریمؑ پیدا ہوئیں اور حضرت مریمؑ کی شادی نہیں ہوئی بلکہ یہ معجزہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے مگر حضرت عیسٰیؑ کی والدہ ماجدہ عورت ہونے کے باوجود پروردگارِ عالم کے مصطفٰے بندوں میں شامل ہیں۔ اور اس آیت کا اطلاق حضرت مریمؑ پر بھی ہوتا ہے اور حضرت عیسٰیؑ باوجود بغیر

باپ کے پیدا ہونے کے آلِ ابراہیم اور آلِ عمران میں ماں کی نسبت سے شامل ہیں۔ تو پیغمبرؐ اکرم کے والد و والدہ گرامی دونوں ہی آلِ ابراہیم کی مصداق ومعنی کے بدرجۂ اولیٰ مستحق ہیں۔ حضرت مریمؑ کے لئے ارشادِ ربّ العزّت ہے کہ "یاد کرو اس واقعہ کو جب فرشتوں نے کہا۔ اے مریم! بیشک اللہ نے تم کو مصطفیٰ (برگزیدہ) کیا اور پاک کیا، عالمین کی عورتوں میں"۔ (آلِ عمران آیت ۴۲)

یہ کتنی بڑی ناپاک جسارت اور بے دین کوشش ہے کہ سرکارِ دو عالم کے والد و والدہ گرامی کو کافر و مشرک کہا اور لکھا جا رہا ہے۔ قرآن تو آلِ ابراہیم میں آنحضرتؐ کو شامل قرار دے رہا ہے اور پاک و مصطفیٰ بندے کہہ رہا ہے لیکن نہ معلوم یہ کیسے کلمہ گو ہیں جو آنحضرتؐ کے آباء و اجداد کو کافر و مشرک یعنی نجس قرار دینے پر ہمہ تن مستعد نظر آ رہے ہیں۔

بنی اُمیّہ نے اپنے باطلانہ دورِ اقتدار میں جس طرح بھی ممکن ہو سکا آنحضرت اور آپ کے آباء و اجداد کرام کی کردار کُشی کی، اور اس سعئِ ناپاک میں کسی قسم کی حیا و شرم کو محسوس نہیں کیا۔ لیکن پاکستان جیسے اسلامی مُلک جسے اسلامی قلعہ کا درجہ حاصل ہے، یہاں بیٹھکر کچھ حضرات اب بھی سرکارِ دو عالم کی شخصیت اور آپ کے آباء و اجداد کرام کی تضحیک و توہین اور آپؐ کے مقدّس و محترم گھرانے کی مصدّقہ عظمتوں کو پامال کرنے کی جسارتِ ناپاک میں مصروف ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں "آنحضرت کے والد عبداللہ کا انتقال اپنے بوڑھے باپ کی موجودگی میں ہی ہو گیا تھا، اور عبداللہ کو اپنی وفات کے بعد اپنی حاملہ بیوی سے جو بچہ پیدا ہوا اس کے لئے امارت و حکومت اور سرداری کا بظاہر حالات کوئی امکان نہ تھا۔ اوّل تو دولت معاملہ فہمی کی بناء پر عبدالمطّلب کے بعد قریش کے مختلف گھرانوں خاص کر بنی اُمیّہ میں سرداری بٹ گئی تھی۔ اور خود بنی ہاشم اور بنی مطّلب کی سرداری بھی چھوٹے بیٹے یعنی عبداللہ کو نہیں مل سکتی تھی۔ اور نہ ملی ہی تھی جو ان کے اکلوتے یتیم کو وراثت میں ملتی"۔ (کتاب رسول اکرم کی سیاسی زندگی صـ ۳۵، از ڈاکٹر حمید اللہ ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)۔

۱۔ قارئین نے ملاحظہ فرمایا کہ سردارِ اولادِ آدم اور امام الانبیاء صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کیلئے امارت و حکومت اور سرداری کے واسطے بہ ظاہر کوئی امکان نہ تھا، اِس لئے کہ آپؐ یتیم پیدا ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد کی روشنی میں تو پھر حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور دیگر انبیاءِ کرام جو کہ یتیم پیدا ہوئے یا ان کی پیدائش کے چند ایّام ہی کے بعد اُن کے والد انتقال کر گئے تو ان کی سرداری بھی رخصت ہوگئی۔ اور اس ارشاد کی روشنی میں پھر کیا جواز پیدا ہوگا، حضرت عیسیٰؑ کی سرداری و امامت کے بارے میں اس لئے کہ آپ تو بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔

۲۔ اب رہا ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ چھوٹے بیٹے کو سرداری نہیں مل سکتی تھی تو یہ بھی تاریخ انبیاء اور مزاجِ قرآن سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے بڑے بیٹوں کی موجودگی میں ان کے چھوٹے بیٹے حضرت یوسفؑ کو کیونکر سرداری و امارت اور حکومت عطا ہوئی۔ اور حضرت علیؑ اپنے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ اور بزرگ خاندان چچا حضرت عباسؓ کی موجودگی میں مملکتِ اسلامیہ کی سرداری و امارت کے لئے کیونکر مقرّر کئے گئے، لیکن ڈاکٹر صاحب، سرکارِ دو عالمؐ کو سرداری و امارت اور حکومتِ دنیا کیلئے موزوں بھی نہیں گردانتے، جبکہ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ "میں اولادِ آدم کا سردار ہوں"۔ اس کے علاوہ پروردگارِ عالم کا ارشاد ہے کہ "میں نے اولادِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت عطا کی اور انھیں مُلکِ عظیم عطا کیا"۔ مُلکِ عظیم صرف جزیرہ نمائے عرب کو نہیں کہا جا سکتا بلکہ مُلکِ عظیم تو اُسے کہا جائے گا جو ہمارے مشاہدے اور تصوّر سے بھی بالا ہو۔ اور ہمارے پیغمبرؐ سے بہتر اس آیت کا اور کون مصداق ہو سکتا ہے۔

۳۔ اب رہی بنی اُمیّہ کی سرداری و امارت تو یہ ایک مفروضہ نظریہ ہے، جس کے لئے خدا و رسُول کی سند نہیں ملتی بلکہ بنی اُمیّہ کی مذمّت، اور اس خاندان کی خدا و رسُول سے دشمنی اظہر من الشّمس ہے۔ جسے پروردگارِ عالم نے قرآن میں شجرِ ملعونہ اور شجرِ خبیثہ سے موسوم کیا ہے۔

اِس کے علاوہ قبلِ اعلانِ نبوّت (جسے دورِ جاہلیت کہا گیا ہے) بنی اُمیہ میں قابلِ ذکر کوئی ہستی نہیں گزری۔ اور آنحضرت کو خواب میں پروردگارِ عالم نے بنی اُمیہ کو بندروں کی شکل میں منبرِ رسُول پر اُچھلتے کودتے دِکھایا گیا تھا، چنانچہ ابنِ جریر نے سہیل ابنِ سعد سے اور ابنِ حاتم نے ابن عمر سے اور یعلی بن عروہ ابنِ مردویہ نے ابنِ عباس اور حضرت عائشہ سے، بیہقی اور ابنِ عساکر نے سعید ابنِ مسیّب سے مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے کہ یہ وہ خواب ہے جو حضرت رسُول نے دیکھا تھا کہ بنی اُمیہ منبر پر بندروں کی طرح اُچک رہے ہیں۔ اس خواب کو دیکھنے کے بعد حضرت ایسے غمگین ہوئے کہ آپ عمر بھر کبھی نہیں مسکرائے۔ دیکھئے تفسیر درِ منثور جلد ۴ صہ ۱۹۱ و تاریخ یعقوبی و عقدُ الفرید اور اسد الغابہ وغیرہ۔ حضرت ابوسعید روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا "میرے اہلِ بیت بہت جلد ہی میرے بعد میری اُمّت سے قتل و جلا وطنی دیکھیں گے، اور تمام قوموں میں سب سے زیادہ عداوت رکھنے والے بنی اُمیہ، بنی مخزوم اور بنی مغیرہ ہیں۔" دیکھئے مستدرک از امام حاکم جلد ۴ صہ ۴۷۶۔ ڈاکٹر صاحب مزید رقمطراز ہیں کہ "یہ کہنا گستاخی کے لئے نہیں امرِ واقعہ کا اظہار ہے کہ آنحضرت جونیر گھرانے کی جونیر فرد تھے۔" (کتاب مذکور صہ ۳۰) جونیر جو ایک انگریزی لفظ ہے اس کا اُردو ترجمہ یہ ہوگا کہ پست یا ادنیٰ، اس کے بعد عبارت کچھ اِس طرح ہو جائیگی کہ آپ ایک پست یا ادنیٰ گھرانے کی پست یا ادنیٰ فرد تھے (معاذ اللہ)۔ لیکن خدا اور رسُول اِس گھرانے کی عظمت و وقار کے بارے میں کیا فرماتے ہیں ڈاکٹر صاحب کو اِس سے کوئی غرض نہیں۔ اب یہ امر میں مسلمانوں پر چھوڑتا ہوں کہ وہ اب خود فیصلہ کریں کہ آنحضرت کا گھرانا اور خود سرکارِ دو عالم کی ذاتِ اقدس عظیم و برتر تھی یا جیسا کہ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ؎

"چوں کُفر از کعبہ برخیزد کُجا ماند مسلمانی"

حیاتِ خیر البشر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

قرآن وحدیث اور تاریخ کے آئینے میں

جہاں تک ہستی و وجود یعنی حیات اور موت (فنا) کا تعلق ہے تو اس کے لئے مذہبی رہنما اور علمائے سائنس کا اس امر پر اتفاق ہے کہ روح کے لئے موت (فنا) نہیں ہے اور نہ ہی مادہ پیکرِ انسانی فنا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی ہئیتِ ترکیبی صرف تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً لکڑی جل کر کوئلہ میں اور کوئلہ جل کر راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر راکھ ہوا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتشر ہوتی رہتی ہے۔

چونکہ انسانی پیکر (جسم) بھی مادہ سے خلق ہوا ہے اور ہر انسان مجموعہ ہے روح و جسم کا۔ اور روح درحقیقت اس پیکرِ بشری کو فعال، متحرک اور حسی رکھنے کا ذریعہ ہے لیکن جب روح اس پیکرِ بشری سے نکل جاتی ہے تو یہی پیکرِ بشری پھر غیر متحرک اور غیر حسی ہو کر رہ جاتا ہے اور اسے مردہ کہا جاتا ہے جبکہ اس کا مادی جسم یعنی پیکرِ بشری صحیح و سالم ہی ہوتا ہے اس پر موت یعنی فنا کا قطعی گمان بھی نہیں کیا جا سکتا، اسلئے کہ اس پر ظاہر بظاہر موت یعنی فنا کا کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنی عقل و ارادہ سے کام نہیں لے سکتا۔ ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ پیکرِ بشری کو فعال، متحرک اور حسی رکھنے والی شئے یعنی روح اس سے جدا ہو چکی ہوتی ہے ورنہ جہاں تک اعضائے انسانی کا تعلق ہے، آنکھ، کان، ناک، سر، ہاتھ اور پیر وغیرہ یہ تمام اعضاءِ جسمانی موجود اور سلامت ہوتے ہیں لیکن صرف روح کے نہ ہونے کے سبب یہ تمام وجود بیکار، غیر فعال ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ انسانی جسم زمین میں مدفون ہونے کے بعد بھی فنا نہیں ہو جاتا بلکہ زمین سے ملحق ہونے کے بعد یہ خود بھی زمین ہی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ جس طرح پانی کا قطرہ داخلِ دریا ہونے کے بعد فنا نہیں ہوتا بلکہ جزو اپنے کُل میں ملحق ہونے کے بعد اپنے وجود کو اور بھی مستحکم کر لیتا ہے۔ بقائے روح کے متعلق تو تمام ہی مذاہب کا یہی نظریہ ہے کہ اس کو فنا نہیں اور اسلام میں بھی روح کا فانی اشیاء میں ذکر نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے وجود اور حیات کے بارے میں قرآن مجید میں محکم اور واضح ارشادات موجود ہیں۔ اس وجود یعنی

روح کو امرِ ربّانی سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ عام انسانوں کی روح اور اُن کے پیکروں کا ذکر تھا۔ لیکن جہاں اَولیاء اللہ، اَنبیاءِ کرام اور پروردگارِ عالم کے رسولوں کا ذکر ہے ان میں ایک تیسرا وجود نورِ الٰہی بھی شامل ہے۔ اور پیکرِ بشری جب تک روح و نور کا حامل ہے وہ تمام تکلیف شرعی کا پابند ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "مَیں نے نہیں پیدا کیا جنّ و اِلنس کو مگر اِس لئے کہ وہ میری عبادت کریں"۔ اس لئے تمام اَنبیاء و رُسل اور اَولیاء اللہ جب تک پیکرِ بشری میں ان کی ارواح مقدّسہ موجود تھی ان پر بھی جِنّ و اِنس کی طرح تکلیفِ شرعی عائد تھی۔ اور ان کی موت کا جو ذکر قرآن مجید اور دیگر اسلامی کتب میں موجود ہے اس سے یہی مراد ہے کہ تکلیف شرعی سے نجات، ورنہ جب یہ خلقتِ اوّل میں عام بشری تقاضوں سے مُبرّا تھے تو بعد مرگ ان پر عام بشری اَموات کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا مثلاً آنحضرتؐ کا یہ فرمانا کہ سب سے پہلے میرا نور خلق ہوا۔ یا پھر آپؐ کا یہ فرمانا کہ میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ مٹّی اور پانی کے درمیان تھے۔ حالانکہ آپؐ کی خلقت حضرت آدمؑ سے ہزاروں سال بعد ہوئی۔ اور ابھی آپؐ پیکرِ بشری میں تشریف بھی نہیں لائے تھے۔ لیکن صاحبِ نبوّت تھے اور آپؐ فرماتے ہیں کہ ملائکہ نے ہماری تسبیح و تقدیس کو دیکھ کر عبادتِ الٰہی کے طریقے سیکھے۔ جب آپؐ پیکرِ بشری میں تشریف لانے سے قبل بھی عبادتِ الٰہی میں مصروف تھے تو پیکرِ بشری سے آپ کا اِنتقال فرما کر عالمِ نوری یا عالمِ مثالی میں منتقل ہونے کے بعد بھی تسبیح و تقدیسِ الٰہی میں مصروف ہونے سے آپؐ کی صفتِ مخلوق ہونے کی نفی یا اپنے حدود سے تجاوز ہونا تو ثابت نہیں ہوتا۔ جب آپؐ تکلیف شرعی میں آنے سے قبل یعنی پیکرِ بشری میں تشریف لانے سے بھی ہزاروں سال پیشتر عبادتِ الٰہی میں مصروف تھے تو تکلیفِ شرعی کے ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنے خالق کی مدح و ثناء اور شکر و حمد میں مصروف ہیں تو اس میں تعجّب اور گھبراہٹ کیسی اور توحیدِ الٰہی میں کون سا نقص پیدا ہو سکتا ہے۔ جس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السّلام اگر اپنی قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھے گئے تو اس میں تعجّب اور بے یقینی کی کون سی منزل ہے۔ اور اس سے نظریۂ توحید کا کونسا اِبطال اور شرک کا اثبات ممکن ہے جبکہ وہ

اپنے خالق ہی کی بندگی میں مصروف تھے۔ انبیاء و رسل اور اولیاء اللہ کو عام بشری حیثیت میں گمان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زمین پر نیابتِ الٰہی کے درجے پر فائز ہیں اور انھیں یہ منزلت و مقام اور اختیار و تصرّف پروردگارِ عالم دے کر دُنیا میں بھیجتا ہے۔ اور پھر ان سے یہ اختیارات و تصرّفات چھین نہیں لیتا، بلکہ قیامت تک کے لئے حاصل ہے۔ جب یہ ذواتِ مقدّسہ عام بشری حیثیت سے اعلیٰ و ارفع ہیں تو ان کی ذمّہ داریاں، عبادتیں اور اختیار و تصرّف بھی دوچند ہیں اس لئے کہ ان کی تخلیق میں عام انسانوں کی طرح صرف روح و پیکر ہی شامل نہیں بلکہ ایک جنس لطیف اور بھی شامل ہے جسے " نور " کہا جاتا ہے اور سرکارِ دو عالم کا ارشاد ہے کہ اوّل مخلوق میرا نور ہے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میرا پیکر ہے۔ اور وہی نور صاحبِ نبوّت بھی ہے۔ نہ یہ کہ آپؐ کا پیکر جسے دُنیا میں ایک غلاف کی حیثیت سے عطا کیا گیا۔ جب آپؐ عالمِ انوار میں صاحبِ نبوّت تھے تو پھر یہ سوال کیونکر اُٹھایا جا سکتا ہے کہ آپؐ کس عمر میں نبی بنائے گئے۔ زمانے کی قید اور حد کا تعیّن تو اس وقت ممکن ہے جب عالمِ انوار کی حد یا ابتداء کی تعیّن کر سکیں۔ اب ان لوگوں کی عقلوں پر ماتم کیا جائے جو اس بے دین عنوانات کی سُرخی میں پمفلٹ اور پوسٹر شائع کر رہے ہیں۔ وفاتِ انبیاءِ کرام، وفاتِ ختم المرسلین (صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم)۔ آخر انبیاءِ کرام اور بالخصوص سرکارِ دو عالم کی وفات، موت یا فنا (معاذ اللہ) جس امر کا بھی یہ یقین رکھتے ہیں آخر موت یعنی فنا (معاذ اللہ) آپکو کس حیثیت میں حاصل ہوئی؟ روحانیت کے اعتبار سے یا نورانیت کی حیثیت میں ظاہر ہے کہ روحانیت و نورانیت کی موت کا گمان تو کوئی فردِ مسلم نہیں کر سکتا۔ اور نبوّت و رسالت آپؐ کو عالمِ نورانیت میں حاصل تھی۔ اور آپؐ اس نبوت و رسالت کو لے کر پیکرِ بشری میں منتقل ہوئے اور پھر رضائے خالق کے تحت آپ پھر عالمِ نورانیت میں منتقل ہو گئے تو پھر موت یعنی فنا کہاں ثابت ہے اس ضمن میں ان خارجیوں اور ناصبیوں کے پاس کون سی عقلی اور علمی دلیل ہے؟ سوائے اس کے کہ چند متشابہہ آیتوں کی من مانی تاویلات کر کے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ کر بنی اُمیّہ کے روحانی ورثہ دار ہونے کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔

"قلیب نامی ایک کنواں تھا جس میں جنگِ بدر کے مقتولینِ کفار ابوجہل۔ اُمیہ۔ شیبہ۔ اور عتبہ کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ آپؐ نے اس کنوئیں میں جھانک کر اُن مُردہ کفار سے فرمایا" پروردگارِ عالم نے جو وعدہ کیا تھا اُسے تم لوگوں نے دیکھ لیا، ایک صحابی نے کہا! آپؐ مُردوں سے کیا باتیں کرنے لگے (یعنی مُردے آپؐ کی باتیں سُن بھی سکتے ہیں؟) آپؐ نے فرمایا، خدا کی قسم تم لوگ میری باتیں اس طرح سے بھی نہیں سنتے جس طرح سے یہ مُردہ کفار سنتے ہیں"۔ (بخاری باب الجنائز)

یعنی آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ میں بھی کچھ لوگ ایسے موجود تھے جو نبیؐ کے اختیارات و تصرفات کو سمجھ نہیں سکتے تھے جبکہ انھوں نے نبیِ اکرمؐ کے ہاتھوں پر سنگریزوں کو جن کے پاس آنکھ، کان، زبان اور عقل و فہم نہ تھی آنحضرتؐ کی شہادت دیتے اور گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ آخر انسان مرنے کے بعد مٹّی ہی ہو جاتا ہے تو یہ سنگریزے بھی تو مٹّی ہی تھے پھر یہ نبیؐ کی باتیں سُن اور سمجھ سکتے ہیں تو مُردے کیوں نہیں سُن اور سمجھ سکتے؟ جب اس کا کوئی صحیح جواب نہیں حاصل ہوتا تو کہتے ہیں کہ یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔ اس دور میں عجیب بدعقل اور کج فہموں سے پالا پڑا ہے۔ انبیاء کا یہ معجزہ لوگوں (مخلوقات کی نسبت سے معجزہ کہا گیا) کی عقلوں کو عاجز کر دیتا تھا لیکن جب پروردگارِ عالم اور اُسکے نبی کی نسبت سے اس امر پر گفتگو ہوگی تو یہ حق اختیار و تصرّف کا اظہار کہا جائے گا جسے پروردگارِ عالم کی رضا و منشاء سے انھیں اس کے اظہار کی اجازت حاصل تھی۔ تو اسی اختیار سے انبیاءِ کرام اور اولیاء اللہ جب چاہتے ہیں یا ضرورت پڑتی ہے اس کا اظہار فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت عیسٰیؑ کے بارے میں قرآن میں ذکر ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ کرتے تھے اور غیب کی باتیں بتاتے تھے۔ مادر زاد اندھے کو بینائی عطا کرتے تھے۔ تو اب نبی کریمؐ نے اگر مُردوں سے باتیں کیں، اور مُردوں نے آپؐ کے کلام کو سُنا تو اسمیں کونسی قیامت برپا ہوگئی۔ آپؐ نے اپنے اس اختیار و قدرت کو استعمال فرمایا جو خالقِ اکبر نے آپ کو عطا فرمایا تو اس میں کون سا عقیدۂ شرک شامل ہو گیا؟

حضرت براء بن عازب کہتے ہیں کہ حضورِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا" جب مسلمان کو قبر میں لِٹایا جاتا ہے تو فرشتے آتے ہیں تو وہ (مسلمان) توحید اور رسالت کی گواہی دیتا ہے۔ خداوندِ عالم کا قول:-

ویثبت اللّٰہ الذین اٰمنوا بالقول الثابت سے یہی مروی ہے (بخاری باب الجنائز)۔

اس کے علاوہ سماعِ موتیٰ کے بارے میں شیخ عبدالحق محدّث دہلوی صاحب تحریر فرماتے ہیں (امام عبدالحق جو کہ اکابرین ائمّہ حدیث سے ہیں کتاب احکام الصّغریٰ میں بہ اسناد صحیح حضرت ابنِ عباس سے روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم نے ارشاد فرمایا، جو کوئی بھی اپنے کسی مسلمان بھائی کی قبر کی طرف سے گزرتا ہے جسے وہ زندگی میں جانتا تھا اور وہ اُسے سلام کرتا ہے تو وہ صاحبِ قبر مسلمان بھائی اُسے پہچانتا ہے اور سلام کا جواب دیتا ہے۔ (مدارج النّبوۃ جلد ۲ صفحہ ۷۶۴)۔

اس کے علاوہ یہ ثابت ہے کہ تمام مرنے والے اور قبروں میں مدفون مُردوں کے اجسام بھی فنا نہیں ہوتے، چنانچہ حافظ علاّمہ ابنِ قیّم تحریر فرماتے ہیں ''حضرت عبداللّٰہ بن عمر ابنِ حزام اور عمر ابنِ جموح کو قبر میں دفن کیا گیا۔ دُنیا میں ان کی آپس میں بہت محبّت تھی۔ نبی صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا کہ دنیا میں ایک دوسرے سے محبّت کرنے والوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دو۔ پھر ایک طویل زمانے کے بعد ان کی قبر کھودی گئی تو عبداللّٰہ ابنِ عمر ابنِ حرام کا ہاتھ اسی طرح ان کے زخم پر تھا جس طرح زندگی میں انھوں نے اس پر رکھا تھا۔ ان کا ہاتھ ان کے زخم سے ہٹایا گیا تو فوراً خون اُبلنے لگا۔ اس پر ان کا ہاتھ پھر اُسی جگہ لوٹا دیا گیا تو خون رُک گیا۔ حضرت جابر ابن عبداللّٰہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو قبر میں دیکھا تو گویا وہ سو رہے تھے اور ذرا بھی اُنکی حالت میں کوئی تغیّر نہ تھا۔ پوچھا گیا کہ کیا آپ نے ان کا کفن بھی دیکھا تھا تو کہنے لگے انھیں صرف ایک چادر میں دفن کیا گیا جو چہرے پر آسکی تھی اور پاؤں پر حرمل کے پتّے ڈال دیئے گئے تھے۔ ہم نے چادر کو اسی طرح دیکھا کہ حرمل ان کے پاؤں پر حسبِ سابق موجود تھا۔ اور ان کے دفن ہونے سے اب تک چھیالیس ۴۶ برس گزر چکے تھے'' (زاد المعاد حصّہ دوم صفحہ ۱۹۵)۔

اب صحابہ کرام کے ان عینی مشاہدات اور بیانات کی روشنی میں یہ امر ثابت ہے کہ زمین میں دفن ہو جانے والے تمام اجسام فنا نہیں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قبر والوں کے سننے اور جواب دینے کی دوسری روایت، انہی صحابیٔ رسُول حضرت جابر ابن عبداللّٰہ کا مشاہدہ اور آپ کی آپ بیتی بھی

ملاحظہ فرمائیے۔ "حضرت جابر ابنِ عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میں روزِ اربعین قبرِ امام حسینؑ پر زیارت کی غرض سے گیا۔ غلام میرے ساتھ تھا، پہلے فرات میں غُسل کیا، اس کے بعد غلام سے کہا کہ مجھے امامؑ کی قبر پر پہونچا (چونکہ اُس وقت طویل العمری کی بنا پر نابینا ہو چکے تھے) غلام نے کہا، یہاں پر کئی قبریں ہیں اور مجھے علم نہیں کہ ان میں امامؑ کی کون سی قبر ہے۔ آپ نے غلام سے کہا کہ تم مجھے اُن قبروں کے درمیان لے جا کر کھڑا کر دو، میرے سیّدؑ و آقا مجھے خود بتا دیں گے کہ اُن کی قبر کون سی ہے چنانچہ حضرت جابر کو اُن کے غلام نے قبروں کے درمیان لا کر کھڑا کر دیا۔ آپ نے یہ کہہ کر سلام کیا :۔
اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا بْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ قبر سے جواب سلام ملا اور انھیں یہ حکم ملا کہ اے جابرؓ میری بہن، یزید کی قید سے رہا ہو کر آ رہی ہے تم جاؤ اور میری طرف سے اس قافلہ کا استقبال کرو۔ چنانچہ حضرت جابر گئے اور آلِ رسولؐ کے قافلہ کا استقبال کیا اور پھر ساتھ ہی ساتھ قبرِ امامؑ تک آئے۔ اصحابِ پیغمبرؐ میں جابر ابنِ عبد اللہ کو یہ نمایاں فضیلت حاصل ہے کہ آپ قبرِ امام حسینؑ اور دیگر شہدائے کربلا کے پہلے زائر ہیں"۔ اِس سے یہ امر واضح ہوا کہ قبریں مدفون تمام اجسام نہ ہی مٹّی ہو جاتے ہیں اور نہ ہی وہ بے حس اور بے شعور ہوتے ہیں۔ اس دور کی سب سے بڑی بدبختی کہیئے یا پھر عمداً ایک گروہ مسلمانوں میں ایسا شامل ہو چکا ہے جو کافروں کی موت اور ان کے مُردوں کے مماثل مومنین کی موت اور شہداء کی موت کو قرار دے رہا ہے اور ان کی یہ دیدہ دلیری صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ یہ اولیاء اللہ، انبیاء کرام اور حد تو یہ ہے کہ خود سرکارِ دو عالمؐ کو (معاذ اللہ) عام مُردوں کی طرح فانی، بے حس اور بے شعور قرار دے رہا ہے جبکہ قرآن مجید مومنین اور کافرین کی صرف موت ہی نہیں بلکہ ان کی حیات کو بھی مساوی اور برابر قرار نہیں دیتا۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں کہ مومن اور کافر کی موت برابر اور مساوی نہیں ہے :۔

"کیا وہ لوگ جو بُرے کام کرتے ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم (خدا) اُنھیں، ایسے لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ ان کا مرنا اور جینا (موت و حیات) برابر ہے، یہ کتنا برا حکم لگا رہے ہیں"۔ (سورۂ جاثیہ آیت ۲۱) ۔اِس آیت کی تفسیر میں علاّمہ ابنِ کثیر

فرماتے ہیں "اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ مومن اور کافر برابر نہیں، جیسے اور آیتوں میں ہے کہ جنتی اور دوزخی برابر نہیں، جنتی کامیاب ہیں۔ یہاں بھی فرماتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کفر و برائی والے، اور ایمان و اچھائی والوں کی حیات و موت، دنیا و آخرت میں برابر ہو جائے۔ یہ تو ہماری ذات اور ہماری صفتِ عدل کے ساتھ پرلے درجے کی بدگمانی ہے۔" (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۵ سورۂ جاثیہ صفحہ ۶۳)۔ اب اس حقیقت سے کون آشنا نہیں کہ بقائے حیاتِ دنیا کے لئے جن اشیاء کی ضرورت جسم انسانی کو لاحق ہے ان نعماتِ الٰہی سے کافر بھی مستفید ہو رہے ہیں اور مومن بھی۔ موت بھی کافر و مومن کی ایک جیسی اور برابر ہے۔ مثلاً جنگِ بدر میں مقتولینِ کفار (اُمیّہ، شیبہ اور عتبہ وغیرہ اور بدر و اُحد کے شہداء (حضرت عبیدہ و حضرت حمزہ) کہ یہ لوگ زندہ تھے فطری حیثیت سے بقائے حیات کے لئے جن اشیاء کی انھیں ضرورت تھی، کافر بھی ان تمام نعماتِ الٰہی سے برابر اور مساویانہ طور پر فیضیاب ہو رہے تھے۔ اور مرے تو دونوں ہی گروہ کے لوگ ایک ہی طرح سے مقتول ہو کر مرے، تو ظاہر بظاہر مومن و کافر میں کوئی فرق نہیں بلکہ شہداء راہِ حق کی موت اور کفار کی موت ایک جیسی، برابر اور مساوی دکھائی دیتی ہے۔ اور پروردگار کا یہ حکم کہ ان کی نہ موت برابر ہے اور نہ ہی حیات برابر ہے۔ تو ماننا پڑیگا کہ خلّاقِ عالم کی منشاء اس مادّی اور ظاہری حیات و موت سے نہیں۔ اگر کافر کی موت فنا ہے تو مومن کی موت فنا نہیں بلکہ سفرِ حیات کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ بقول میر تقی میر کہ

ع۔ موت اک ماندگی کا وقفہ ہے۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ چنانچہ میر تقی میر کے فکر و تخیل کے علّامہ اقبال بھی ہمنوا نظر آتے ہیں، آپ بھی موتِ مومن کو صرف آنِ واحد کے لئے قرار دیتے ہیں اور موت ان کی نظر میں حیات کی مختلف منزلوں میں سے ایک منزل ہے جو کہ فنا نہیں بلکہ ایک سفرِ حیات ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :-

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ ✿ یک مقام از صد مقام اوست مرگ

یعنی مردانِ خدا کی مثال شیر جیسی ہے اور موت اُن کا پسندیدہ شکار ہے۔ اور موت

بندگانِ حق کی سیکڑوں منزلوں میں سے ایک منزل موت بھی ہے یعنی مسلسل سفر فنا نہیں۔

بندۂ آزاد را شانے دگر ؎ مرگ او را میدہد جانے دِگر

یعنی بندۂ آزاد کی شان ہی کچھ اور ہے، موت اسے ایک دوسری حیات عطا کرتی ہے۔

او خود اندیش است مرگ اندیش نیست ؎ مرگ آزاداں زآنے بیش نیست

یعنی یہ مردانِ حُر خدا کے آزاد بندے اپنی فکر میں غلطاں ہیں، یہ موت سے حیران و پریشان نہیں اس لئے کہ ان لوگوں کی موت فقط ایک لمحہ کے لئے ہوتی ہے یعنی ایک آن سے زیادہ نہیں۔

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد ؎ زانکہ ایں مرگ است مرگ دام و دَد

یعنی اس موت سے دُور بھاگو (خدا کی پناہ چاہو) جو تمہیں قبر کی ترکیب و حد پر موقوف کر دیتی ہے۔ کیونکہ یہ موت چوپاؤں حیوانات کی موت ہے۔ مردِ مومن کی موت قبر میں مقید نہیں کرتی، بلکہ ایک حیاتِ نَو عطا کرتی ہے چنانچہ آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک ؎ آں دِگر مرگے کہ برگیرد زِ خاک

یعنی مرد مومن اس موت کو خدائے پاک سے طلب کرتا ہے جو خاک یعنی قبر کی منزل سے شروع ہوتی ہے (قبر میں ختم نہیں ہو جاتی۔)

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر ؎ مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دِگر

یعنی ویسے تو ہر موت مومن کیلئے شکر ہے لیکن مرتضیٰ کے فرزند (سیّد الشہداء حضرت امام حسینؑ) کی موت کوئی اور ہی چیز ہے۔ یعنی علامہ اقبال کے فکر و نظر میں مومن کے لئے موت انتقالِ منازل ہے قبر میں جاکر فنا ہو جانا نہیں اور یہ کہ منازلِ انتقال تو ہر مومن کے لئے ہے لیکن شہدا اور بالخصوص حضرت علیؓ کے لختِ جگر امامؑ عالیمقام کی موت کی کچھ اور ہی منزل ہے یہ ان اموات سے الگ اور ارفع و اعلیٰ ہے۔

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را ؎ کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

یعنی اس راز کی حقیقت اور اس رمز سے آگاہی سوائے شہید کے اور کسی کو حاصل نہیں اس

راز کی حقیقت یعنی حیاتِ جاوید سے صرف شہید ہی آگاہ ہوتا ہے اس لئے کہ اس نے اس حیات کو اپنی جان و سوچ کر حاصل کیا ہے۔ اب اس کی حیاتِ جاوید، اِختیار و تصرّف اور رزقِ حسن کو وہ جانتا ہے یا پھر اس کا پروردگار اور اس کا رسُولؐ۔

کسی انسان کو اس کا شعور حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب سرکارِ دو عالم کے غلاموں (یعنی آپؐ کی امّت کے شہداء کو یہ درجہ اور منزلت و عظمت حاصل ہے تو اسی سے اس اَمر کا اندازہ ہونا چاہیئے کہ پھر جناب ختمی مرتبتؐ کی حیثیت و منزلت، عظمت و وقار، تصرّف و اختیار اور حیاتِ طیبہ کی کیا منزل ہو سکتی ہے؟ کیا آپ کے لئے فنا کا عقیدہ (معاذ اللہ) قائم کیا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ علامہ اقبال کے نظریے اور عقیدے کو قارئین نے ملاحظہ فرمایا کہ موصوف موت سے فنا ہونا مُراد نہیں لیتے تھے۔ بلکہ ان کی نظر میں موت، مومن کے سفرِ حیات کی سینکڑوں منزلوں میں سے ایک منزل موت بھی ہے۔

رہِ حیات میں جو مضمحل ہوئے طاھر
لحد میں لیٹ گئے اِک نئے سفر کیلئے

اور جیسا کہ سورۂ حج میں ارشادِ حق ہے کہ صاحبانِ ایمان بستر سے بھی اپنا سفرِ مرگ شروع کریں تو انکی حیات نصِ قرآنی سے ثابت ہے اور انھیں پروردگارِ عالم کی طرف سے رزقِ حسن مل رہا ہے۔ رزقِ فانی وجود کو نہیں بلکہ صاحبِ حیات کو دیا جاتا ہے تا کہ وہ اپنے وجود کو باقی رکھ سکے۔ تو جب عام مومنین کی موت فنا نہیں بلکہ سفرِ حیات کی منزلیں ہیں تو پھر شہدائے راہِ حق کی موت کو منزلِ فنا سے ہمکنار کرنے کا اختیار اور اس کا جواز و سندِ امّت کو کہاں سے حاصل ہو گئی۔ اُمّت کو تو حکمِ خدا یہ ہے کہ تمہیں اس کا شعور حاصل نہیں۔ تو پھر ان ناصبی اور خارجی حضرات کو یہ حق کہاں سے اور کس نے دے دیا ہے کہ یہ جسے چاہیں فانی قرار دے دیں۔ کیا انھوں نے ان انسانوں (اولیاء اللہ، رسل و انبیائے کرام اور شہداء راہِ حق) کو خلق کیا تھا؟ پھر ان ذواتِ مقدسہ کے حق میں انھیں موشگافیاں کرنے کی سند کہاں سے حاصل ہو گئی؟ تو جب عام مومنین اور شہداء راہِ حق زندہ ہیں تو جس رسُولِ خاتم کی غلامی

اطاعت و اتباع پر عمل کرتے ہوئے ان لوگوں نے اپنی جانوں کے نذرانوں کو پیش کیا اور وہ زندہ (احیاء) ہیں تو کیا ان کا ہادی و رہبر، سیّد و آقا (معاذ اللہ) فنا ہو سکتا ہے؟

یہ اینٹ پہلے ہی دورِ اسلامی میں غلط رکھ دی گئی تھی جس کا خمیازہ آج بھگتنا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ دورِ اوّل میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو قبر میں مدفون تمام اجسام کے متعلق فنا کا گمان رکھتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ مدفون اجسام فنا ہو چکے ہیں، اور دنیا سے ان کا تعلق قطعی طور پر منقطع ہو چکا ہے جس کی نفی میں آنحضرتؐ کو یہ فرمانا پڑا کہ قبر میں مدفون اجسام "سلام" سنتے ہیں۔ اور جواب بھی دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ شہداء کے حق میں عقیدۂ فنا کو رائج اور راسخ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی جسے غلط اور لغو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قرار دیا۔ "ترجمہ:- اور جو راہِ خدا میں قتل ہو گئے انھیں تم مُردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔" (سورۂ بقر آیت نمبر ۱۵۴) کتنا واضح اور غیر مبہم ارشاد ہے کہ انھیں مردہ (میّت) مت کہو بلکہ وہ زندہ، صاحبِ حیات (احیاءٌ) ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تمہارے شعور و فکر اس کا ادراک نہ کر سکیں لیکن وہ زندہ ہیں، انھیں مردہ مت کہو۔ اب اس سے بہتر سند اور دلیل "حیاتِ شہداء کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے کہ خالقِ موت و حیات خود انھیں اَحْيَاءٌ (زندہ) کہہ رہا ہے۔ اور مردہ کہنے سے منع فرما رہا ہے۔ اور ہماری حیثیت فکر و شعور کی بھی وضاحت فرما رہا ہے کہ تمہارے شعور میں یہ امرِ الٰہی نہیں آسکتا۔ اور تم انھیں مردہ مت کہو۔

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم پر لازم اور واجب تھا کہ ہم پروردگارِ عالم کے حکم کے بعد سرِ تسلیم خم کر* حیاتِ شہداء پر یقین کامل رکھتے۔ لیکن ہمارے فکر و شعور کی بے چارگی و بے بسی اور ایمان و یقین کے فقدان کو ملاحظہ فرمائیں کہ اغوائے شیطانی کے شکار ہو کر حیاتِ شہداء پر ایمان لانے کے بجائے اُلٹے حیاتِ پیغمبرِ اسلام ہی کو مشکوک اور مشتبہ کر دینے کی نامراد سازشوں میں شریک ہو گئے۔ اِس ضمن میں طرح طرح کی موشگافیاں اور بے بنیاد تاویلیں کرنے لگے۔ یہ کتنی بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ اس قسم کی موشگافیاں یہود و نصاریٰ نہیں بلکہ وہ لوگ کر رہے ہیں جو اپنے

*[illegible]

زعمِ ناقص میں خود موحّد ہی نہیں بلکہ نظریۂ توحید کا اصلاح کنندہ تصوّر کرتے ہیں یعنی اُن کے زعمِ ناقص میں پیغمبرِ اکرم، نظریۂ توحید کو معاذ اللہ ناقص چھوڑ گئے ہیں اور اب یہ لوگ اس ناقص توحید کو مکمّل کرنے کے ذمّہ دار ہیں۔ لَاحَوْلَ وَلَا ....!!

ملّتِ اسلامیہ میں آغازِ اسلام ہی سے ایک طبقہ ایسا موجود تھا جو نہ صرف یہ کہ حیاتِ شہداء ہی کا منکر تھا بلکہ حیاتِ انبیاءِ کرام اور بالخصوص حیاتِ پیغمبرؐ ان کی طبیعتوں پر بارِ گراں تھی۔ جب ہی تو پروردگارِ عالم کو قرآن مجید میں ان کے نظریات کی نفی کرنی پڑی اور خلّاقِ عالم نے متعدّد مقام پر مماتِ شہداء کی نفی فرمائی ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں مماتِ شہداء کی نفی فرماتے ہوئے پروردگارِ عالم نے زبان و قلم پر بندش عائد فرمائی کہ مت کہو کہ وہ مُردہ ہیں اور آلِ عمران میں عقل و فکر، ظن و گمان پر بھی بندش فرمادی ہے کہ: ۔ جو لوگ راہِ خدا میں قتل ہو گئے (ان کے بارے میں) یہ گمان بھی نہیں کرنا کہ وہ لوگ مردہ یعنی اَموات ہیں، بلکہ وہ زندہ (صاحبِ حیات اَحیاءٌ) ہیں، اپنے پروردگار کے پاس سے رزق پا رہے ہیں۔" (آلِ عمران ۱۷)

پروردگارِ عالم کے اس واضح اور محکم اعلان کہ شہداء زندہ ہیں، انھیں مردہ نہ کہو اور نہ ہی انھیں مردہ گمان کرو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اب اِس اعلان اور حکمِ قطعی کے بعد بھی کوئی شخص تحریراً یا تقریراً یہ کہے یا لکھے کہ انبیاءِ کرام مردہ یعنی فنا ہو چکے ہیں اور وفاتِ ختمُ المرسلین یعنی آپؐ بھی وفات یافتہ بالفاظِ دیگر مردہ ہیں۔ یا تو اسے دین و دیانت کی معرفت نہیں یا پھر وہ عمداً آیاتِ الٰہی کے ساتھ تمسخر کر رہا ہے۔ جب شہداء کی حیاتِ جاوید ہماری حسّ، فکر و شعور اور فہم و ادراک سے باہر ہے تو پیغمبرؐ کی حیاتِ طیبہ جو یقیناً شہداء کی حیاتِ جاوید سے اَرفع و اعلیٰ اور بااختیار ہے ہماری سمجھ میں کیونکر آسکتی ہے۔ یہ فنائے پیغمبرؐ کا نظریہ اور یہ مرض آج کوئی نیا مرض یا نظریہ نہیں۔ آنحضرتؐ کی حیاتِ دُنیاوی میں ہی ایک ایسا گروہ صحابہ کرام میں موجود تھا۔ جب ہی تو قرآن میں اس نظریے اور ان لوگوں کے عقیدے کی نفی کی غرض سے پروردگارِ عالم نے اپنے رسُولؐ پر آیتیں نازل فرمائیں۔ اور آپؐ کے اصحاب کرام میں ان دونوں طبقے کے افراد

موجود تھے۔ ایک تو وہ جو آپؐ کی حیاتِ طیبہؐ پر یقین رکھتا تھا۔ اور دوسرا گروہ، وہ جو آپؐ کو مردہ (میّت) گمان کرتا تھا (معاذ اللہ)۔

چنانچہ ملاحظہ فرمائیں۔ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ قربِ قیامت میں جب صُور پھونکا جائے گا تو لوگ دہشت اور خوف سے گر کر بے ہوش اور ہلاک ہو جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسُول اللہ! اس سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں، اس وقت مجھ پر اور میری آلؐ پر باآوازِ بلند درود پڑھا جائے۔ تو صحابیوں میں سے کسی نے اس گستاخانہ انداز میں کہا، اس وقت تک تو آپؐ کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئیں ہوں گی۔ یہ درود آپؐ کو کیا فائدہ پہونچائے گا! جس پر آپؐ نے فرمایا، زمین پر پروردگارِ عالم نے حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے اجسام کو کسی طرح بھی نقصان پہونچائے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے بھی ایک روایت اِس ملتی ہوئی تحریر فرمائی ہے لیکن موصوف نے نہایت ہی احتیاط سے کام لیا ہے " حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جمعہ کے دِن میرے حضور زیادہ سے زیادہ صَلوٰۃ و سَلام بھیجا کرو۔ اس لئے کہ تمہارا صَلوٰۃ و سَلام میرے حضور پیش کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا، یا رسُول اللہ! آپؐ کے حضور ہمارا صَلوٰۃ و سَلام کس طرح پیش ہوگا جبکہ آپؐ ہماری آنکھوں سے روپوش ہوں گے (یہاں پر مقصد وہی ہے کہ آپؐ فنا ہو چکے ہوں گے۔ لیکن محدّث صاحب نے قدرے احتیاط سے کام لیتے ہوئے لفظ " روپوش " استعمال کیا ہے۔" طاہر")۔ تو حضورؐ اکرم نے ارشاد فرمایا، حق تبارک و تعالےٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء علیہ السّلام کے اجسادِ مقدّسہ کو کھائے۔ اِس فرمان والا سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہ السّلام کی حیاتِ مقدّسہ حِسّی اور دنیاوی ہے۔" (مدارج النّبوۃ جلد ۲ صفحہ ۶۷۵)۔

اس سے یہ امر واضح ہے کہ آپؐ کے اصحاب میں بھی ایک گروہ ایسا موجود تھا جو آپؐ کے فنا پر (معاذ اللہ) یقین رکھتا تھا۔ اور آپؐ نے واضح طور پر اس باطل عقیدے یعنی فنا کی نفی فرمائی اور ببانگ دہل یہ ارشاد فرمایا کہ پروردگارِ عالم نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ ہمارے جسموں کو نقصان پہونچائے۔ پھر یہ عقیدہ کہ مٹی میں شامل ہو کر مٹی ہو گئے کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے

اور کیوں ؟ جبکہ کافروں اور مشرکوں کی حیات و موت کے بارے میں خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ
"وہ مردہ ہیں بغیر حیات کے ہیں، شعور نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے" (سورۂ نحل آیت ۲۱)
یہاں پر بتوں اور ان کے پرستاروں کا ذکر ہے کہ وہ مردہ یعنی اموات اور غیر احیاء (بغیر حیات و زندگی) کے ہیں جس سے صاف وضاحت ہوتی ہے کہ ان کے حیات کی نفی اور موت کا اثبات ہے جبکہ شہداء کے متعلق سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران میں موت کی نفی اور حیات کی توثیق فرمائی گئی ہے۔ حیات و موت یہ دو مختلف حیثیتیں ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور اسی طرح کافر و مومن کے حق میں دو متضاد نظریے اور حیثیتیں ہیں۔ اب اگر کافر مردہ ہیں بے حس اور بے شعور ہیں تو شہداء زندہ اور حس و شعور کے ساتھ اپنی قبروں میں موجود ہیں۔ جیسا کہ حضرت حذیفہ یمانی اور جابر ابنِ عبداللہ کے حق میں لوگوں کے مشاہدات آپ پچھلے صفحات پر پڑھ چکے ہیں۔ اب یہ کتنی بڑی بددیانتی اور شہداءِ راہِ حق، انبیاء و رسل، اولیاء اللہ کے حق میں گستاخی ہے کہ وہ آیتیں جو کفار و مشرکین اور بتوں کے لئے نازل ہوئی ہیں، یہ خارجی اور ناصبی لوگ ان آیات کا مصداق اولیاء اللہ، انبیاء و رسل اور شہداء کو قرار دے رہے ہیں۔ اور اولیاء اللہ کے حقِ تصرف کی نفی کی خاطر ان آیتوں کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔

مجھے کتابوں میں یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوتی ہے کہ مرگِ پیغمبرؐ کے متمنی صرف کفار و مشرکین، قریش و بنی امیہ ہی نہ تھے بلکہ ان میں اصحابِ پیغمبرؐ کے وہ افراد بھی شامل ہیں جن کے نام عشرۂ مبشرہ اور بیعتِ رضوان کے صحابیوں میں شامل ہیں۔ اگر قرآن بھی ان حضرات کی تائید و توثیق نہیں کرتا تو یقیناً مجھے اسے قبول کرنے میں تامل ہوتا۔ میں یہ کتاب مناظرہ کے تحت نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ میرا موضوع صرف اور صرف حیاتِ پیغمبرِ اکرمؐ ہے۔ لیکن حیاتِ پیغمبرؐ کے مخالف نظریات کے حامل افراد کی جب تک نشاندہی اور وضاحت نہ ہوگی یہ موضوع واضح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جن جن لوگوں نے حیاتِ پیغمبرؐ کی مخالفت کی ہے ان کے نظریات اور دلائل پر بحث کئے بغیر اس موضوع کی کما حقہٗ وضاحت ناممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ بحیثیت ایک مسلمان کے

ہمارا یہ فرض اوّلین ہے کہ جن لوگوں نے عظمتِ حضرت محمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو نظر انداز کرتے ہوئے مرگِ پیغمبرؐ کا اس طرح ذکر کیا ہے جس سے سراسر توہینِ رسولِ اکرم ظاہر ہو رہی ہے تو ایک مسلمان آنکھیں بند کر کے کیونکر تسلیم کر سکتا ہے۔ اس لئے اُن لوگوں کا تذکرہ اور نشاندہی بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں نے حیات و مرگِ پیغمبرؐ کو ایک نزاعی مسئلہ بنا کر اس نظریے کو پیش کیا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ ایسے لوگوں کے نظریات و عقائد اور اس کے عواقب و محرّکات کا ایک تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ اس کے بعد اب یہ قارئین کرام کی اپنی صوابدید، جذبۂ ایمانی اور وقار و عظمتِ نبیؐ کی حفاظت کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ وہ عظمت و وقارِ مصطفےٰ کے تحفّظ کی خاطر اپنی دینی ذمّہ داریوں کو پورا کرتے ہیں یا کسی اُمّتی کے غلط تاویلاتِ قرآنی کو قبول کر کے دامنِ رسالت پر بے بنیاد دھبے کو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

"چنانچہ امام سیوطی فرماتے ہیں کہ جب "آیتِ حجاب" نازل ہوئی تو حضرت ابنِ عباس فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت طلحہ نے کہا کہ اب اندھیرا ہو گیا ہے کہ ہم اپنی چچا زاد بہنوں (یعنی اُمہات المومنین ازواجِ پیغمبرِ اکرم) سے بھی پردے کے باہر سے باتیں کریں گے۔ اگر رسولؐ "مر جائینگے" تو میں عائشہ سے نکاح کروں گا۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی اور پیغمبرؐ اکرم کی ازواج کو تمام مسلمانوں پر حرام قرار دے دیا گیا۔ ترجمہ: "اور تمہارے واسطے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ کے رسولؐ کو (کسی طرح بھی) اذیّت دو، اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد کبھی ان کی بیویوں میں سے (کسی سے بھی) نکاح کرو۔ بے شک پروردگارِ عالم کی نزدیکی میں یہ گناہ عظیم ہے، چاہے تم کسی چیز کو ظاہر کر دو یا چھپاؤ، خدا تو بہر حال ہر چیز سے یقیناً آگاہ ہے۔" (سورۂ احزاب آیت ۵۳ تفسیر ابن کثیر جلد ۵ صفحہ ۲۱۴ بحوالہ تفسیر در منثور)۔ مجھے اس واقعہ پر کوئی تبصرہ یا تنقید مقصود نہیں۔ قارئین کرام خود ہی ان جذبات کے حُسن و قبح پر غور فرما سکتے ہیں اور نتیجہ آپ کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ پروردگارِ عالم نے پیغمبرؐ اکرم کے حق میں لفظ "موتہٗ" کا استعمال نہیں کیا بلکہ لفظ "بعدہٗ" اختیار فرمایا ہے۔ اور لفظ "بعدہٗ" کی تاویل یہاں پر صرف موت

کرنا غلط ہے۔ اس لئے کہ بعدہٗ کا لفظ غیر موجودگی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے پر بھی مستعمل ہے۔ مندرجہ بالا واقعہ سے یہ امر واضح ہے کہ دورِ اوّل میں بھی خود صحابہ کرام میں ایسے لوگ موجود تھے، جیسے حضرت طلحہ جو وفاتِ پیغمبرؐ پر یقین رکھتے تھے اور پروردگارِ عالم نے حضرت طلحہ کے جذبات کو "اذیتِ" پیغمبرؐ کا مصداق قرار دیا ہے، جیساکہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۵۳ سے یہ امر منکشف ہوتا ہے۔ یہ وفاتِ پیغمبرِ اکرمؐ کا نظریہ آج کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ خود صحابہ کرام کا قائم کیا ہوا ہے۔ اور یہ حضرات اس کے قائل بھی تھے۔ اس نظریے پر صحابہؓ دو گروہوں پر منقسم تھے۔ ایک گروہ جو آپؐ کی حیات کا قائل تھا اور دوسرا گروہ جو تمام انبیاء و رسل کے ساتھ آپؐ کی بھی موت یعنی فنا پر معاذ اللہ یقین رکھتا تھا۔ اور یہ گروہ آپؐ کی حیاتِ دنیا میں ہی آپؐ کی موت کا خواہاں اور متمنّی تھا۔

سرکارِ دو عالمؐ کے وصال کے فوراً بعد جو سب سے پہلا اختلاف اصحابِ نبویؐ میں رونما ہوا وہ آپؐ ہی کے حیات و موت کا مسئلہ تھا اور اس مسئلہ کو اتنی شہرت دی گئی کہ تقریباً تمام مؤرخین، محدثین اور مفسرین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ لیکن میں اس اختلافی مسئلہ (یعنی حیات و موتِ پیغمبرؐ) کو ڈاکٹر مسعود عثمانی کے پمفلٹ "وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" سے نقل کر رہا ہوں۔ "ترجمہ:۔ ہشام کہتے ہیں کہ مجھ سے عروۃ ابن الزبیر نے کہا اور انھوں نے عائشہؓ سے سنا، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ تھیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس وقت ہوئی جب ابوبکرؓ اسنح کے مقام پر تھے۔ اسمٰعیل راوی کہتے ہیں۔ یعنی عالیہ میں۔ اس وقت عمرؓ کھڑے ہوئے تھے اور کہنے لگے کہ خدا کی قسم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نہیں ہوئی۔ عائشہؓ کہتی ہیں کہ عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم میرے ذہن میں یہی بات آئی۔ اور عمرؓ نے یہ بھی کہا کہ اللہ تعالےٰ انکو پھر ضرور زندہ کرے گا اور آپ لوگوں کے (منافقوں کے جو خوشیاں منا رہے ہیں) ہاتھ اور پیر کاٹ ڈالیں گے۔ پھر ابوبکرؓ آئے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے چادر ہٹائی اور آپؐ کے چہرے کو بوسہ دیا اور کہا کہ میرے ماں، باپ آپؐ پر قربان، زندگی اور

موت دونوں میں آپؐ پاکیزہ رہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اللہ آپکو دو موتوں کا مزہ نہ چکھائے گا۔ پھر وہ باہر نکل گئے اور عمرؓ سے مخاطب ہو کر کہا، اے قسم کھانیوالے اتنی تیزی نہ کر۔ جب ابُوبکرؓ نے لوگوں سے بات کرنا شروع کی تو عمرؓ بیٹھ گئے۔

اَلزّہری کہتے ہیں کہ ابوسلمہ نے مجھ سے بیان کیا کہ عبداللہ ابنِ عباسؓ نے کہا کہ جب ابُوبکرؓ باہر نکلے اور عمرؓ لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے تو انھوں نے کہا عمرؓ بیٹھ جاؤ لیکن عمرؓ نہ بیٹھے، اَب لوگوں نے ابُوبکرؓ کی طرف توجّہ کی اور عمرؓ کو چھوڑ دیا۔ حمد و ثناء کے بعد ابُوبکرؓ نے کہا، سُن رکھّو کہ تم میں سے جو محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بندگی (یعنی عبادت) کرتا تھا وہ سے معلوم ہو کہ محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم تو وفات پاگئے۔

اور جو اللہ کا پجاری تھا (یہ خدا کی بندگی کی جگہ اللہ کا پجاری بھی خوب ہے۔ اَب بتوں کے لئے کون سا لفظ اِستعمال کیا جائے۔ "طاھر") تو اللہ تعالیٰ زندہ ہے اِسے موت نہیں، پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "یعنی محمّد اِس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر گئے ہیں، پس کیا اگر یہ مر جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو تم اُلٹے پیروں پھر جاؤ گے۔ اور جو اُلٹے پیروں پھر جائے وہ اللہ تعالیٰ کو کچھ ضرر نہ پہونچا سکے گا۔ اَللہ تعالیٰ اَپنے شکر گزار بندوں کو جزا دے کے رہے گا۔ (اٰلعمران آیت ۱۴۴) ۔ عبداللہ ابنِ عباسؓ نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا لوگ اس آیت کے متعلق یہ جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کو پہلے نازل کر چکا ہے، یہاں تک کہ ابُوبکرؓ نے اس کی تلاوت کی اور تب سارے لوگوں نے ابُوبکرؓ سے سُن کر اسکو سیکھا۔ اس کے بعد جس شخص نے بھی اس آیت کو سُنا اس کی تلاوت کرنے لگا۔ اَلزّہری کہتے ہیں کہ سعید ابنِ مسیّب نے مجھے بتلایا کہ عمرؓ نے کہا کہ واللہ جس دم میں نے ابُوبکرؓ کو اس آیت کی تلاوت کرتے سُنا میں گھٹنوں کے بل گر پڑا اور ایسا بیدم ہوا کہ میرے پاؤں مجھے سہار نہ سکے یہاں تک کہ میں زمین کی طرف جُھک پڑا، جس وقت مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اللہ کے نبیؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم وفات پاگئے۔ ترجمہ عبارت ص ۷۵۱ و ۶۴۰ جلد "۱" و "۲" بُخاری، مطبوعہ دہلی۔ (وفات النّبیؐ

صفحہ ۵ و ۶، از ڈاکٹر مسعود عثمانی توحید روڈ کراچی) ۔

مندرجہ بالا واقعہ سے حسب ذیل نتیجہ برآمد ہوتے ہیں :-

(۱) حضرت عمرؓ کے ارشاد کی روشنی میں مدینۃ الرسولؐ میں منافقین کا وجود ہی نہیں بلکہ یہ صحابہ کرام میں کافی تعداد میں خلط ملط تھے ۔اور وہ اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ پیغمبرؐ قتل ہو جائیں یا مر جائیں تو انتقالِ پیغمبرؐ کے بعد وہ خوشی اور جشن منائیں ۔

(۲) حضرت عمرؓ نے حیاتِ رسولؐ کے نظریے کو جب پیش کیا تو کسی بھی صحابی نے اس نظریے کی مخالفت نہیں کی ۔

(۳) اس کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ نے حیاتِ رسولؐ کی نفی فرماتے ہوئے آلِ عمران کی آیت ۱۴۴ سے استدلال فرمایا تو اس وقت بھی کسی صحابی نے تردید یا مخالفت نہیں کی ۔ جس سے یہ امر واضح ہے کہ اس ضمن میں اصحابِ پیغمبرؐ کا اپنا کوئی نظریہ نہ تھا ۔ یا پھر وہ اس نظریے سے متذبذب تھے اور اس نئے خیال پر اپنی رائے کا اظہار کرنا نہیں چاہتے تھے ۔

(۴) یہ کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ، حضرت عمرؓ کے ساتھ دیگر صحابہ کا یہ کہنا کہ " ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے اس آیت کو تلاوت کرنے سے پیشتر ہمیں اس آیت کا علم ہی نہ تھا " یا تو یہ طنزاً جواب تھا ، یا پھر اس آیت کا مصداق جو حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرتؐ کو قرار دیا ۔ اور اس سے آنحضرتؐ کی موت کی تاویل کی ، اصحابِ پیغمبرؐ اس نئی تاویل سے واقف نہ تھے اور یہ صحیح بھی معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ قرآن عربی زبان میں ہے اور اصحاب کرام کی زبان بھی عربی ہی تھی ۔ دیگر یہ کہ ان میں تو ہزاروں حفاظِ قرآن بھی موجود تھے ، پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ اصحابِ کبار اور اس آیت قرآنیہ سے واقف نہ ہوں ۔ لامحالہ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو تاویل پیش کی اور اس سے مرگِ رسولؐ کا اثبات فرمایا گیا تو گروہِ صحابہ اس نئی تاویل اور اس نئے مصداقِ قرآنی سے واقف نہ تھے ۔ اور اسی پر ان لوگوں نے اپنی حیرت و استعجاب فرماتے ہوئے کہا کہ " ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر ہمیں اس آیت کا

علم ہی نہ تھا۔ مطلب یہی کہ اس سے پیشتر ہم اس سے واقف نہ تھے کہ یہ آیت مرگ پیغمبر اکرم کی اثباتی حیثیت کی بھی حامل ہے۔ تو میں اس واقعہ کا ایک تفصیلی جائزہ لینا چاہتا ہوں اس لئے کہ دَورِ حاضر میں ناصبی اور خارجی حضرات وفات پیغمبرؐ پر اس واقعہ سے اِستدلال کر رہے ہیں اور اِس آیت کو اپنی تحریروں کا مرکزی عنوان یا سُرنامۂ کلام قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ حسب ذیل مندرج حقائق پر غیر جانبدارانہ حیثیت سے غور فرمائیں اور صحیح نتیجہ کا اخذ کرنا خود آپ کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے :-

(۱) جہاں تک مدینۃ الرسولؐ میں منافقین کے وجود کا تعلق ہے اس کے لئے حضرت عمر کی شہادت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ منافقین کے وجود کے اثبات کے لئے قرآن مجید میں سورۂ منافقون کی شہادت کافی ہے۔ اس کے علاوہ صحابہ کرام نے آپؐ سے اجازت طلب کی کہ وہ منافقین کا سَر قلم کر دیں تو آپؐ نے منع فرماتے ہوئے فرمایا۔ "میں اس امر کو پسند نہیں کرتا کہ لوگ کہیں کہ رسُولؐ اپنی صحبت میں بیٹھنے والے تک کو قتل کروا دیتے ہیں"۔ اس کے علاوہ بعد پیغمبر اکرم جھوٹے مدّعیانِ نبوت کا دعویٰ اور ان کے پیروکاروں کی کثرت اس اَمر کی مستند دلیل ہے کہ حضُور اکرم کی حیاتِ دنیاوی میں ہی منافقین کا وُجود تھا جو اپنے کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھے۔ لیکن سرکارِ دو عالمؐ کے اِنتقال کے فوراً ہی بعد یہ علانیہ طور پر ظاہر ہو گئے۔ اور ان لوگوں نے کھُل کر اسلام اور سرکارِ دو عالمؐ کی مخالفت علانیہ طور پر شروع کر دی بعض تو اسلام ہی سے علانیہ طور پر منحرف ہو گئے اس کی تصدیق تاریخ طبری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔ "عروہ اپنے باپ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کی وفات اور اُسامہ کی رَوانگی کے بعد تمام عرب خاص و عام مُرتد ہو گئے، مُسیلمہ اور طلیحہ نے نبوت کا دعویٰ کیا، ان کی جماعت اور طاقت بہت بڑھ گئی۔ طےّ اور اسد طلیحہ کے ساتھ ہوئے۔ اسی طرح اشجع اور غطفان کے بعض خاندانوں کے خاص لوگوں کے علاوہ تمام غطفان مرتد ہو گیا۔ انھوں نے طلیحہ کی بیعت کر لی۔ ہوازن متردّد تھے انھوں نے بھی زکوٰۃ کی ادائیگی سے اِنکار کر دیا (تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۵۸)۔

قرآن مجید میں رسولِ اکرمؐ کو تین طبقے کے لوگوں کے ساتھ جہاد کرنے کی اجازت دی گئی تھی کہ آپؐ کافروں، مشرکوں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کریں۔ لیکن اِسے مشیّت و مصلحتِ الٰہی کہیے یا پھر یہ کہ جس طرح کافرین و مشرکین (یعنی بنی اُمیّہ) نے آنحضرتؐ اور مسلمانوں پر فوج کشی کی اسی طرح ان منافقین نے آنحضرتؐ سے محاذ آرائی، فوج کشی اور خونریز معرکہ آرائی کی جرأت اور جسارت نہیں کی اور نہ ہی ان لوگوں نے آنحضرتؐ اور اسلام سے علانیہ طور پر اختلاف و بغاوت کو ظاہر ہونے دیا۔ اِسی وجہ سے آپؐ نے بھی ان لوگوں کے خلاف کسی بھی فوجی نوعیت کے اقدام کو پسند نہیں فرمایا۔ آنحضرتؐ کے انتقال کے فوراً بعد ان لوگوں نے اپنے دیرینہ جذبات کے اظہار کے ساتھ محاذ آرائی شروع کر دی اور پھر محاذ آرائی، خونریز جنگوں میں تبدیل ہو گئی۔ جس کے نتیجہ میں جھوٹے مدّعیانِ نبوت، جنگِ جمل و جنگِ صفّین کے خونریز معرکوں کے بعد کربلا کا سانحۂ عظمیٰ بھی پیش آیا۔ جیسا کہ حضرت عمّار ابنِ یاسر نے عمر ابنِ عاص سے جنگِ صفّین کے موقع پر فرمایا "کل ہم اس جھنڈے کے نیچے آنحضرتؐ کی معیت میں تمہارے کافر آباؤ اجداد سے جہاد کر چکے ہیں جو کہ تنزیلِ قرآن کے لئے تھی، اور آج حضرت علیؑ کی معیّت میں تم لوگوں سے تاویلِ قرآن پر جہاد کر رہے ہیں۔ حضرت عمّار ابنِ یاسر کے متعلق آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ "انھیں ایک گروہِ باغی قتل کرے گا۔" اور اس گروہِ باغی کی سرکردگی اور معیّت میں عمر ابنِ عاص نے حضرت علیؑ کے خلاف جنگ کی۔ یہ حدیث اتنی تواتر، مستند اور ثقہ راویوں سے مذکور ہے کہ اس کے حوالے کی چنداں ضرورت نہیں، جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بھی اپنی تصنیفات میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

(۲) یہ کہ جب حضرت عمر نے حیاتِ پیغمبرؐ پر گفتگو فرمائی تو کسی ایک صحابی نے بھی اس نظریہ کی مخالفت یا تردید نہیں کی جس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اصحابِ پیغمبرؐ اس نظریے کے مخالف نہ تھے اب رہا اس نظریہ میں افراط و تفریط کہ "آنحضرتؐ آئیں گے اور منافقین کی ٹانگیں توڑ ڈالیں گے"۔ اصحابِ پیغمبرؐ کے لئے محلِ نظر تھا۔ اس لئے کہ جب آپؐ نے اپنے انتقال سے پیشتر

منافقین کی سزا نہیں فرمائی۔ سوائے چند افراد کے جیسے عبداللہ ابن ابی سرح جو کاتبِ وحی تھا۔ لیکن بعد میں مرتد ہوگیا تھا اور مروان اور اس کے خاندان کے لوگ جنھیں سرکارِ دو عالم نے حدودِ مدینہ سے خارج کر دیا تھا اور اس کے علاوہ بھی چند افراد تھیں چند عورتیں بھی تھیں جنھیں فتح مکہ کے موقع پر قتل کا حکم آپؐ نے فرمایا تھا۔ پھر یہ کیونکر گمان کیا جا سکتا ہے کہ آپؐ انتقال کے بعد تمام منافقین کو معذّب فرماتے یا قتل کرتے جبکہ آپؐ نے اپنی سیرت کا پہلے ہی اعلان فرما دیا تھا کہ "میں ایسے نہیں پسند کرتا کہ لوگ یہ کہیں کہ رسولؐ اپنی صحبت میں بیٹھنے والوں کو بھی قتل کروا دیتے ہیں :-

(۳) یہ کہ بعد میں جب حضرت ابوبکر آئے تو انھوں نے حضرت عمر سے متضاد اور مخالف نظریہ "مرگِ" "پیغمبرؐ" کا پیش کرتے ہوئے "آلِ عمران کی آیت ۱۴۴" سے استدلال فرمایا، اور اس سے حیاتِ پیغمبرِ اکرمؐ کی نفی فرماتے ہوئے اور دیگر انبیاء و رسل کے موت کی بھی توثیق فرما دی جس پر اصحابِ پیغمبرؐ نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے فرمایا ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس آیت سے پہلے کبھی آگاہ ہی نہ تھے۔ یا تو اصحابِ پیغمبرؐ کی طرف سے طنزاً کہا گیا تھا۔ یا پھر استعجاب و حیرت کا اظہار تھا کہ کیا ہم آیت اور اس کی تاویل سے آگاہ نہیں ہیں ؟

(۴) یہ کہ حضرت ابوبکر کا یہ فرمانا کہ "جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا وہ یہ جان لے کہ محمدؐ مر گئے اور جو خدا کی عبادت کرتا تھا جان لے کہ خدا زندہ ہے۔ حضرت ابوبکر کا یہ ارشاد محلِ نظر ہے۔ اس لئے کہ اصحابِ پیغمبرؐ اتنے جاہل اور بدعقل نہ تھے کہ پیغمبرؐ کی اتباع و اطاعت کی بجائے آپؐ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اگر ڈاکٹر مسعود عثمانی صاحب ان کے اسماءِ گرامی بھی لکھ دیتے جو پیغمبرِ اسلامؐ کی عبادت کرتے تھے تو بڑی اچھی تحقیق ہوتی کہ آیا یہ اصحابِ پیغمبرؐ مسلم تھے یا منافق؟ اب اگر بفرضِ محال اس نظریے کو واقعاتی اعتبار سے صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ فی الواقعہ ایسا ہی تھا تو پھر اصحابِ پیغمبرؐ کا موقف اور منزلت کیا باقی رہتی ہے اور شرک کسے کہتے ہیں ؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک غلط نظریہ "پیغمبرؐ کے فنا" کو صحیح ثابت کرنے

غرض سے اتنی قلابازی کھائی گئی یا کھائی جارہی ہے۔ دراصل بات اتنی سی ہے کہ اصحابِ پیغمبرؐ میں کچھ ہستیاں ایسی بھی تھیں جو سرکارِ دو عالم کی عزّت و احترام اور وقار و عظمت کیسامنے اِسطرح ہمہ تن عجز وانکساری سے پیش آتی تھیں کہ کوتاہ بین نگاہیں اور نبیؐ کو عام بشر سمجھنے والے لوگ اس احترام پیغمبرؐ کو عبادتِ پیغمبرؐ سے تعبیر کرنے لگے۔ جیساکہ بعد میں بھی ایسے لوگوں کا ذکر ملتا ہے کہ جن لوگوں کی نگاہوں میں عظمت و احترام پیغمبرؐ اوّلین دینی فریضہ تھا۔ چنانچہ "صحابہ کرام کا حضورؐ کے وِصال کے بعد یہ حال تھا کہ جب وہ حضورؐ کا ذکر کرتے تو رونے لگتے اور خشوع کا اظہار کرتے اور حضورؐ کی غایت تعظیم اور آپؐ کی ہیبت و جلال سے ان کے جسموں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہی حال تابعین اور انکے بعد والوں کا تھا۔" (مدارج النّبوۃ جلد ۱ صفحہ ۵۲۸)۔

اب اگر قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیت آلعمران ۱۴۴؎ کو آپ کی موت یا قتلِ پیغمبرؐ کے صرف اثباتی حد تک موقوف کر دیا جائے تو پروردگارِ عالم کا علم (معاذ اللہ) ناقص قرار پائے گا، اس لئے کہ پروردگارِ عالم نے پیغمبرِ اکرمؐ کی دو حیثیتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ مرجائیں یا قتل ہو جائیں۔ اور یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپؐ قتل نہیں ہوئے۔ بلکہ آپؐ نے اپنے بستر پر انتقال فرمایا۔ اور پروردگارِ عالم کا یہ فرمانا، کہ مرجائیں یا قتل ہو جائیں۔ تو کلام میں پچاس فیصد نقص ہے (معاذ اللہ) اِس لئے کہ آنحضرتؐ قتل نہیں ہوئے۔ اور پچاس فیصد صحیح ہوا کہ آپؐ نے انتقال فرمایا۔ برادرم محترم پروردگارِ عالم کا علم بالذّات ہے؛ اور اس کے پاس ماضی، حال مستقبل کی کوئی حیثیت نہیں، ہر چیز اور ہر زمانہ حضور ہی حضور ہے پھر نصف فرمان کا صحیح ثابت ہونا اور نصف کا غلط ہونے کے کیا معنیٰ؟ اور دوسرے یہ کہ اگر مرجائیں یا قتل ہو جائیں تو یہ "اگر، مگر" کا لفظ انھیں ہی زیب دیتا ہے، جن کا علم ناقص ہو، اور مستقبل جن کے لئے غیب ہی غیب ہو وہ اگر ایسا کہیں کہ ہو سکتا ہے کہ زید مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو یہ غلط نہیں ہے لیکن پروردگارِ عالم کے لئے ایسا غیر یقینی کلام زیب نہیں دیتا اور پروردگارِ عالم کے متعلّق یہ گمان بھی کفر ہے کہ اس کے اندازے میں خطا یا اس کے

علم میں غیر یقینی کی بھی کوئی منزل ہے۔ تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ ڈاکٹر مسعود عثمانی صاحب جو اس آیت سے مرگِ پیغمبرؐ کا اثباتی پہلو تلاش کر رہے ہیں، وہ غلط ہے اور ان کا خوش ہو کر تالیاں بجانا عبث ہے، اس لئے کہ یہ آیت مرگِ پیغمبرؐ کی اثباتی حیثیت سے متعلق نہیں اور نہ ہی مرگِ پیغمبرؐ کی آیتِ ہٰذا میں پروردگارِ عالم نے سند عطا کی ہے۔ اس آیت سے پروردگارِ عالم کی مرگِ پیغمبرؐ کی بجائے کچھ اور ہی منشاء اور کسی اور کا ہی وجود اور ان کے جذبات کا اظہار ہے۔ جسے ڈاکٹر عثمانی صاحب انتہائی حرفت کے ساتھ اس آیت کے مصداق اور وجود کی پردہ پوشی کرتے ہوئے پیغمبرؐ ہی کو فنا کے گھاٹ اتار دینے کی سعیٔ ناکام فرمائی ہے۔ اور اس آیت کا حقیقی اور صحیح مصداق آیت کے دوسرے جملے سے واضح ہے کہ "تو تم الٹے پیروں پھر لوٹ جاؤ گے (یعنی اسلام کو ترک کر کے پھر اپنے آبائی دین (بت پرستی) کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ جو الٹے پیروں لوٹ جائے گا وہ پروردگارِ عالم کو کوئی نقصان نہ پہونچا سکے گا اللہ تعالےٰ اپنے شکر گزار بندوں کو جزا دے کے رہے گا" اب قارئین غور فرمائیں کہ یہ آیت منافقین کے وجود، اُن کے دلی جذبات کی وضاحت اور ترجمانی کر رہی ہے نہ کہ "مرگِ پیغمبرؐ کی" اور وہ یہ ہے کہ یہ منافقین منتظر تھے کہ پیغمبرؐ مرجائیں یا یہ قتل ہو جائیں تو یہ دینِ اسلام کو ترک کر کے الٹے پیروں بت پرستی کی طرف لوٹ جانے کے لئے منتظر اور تیار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب ان خارجیوں کی چالاکی دیکھئے کہ کتنے حسین مغالطہ سے مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

ایک طرف تو انھوں نے آیت کے مصداق "منافقین اور ان کے ناپاک جذبات کی پردہ پوشی کی" اور دوسری طرف اس آیت کا مصداق "مرگِ پیغمبرؐ کو قرار دے دیا" اب قارئین غور فرما کر خود نتیجہ اخذ فرمائیں کہ اس آیت کا مصداق منافقین کا وجود اور ان کے جذبات کا اظہار ہے یا پروردگارِ عالم کا اس آیت سے مقصود مرگِ پیغمبرؐ کا اثبات ہے، (معاذ اللہ) —— اس وقت خارجیت اور ناصبیت لفظ "مَاتَ اور قُتِلَ" سے مرگِ پیغمبرؐ کا اثبات کر رہی ہے۔ اور اپنے زعمِ ناقص میں اسے بہت بڑی دینی خدمت اور

توحید پرستی سمجھ رہی ہے۔ جبکہ اس آیت کی "خبر" ان سے پہلے بھی رسول گزر رہے ہیں" "قد خلت" مرے ہیں یہ نہیں ہے تو اس آیت سے پیغمبرؐ کو مُردوں کے زمرے میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ خارجیت کے عقیدے اور نظریے کے تحت تمام انبیاء و رسل مر چکے ہیں۔ لیکن آیت ان تمام رسولوں کو مُردہ نہیں بلکہ "گزر رہے ہیں" کہہ رہی ہے۔ اور پھر تمام کو مُردہ قرار بھی کس طرح دیا جا سکتا ہے جبکہ حضرت الیاسؑ، حضرت خضرؑ اور حضرت عیسٰیؑ تو ابھی تک پیکرِ بشری میں موجود اور زندہ ہیں۔ اگر اس آیت کی وجہ نزول اور مصداق کو سچائی اور ایمانداری کے میزان پر رکھ کر اس کی تاویل و تفسیر کی جاتی تو پھر اس طرح کی لرزش اور خطا کا امکان نہیں رہتا۔ اس آیت کا مضمون تقریباً دس آیتوں تک مسلسل ہے۔ صرف درمیان سے ایک آیت لے کر "من مانی" تاویل کرنا کوئی مستحسن فعل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ محدّثین اور مفسّرین نے ان آیتوں کا شانِ نزول جنگِ اُحد کے موقع پر ذکر کیا ہے جنگِ اُحد میں اصحابِ پیغمبرؐ جن سخت ترین مشکلات سے دوچار ہوئے اور ان کے ایمان و جذبات کی کیا کیفیت ہوئی۔ اگر میں اس بحث کو چھیڑ دوں تو ایک طوالت ہو گی اور دوسرے یہ کہ اِس وقت یہ میرا موضوع بھی نہیں۔ قارئینِ کتاب سے درخواست ہے کہ آپ حضرات جنگِ اُحد کے واقعہ کو تاریخ اِسلام کی کتابوں میں دیکھیں پھر آپ آسانی کے ساتھ فیصلہ کریں گے کہ ان آیات کا حقیقی مصداق کون ہے ؟

چنانچہ ڈاکٹر عثمانی صاحب کا یہ تحریر فرمانا کہ "عبداللہ ابن عباسؓ نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا لوگ اس آیت کے متعلق یہ جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نازل کر چکا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت ابو بکر نے اِس کی تلاوت کی اور تب سارے لوگوں نے حضرت ابو بکر سے اس کو سیکھا۔ اس کے بعد جس شخص نے بھی اس آیت کو سنا اس کی تلاوت کرنے لگا" الزہری کہتے ہیں سعید بن المسیّب نے مجھے بتلایا کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ واللہ جس وقت میں نے حضرت ابو بکر کو اس آیت کی تلاوت کرتے سنا، میں گھٹنوں کے بل گر پڑا اور ایسا بیدم ہوا کہ میرے پاؤں

مجھے سہار نہ سکے یہاں تک کہ میں زمین کی طرف جھک پڑا جس وقت مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے"۔ (وفات النبی ص۵ و۶ ۔ از ڈاکٹر مسعود عثمان، توحید روڈ کراچی)۔

اب اس کے بعد اس پہلو کو دیکھیے "مرگِ پیغمبرؐ کے نظریے کو حضرت ابوبکرؓ کے نظریۂ مرگِ پیغمبرؐ سے ڈاکٹر صاحب موصوف حاصل کرتے ہیں اور بڑے ذوق شوق سے اس کی توثیق و تائید فرماتے ہیں۔ جبکہ حضرت عمرؓ کے نظریۂ "حیاتِ پیغمبرؐ" کی نفی اور رد فرماتے ہوئے حضرت عمرؓ کو انتہائی لاچار، بے علم اور کمزور فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جس دم میں نے حضرت ابوبکرؓ کو اس آیت کی تلاوت کرتے سنا میں گھٹنوں کے بل گر پڑا اور ایسا بیدم ہوا کہ میرے پاؤں بھی مجھے سہار نہ سکے۔ یہاں تک کہ میں زمین کی طرف جھک پڑا"۔ اب اس حالت اور آثار کو سوائے بیہوش ہونے کے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ اُمر تو قابلِ قبول اور ممکن ہی نہیں ہے کہ حضرت ابنِ عباس جنھیں علم کا دریا کہا گیا اور حضرت عمرؓ جو کہ حیثیت و مرتبہ میں برادرانِ اہلسنّت میں کسی کم مرتبہ پر فائز نہیں۔ ان لوگوں کا نظریات اور اجتہاد میں اتنا شدید اختلاف اور کسی معمولی اُمر میں نہیں بلکہ خود ذاتِ سرکارِ دو عالم کی حیات و موت کے مسئلہ میں، اور پھر آیاتِ قرآنیہ کے بارے میں خود ان اصحابِ پیغمبرؐ کی زبانی یہ کہلوانا کہ وہ اس سے قبل اس آیت سے واقف ہی نہ تھے۔ جبکہ یہ آیات تقریباً آٹھ سال پیشتر نازل ہو چکیں تھیں۔ تو پھر آپ کے اس عقیدے اور نظریے کی اساس کیا ہو گی "ہم تک دین صحابہ کرام سے پہونچا" اور ان صحابہ کرام کا عالم (آپ کی تحریر کی روشنی میں یہ ہے کہ یہ حضرات آیاتِ قرآنیہ اور اس کی تفسیر و تاویل اور مصداق صحیح سے بھی واقف نہ تھے؟ آپ ثابت تو کرنا چاہتے تھے پیغمبرؐ کی موت، لیکن اس غلط موقف نے بحث و تمحیص کے کتنے زاویے پیدا کر دیئے۔ تو کیا ان نظریات اور اجتہاد میں اتنے شدید اختلاف و تضاد پیدا ہونے کا علم پروردگارِ عالم کو نہ تھا کہ بعدِ رسولؐ یہ اُمت تاویل و تفسیر اور نظریات کے

اختلاف میں بھی مبتلا ہو سکتی ہے۔ تو اس اُمّت کو اس اختلاف سے محفوظ رکھنے اور سما
آیاتِ قرآنیہ کی صحیح تاویل و مصداق کے حصول کے لئے پروردگارِ عالم نے کوئی ہدایت
فرمائی ہے؟ یا ملّت کو اس بھنور میں پھنسا چھوڑ دیا ہے؟ جبکہ یہ دین اور قرآن قیامت تک
قائم ہے اور قرآن میں محکم بھی ہے اور متشابہ بھی، جیسا کہ پروردگارِ عالم خود فرماتا ہے" وہ
جس نے تجھ پر "کتاب" نازل فرمائی جس میں محکم آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ
آیتیں ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے وہ ان متشابہ آیتوں کی اتباع کرتے
ہیں۔ فتنہ کی طلب اور اس کی جستجو کے لئے، اس کی حقیقی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے خدا
کے یا اُن لوگوں کے جو راسخون فی العلم ہیں — یہ لوگ ہی کہتے ہیں کہ ہم تو ان پر ایمان
لا چکے ہیں یہ سب تو ہمارے رب کی طرف سے ہیں۔ اور نصیحت تو صرف صاحبانِ عقل ہی
حاصل کرتے ہیں" (آلِ عمران آیت ۷)۔

حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں ایک طویل بحث تو ضرور کی ہے مگر
راسخون فی العلم سے کون مراد ہے، اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی، صرف سرسری طور پر عبداللہ
ابنِ عباسؓ کا ذکر کیا ہے چنانچہ ملاحظہ ہو۔ "حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت ابنِ عباس کیلئے
دعا کی کہ خدایا انھیں دین کی سمجھ دے اور تفسیر کا علم دے (تفسیر ابنِ کثیر پارہ ۳ سورۂ آلعمرانؑ)
لیکن اس ضمن میں ایک دلچسپ بحث فرماتے ہیں۔ آپ حضرات بھی ملاحظہ فرمائیں وہ حضورؐ نے
یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہ آیتوں میں جھگڑتے ہیں تو انھیں اُنکی
حالت پر چھوڑ دو یہی لوگ اس آیت میں مراد لئے گئے ہیں۔ یہ حدیث مختلف طریقوں سے
بہت سی کتابوں میں مروی ہے۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے
ملاحظہ ہو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ یہ لوگ خوارج ہیں (مسند احمد بن حنبل)
پس اس حدیث کو زیادہ سے زیادہ موقوف سمجھ لیا جائے تاہم اس کا مضمون صحیح ہے اس
لئے کہ پہلی بدعت خوارج نے پھیلائی یہ فرقہ دنیوی رنج کی وجہ سے مسلمانوں سے الگ ہوا حضورؐ

نے جس وقت حُنین کی غنیمت کا مال تقسیم کیا اُس وقت ان لوگوں نے اسے خلاف عدل سمجھا اور ان میں سے ایک نے جسے ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا اس نے حضورؐ کے سامنے آکر کہا کہ حضرت (صلعم) عدل کیجئے! آپ نے اس تقسیم میں عدل نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے تو خدا نے "امین" بنایا ہے، اگر میں بھی عدل نہ کروں تو پھر تو تو برباد ہوا اور نقصان میں پڑا۔ جب وہ لوٹا تو حضرت عمرؓ نے درخواست کی کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں اسے مار ڈالوں، آپؐ نے فرمایا چھوڑ دو اس کی جنس سے ایک ایسی قوم نکلے گی کہ تم لوگ اپنی نمازوں کو انکی نمازوں کے مقابلے میں اور اپنی قرآن خوانی کو ان کی قرآن خوانی کے مقابلے میں حقیر سمجھو گے، دراصل وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے، تم جہاں انھیں پاؤ قتل کر دو۔ ان کے قتل کرنے والے کو بڑا ثواب ملے گا۔ حضرت علیؑ کی خلافت کے زمانے میں یہ ظاہر ہوئے اور آپؐ نے جنگِ نہروان میں انھیں قتل کیا۔ پھر انمیں پھوٹ پڑی اور ان کے مختلف الخیال فرقے ہوگئے اور نئی نئی بدعتیں دین میں جاری کرلیں"۔ (تفسیر ابنِ کثیر جلد "۱" صفحہ ۴۴۲) - یہ جنگِ حُنین کے بعد کا واقعہ ہے۔

اور اس وقت آپ کی حیاتِ طیبہ تقریباً ساٹھ سے تجاوز کر چکی ہے اور ان لوگوں کی معرفت دین و پیغمبر کا یہ عالم ہے کہ یہ لوگ پیغمبرِ اکرم کو عادل بھی نہیں سمجھتے (معاذ اللہ) کیا رسُولِ اکرم سے بہتر بھی کوئی پروردگار کی روشن دلیل اور آیت ہو سکتی ہے؟ اور کیا پیغمبرِ اسلام کی سیرت و کردار سے بہتر آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر ممکن ہے؟ تو جب رسُول کی موجودگی میں اصحابِ پیغمبرؐ کے یہ جذبات تھے کہ مالِ دُنیا کے عوض یہ سرکارِ دو عالم پر معترض ہوا کرتے تھے تو پھر ایسے لوگوں کی موجودگی اور وجود کے بعد بھی یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ سب کے سب ہدایت یافتہ تھے، اور ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد جو اس وقت زمرۂ اسلام میں داخل تھے، سب صحابی تھے تو پھر اُمتی کون تھا؟ اور اگر ان تمام کو زمرۂ صحابہ میں شامل کرلیا جائے تو پھر ان اصحابِ پیغمبرؐ جو زہد و تقویٰ، ایمان و معرفت اور اطاعت خدا و رسُول کو

اپنا ایمان اور وظیفۂ دینی سمجھتے تھے۔ پھر ان میں اور ایسے منافقین میں جو پیغمبرؐ کو عادل بھی نہیں گردانتے تھے (معاذ اللہ) کیا فرقِ مراتب باقی بچتا ہے۔ اور پھر مخلص صحابہ کرام کی عظمتؓ و وقار کی کیا منزلت باقی رہ جاتی ہے۔ حقیقت میں بنی اُمیّہ نے اپنے دَورِ اقتدار میں اس حدیث کو وضع کروا کر ایک تیر سے دو شکار کئے۔ ایک طرف تو انھوں نے اس حدیث سے ان تمام افراد کو جو بظاہر کلمہ گو تھے انھیں زمرۂ صحابہ میں داخل کر کے انھیں عزّت و احترام کے درجہ پر فائز کر کے ان کے عیوب و کردار اور جذبات کی پردہ پوشی کر دی کہ انھیں صحابئِ رسُول سمجھ کر تنقید کا ہدف نہ بنایا جا سکے۔ اور دوسری طرف دیندار، صاحبانِ زہد و تقویٰ اور اطاعت خدا و رسُول کے جذبے میں سرشار اصحاب با وفا کی کردار کُشی کیجائے اور ان لوگوں کو بھی اُن کی صفوں میں شامل کر دیا جائے کہ جن کے صاحبِ ایمانؓ ہونے کی سند خدا اور رسُول نے عطا نہیں فرمائی تھی جنھیں پیغمبرؐ نے تالیف القلوب، (کمزور ایمان والوں میں) داخل فرمایا تھا۔ چنانچہ حافظ علی بہادر خاں حنفی تحریر فرماتے ہیں کہ "اِسلام کی ابتداء کے سامنے رشتے اور قبیلے کے تعلّقات کی ابتدائی دَور کے صحابیوں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ لیکن یہ صبر و امتحان کا دَوران صحابہ پر گزرا جو ابتدائے اِسلام میں رسُول اللہ کے ساتھ تھے۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس دَور کے صحابہ کی فضیلت بیان کی ہے۔ یہ دَور یوں تو فتحِ مکّہ سے پہلے ہی ختم ہونے لگا لیکن فتحِ مکّہ سے اس کا باقاعدہ خاتمہ ہوگیا کیونکہ اس کے بعد اِسلام اتنا طاقتور ہوگیا تھا۔ لوگ (اب) اس میں آکر کسی امتحان میں نہیں پڑتے بلکہ لوگوں کو دائرہِ اسلام میں آنے سے دنیاوی فائدہ پہونچتا تھا۔ مزید یہ کہ (لوگ) جان و مال کی امان کے لئے بھی اسلام قبول کرنے لگے۔ صحیح بُخاری کی حدیث کے یہ الفاظ بھی ملاحظہ ہوں "عرب اس انتظار میں تھے کہ فتحِ مکّہ کے بعد اپنے اِسلام کا فیصلہ کریں اور وہ یہ کہتے تھے کہ (محمّد کو) اور ان کی قوم کو چھوڑ دیا جائے اگر یہ سچّے نبی ہیں تو اپنی قوم پر غالب ہوں گے۔ پس جب مکّہ فتح ہوا تو وہ اِسلام کے لئے دوڑنے لگے۔"

(کتاب بخاری، المغازی باب فتح مکّہ) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فتح مکّہ کے بعد جو لوگ ایمان لائے ان کے لئے قبول اسلام کے وہ محرکات نہ تھے جو ابتدائی دور میں اسلام قبول کرنے والوں کے ہو سکتے ہیں۔ ابتدائی دور کے صحابہ پر قرآن کی صداقت، رسُول کے مواعظِ حَسنہ اور اسلامی اخلاق کا اثر ہوا تھا۔ لیکن بعد میں اسلام لانے والے صحابہ پر اسلامی اقتدار (یعنی طاقت و قوت) کا اثر پڑا۔ ان میں سے بعض تو وہ تھے جو یہ سمجھ کر ایمان لائے کہ اب اس کے علاوہ چارہ ہی کچھ نہیں تھا اور ان کے لئے اب غیر مسلم رہنا ممکن ہی نہ تھا یہ مطلب نہیں کہ فتح مکّہ کے بعد ایمان لانے والے تمام صحابہ فضل و منقبت کے لحاظ سے پست درجہ میں رہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان میں بھی اکثر و بیشتر اسلام میں آنے کے بعد زہد و تقوے کے بلند مرتبے پر پہونچے لیکن یہ ضرور ہے کہ صحابہ میں منافق بھی شامل تھے اور ان کی تلاش زیادہ ان متاخرین صحابہ میں ہی کرنا چاہیئے۔ وہ صحابہ جو جہنّم میں جاتے ہوئے رسُول اللہ کو "حوض" پر ملیں گے۔ وہ اسی زُمرہ میں ہو سکتے ہیں جو اسلام کے طاقتور ہونے کے بعد دائرہِ اسلام میں آئے۔ ان میں سے متعدّد رسُول اللہ کی صحبت میں بھی رہے اور صحابہ کہلائے۔ مگر ان کے دلوں میں صحبتِ رسُول سے فیض حاصل کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ ابتدائی دور ابتلا کے صحابہ کے لئے قرآن کی اور آیات بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان صحابہ کا درجہ بہت بلند ہے۔ انھیں کی نسبت فرمایا گیا ہے: "اَلسّابقون الاوّلون من المہاجرین والانصار" اس آیت میں بعد میں آنے والے صحابہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مگر اس میں احسان کی شرط لگائی گئی ہے: "اور جو ان کے بعد اعمالِ حَسنہ والے ہوں"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اوّل درجہ کے صحابہ کے بعد جو صحابہ ہوں گے ان کے لئے رضی اللہ عنہم کی شرط یہ ہے کہ وہ نیکوکار ہوں اور اوّل درجہ کے صحابہ کے جیسے اخلاق حاصل کریں ان میں ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کے اعمالِ حَسنہ نہ ہوں تو وہ رضی اللہ عنہ کے مصداق نہ ہوں گے۔" (صحابیت، حافظ علی بہادر خاں دہلوی ص۲۸) اس سے یہ امر واضح ہے کہ

ایک لاکھ چوبیس ہزار کی جو فہرست دی جا رہی ہے۔ ان تمام افراد کو سابقین الاولین صحابہ کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی ایسا کرنا کوئی دینی خدمت ہوگی بلکہ حقیقت میں یہ اصحاب کبار کے حق میں ظلم اور ان کی صریحاً کردار کشی کے مترادف ہوگا۔ اس کے لئے خدا و رسول کے حکم کو بعد میں پیش کیا جائے گا پہلے ایک عقلی دلیل بھی ملاحظہ فرمائیں۔ یہ سب کے سب ہدایت یافتہ ہیں تم جس کی بھی پیروی کرو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔" یہ حدیث فتح مکّہ سے پہلے کہی گئی یا بعد؟ اگر قبل کہی گئی تو بعد میں دائرۂ اسلامی میں آنے والے کا موقف کیا تھا؟ یہ تو ہدایت یافتہ نہ تھے اور اگر فتح مکّہ کے بعد یہ ارشاد ہوا تو پھر جیسا کہ ارشاد ہوا کہ "تم جس صحابی کی بھی پیروی کرو گے کامیاب ہو جاؤ گے سارے کے سارے تو صحابی ہیں، اب اتّباع و پیروی کی دعوت کس کو دی جا رہی ہے؟ اور مخاطب کون ہے۔ اس کے علاوہ جب ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابیت کے درجہ پر فائز ہیں تو سرکارِ دو عالم کی اُمّت کہاں گئی؟ جن کی ہدایت و رہبری کے لئے آپؐ مبعوث ہوئے تھے، اور پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ جب ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و مرسلین میں تمام اور سب کے سب ایک درجہ اور ایک منزل پر فائز نہیں، بلکہ ان میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ تو صحابہ کرام کیا انبیاء کرام جو معصوم فطرت کے حامل ہیں، یہ صحابہ کرام ان سے بھی افضل اور کسی اعلیٰ درجہ پر فائز تھے کہ سب کے سب ایک جیسے ہدایت یافتہ ہو گئے، اگر ایسا تھا تو پیغمبرؐ اکرم کی بعثت کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ تعالیٰ اس غلط عقیدے اور نظریے کو سورۂ حدید میں باطل قرار دے رہا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:- "تم میں سے جن لوگوں نے قبل فتح مکّہ مال خرچ کیا اللہ کے لئے اور قتال کیا۔ یہ ان کے برابر نہیں بلکہ ان کے درجات عظیم ہیں (ان سے) جنھوں نے فتح مکّہ کے بعد مال خرچ کیا اور قتال کیا، ہاں بھلائی کا وعدہ تو پروردگار کا ہر اُس شخص سے ہے جو اعمالِ حسنہ بجا لائے، اور جو کچھ بھی تم عمل کرتے ہو پروردگارِ عالم اُس سے آگاہ ہے۔"

(سورۂ حدید آیت ۹ء) ۔ اِس آیت نے تمام صحابہ ایک جیسے ہیں، اس نظریہ کی نہ صرف یہ کہ تردید کی ہے بلکہ اصحاب کرام کے قطعی دو طبقے بتائے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو فتح مکہ سے قبل دائرۂ ایمانی میں داخل تھا اور اس طبقہ نے راہِ خدا میں جان و مال سے جہاد کیا، انکے درجات خدا و رسول کی بارگاہ میں عظیم ہیں۔ دوسرا طبقہ جو بعد فتح مکہ ایمان لایا، مال خرچ کیا اور جہاد میں شریک ہوا، یہ طبقہ پہلے طبقے سے پست ہے۔ لَا یَسْتَوِیْ یعنی برابر بھی نہیں ہے تو اس حکم صریحی اور نصِ قرآنی کے بعد بھی اب اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ تمام کے تمام صحابی ایک درجہ میں اور مساوی و برابر ہیں تو حیف ہے اس کے جذبۂ ایمانی اور معرفتِ دینی پر۔

بنی اُمیہ کی اکثریت اور بالخصوص امیر معاویہ اور ان کے بزرگ فتح مکّہ کے بعد دائرۂ اِسلامی میں داخل ہونے کی سعادت سے مشرّف ہوئے۔ اور سرکارِ دو عالم نے انھیں صحابۂ کبار کے درجے میں شامل نہیں کیا بلکہ انھیں تالیف القلوب (کمزور ایمان والوں کے زمرہ) میں شامل کیا۔ اور انھیں لوگوں کے لئے آزاد کردہ غلام "طلقاء" کے گروہ کا اِنتخاب حضورِ اکرم نے فرمایا۔ ان حقائق کے بعد یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ عبداللہ ابنِ مسعود، یاسر عمّار ابنِ یاسر، سعد ابنِ عبادہ، ابو ایّوب انصاری، بلال، مقداد، سلمان فارسی، حمزہ، حنظلہ، عبیدہ اور ان جیسے دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مقابل، برابر اور مساوی درجہ میں انھیں قرار دے دیا جائے۔ جبکہ خدا و رسول نے بھی ان لوگوں کو سابقین سے پست اور ان سے ادنیٰ درجے میں قرار دیا ہے۔ چنانچہ عالمِ اہلسنّت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کا ارشاد بھی ملاحظہ فرمائیں "حضرت عبداللہ ابن عمر کا وہ قول اس پر مبنی ہے جو انھوں نے معاویہ ابنِ ابوسفیان سے کہنے کے لئے تجویز کیا تھا کہ تم سے زیادہ خلافت کے لائق وہ شخص ہے جس نے تم سے اور تمہارے باپ سے اِسلام پر قتال کیا، یعنی علیِ مرتضیٰؑ۔ صحیح بخاری نے بھی اس کو روایت کیا ہے کہ :۔

"تم اور تمہارے باپ بحالتِ کفر کافروں کی معیّت میں میدانِ جنگ میں آتے تھے

اور علیؑ مسلمان تھے اور مسلمانوں کی معیت میں میدانِ جنگ میں جاتے تھے اور تم لوگوں سے جنگ کرتے تھے۔ اور (اسی اصل پر) عبدالرحمن بن غنم اشعری فقیہہِ شام کا کلام مبنی ہے جس کا قصہ اس طرح پر ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو درداء جو قاصد بن کر امیر معاویہ کا پیغام لے کر ان کی جانب سے حضرت علیؑ کے پاس گئے کہ خلافت کو چھوڑ دو اور اس کو مسلمانوں کے شوریٰ پر دائر کر دو۔ جب یہ پیغام پہونچا کر حضرت علیؑ کے پاس سے واپس لوٹے اور مقام حمص میں جو مسکن حضرت عبدالرحمٰن ابن غنم اشعری کا تھا، پہونچے۔ تو حضرت عبدالرحمٰن نے ان سے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا کہ تم دونوں پر تعجب ہے کہ یہ پیغام جو تم دونوں لائے تھے، حضرت علیؑ کے سامنے تم سے کیونکر ادا ہوا؟ تم نے علیؑ کو ترغیب دی کہ خلافت کو شوریٰ پر دائر کریں۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ مہاجرین و انصار، اہلِ حجاز اور اہلِ عراق نے علیؑ سے بیعت کر لی ہے۔ اور بیشک جو لوگ علیؑ کی خلافت پر راضی ہیں وہ ان لوگوں سے افضل ہیں جو علیؑ کی خلافت سے ناخوش ہیں اور جن لوگوں نے علیؑ کی بیعت کر لی ہے وہ ان لوگوں سے افضل ہیں جنھوں نے ان سے بیعت نہیں کی۔ اور معاویہ کو شوریٰ قائم ہونے سے کیا فائدہ، کیونکہ شوریٰ سے خلافت ملے گی، تو مہاجرین ہی میں سے کسی کو ملے گی۔ اور معاویہ مہاجرین میں سے نہیں ہیں بلکہ طلقاء میں سے ہیں جن کو خلافت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ معاویہ اور ان کے والد غزوۂ احزاب میں کافروں کے سردار تھے۔ عبدالرحمٰن بن غنم کا یہ کلام سن کر حضرت ابو ہریرہ اور ابو درداء اپنے آنے پر نادم ہوئے اور عبدالرحمٰن بن غنم کے سامنے اپنے اس فعل سے توبہ کی۔ ابنِ عمر نے "استیعاب" میں اس کو روایت کیا ہے۔" (ازالۃ الخفاء جلد" ا" مقصد اوّل ص۲۸۴، شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی)۔

اس سے یہ امر ثابت ہوا کہ بنی امیہ (گروہِ طلقا) کو اصحابِ پیغمبرؐ پر کسی قسم کی برتری۔ ان پر اقتدار و حکومت کا کسی طرح بھی حق حاصل نہ تھا، بلکہ انھیں احکامِ خدا و

رسُول کے تحت اصحابِ رسُول کی برابری بھی دینی حیثیت میں جائز نہ تھی۔

قبل اس کے کہ راسخون فی العلم کی بحث علماءِ تفسیر کی روشنی میں آگے بڑھائی جائے، چند واقعات اور چند ان شخصیتوں کے جذبات و کردار کی بھی وضاحت ہو جائے جو فتح مکّہ کے مسلمانوں میں شامل تھے۔ متذکرہ بالا آیت کی روشنی میں اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث کی وضاحت سے یہ امر اظہر من الشّمس ہے کہ فتح مکّہ کے بعد والوں کو خدا و رسُول نے اصحاب کبار کی برابری اور ہمسری سے منع فرما دیا تھا۔ کہ آں حضرتؐ نے تو معاویہ کے متعلّق ملوک یعنی بادشاہت قرار دیا اور بنی اُمیّہ کے حکمرانوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ ان کی حکومت بدترین حکومت ہو گی۔ لیکن امیر معاویہ کو خلافت تو کُجا، حکومت سیاسی کی بھی اس وقت تک جرأت و جسارت نہیں کرنی تھی، جب تک کہ ایک بھی صحابی فتح مکّہ کے قبل کے باحیات ملّتِ اسلامیہ میں موجود تھے۔ اس لئے کہ حاکم وقت بہر طور رعیّت سے افضل و اعلیٰ ہوتا ہے اور اس کی اطاعت رعایا پر فرض ہوتی ہے۔ اور رعایا حاکم وقت کے سامنے ادنیٰ یعنی لپست ہوتی۔ اسلئے حضرت معاویہ پر اطاعت خدا و رسُول سے عہدہ برآ ہونے کے لئے لازم و واجب تھا کہ وہ اصحابِ پیغمبرؐ پر حاکم بننا پسند نہیں کرتے تاکہ سورۂ حدید کی متذکرہ بالا آیت اور حکم پروردگار سے سرتابی کے مرتکب ہونے سے محفوظ رہتے۔ ویسے تو تمام بنی اُمیّہ جو فتح مکّہ کے موقع پر مسلمان ہوئے اور ان میں سے بالخصوص آپ کے باپ ابوسفیان اور ماں ہندہ بنتِ عتبہ آنحضرتؐ اور اسلام کے سخت ترین دشمن ہی رہے۔ چاہے وہ اسلام لانے سے قبل کا ذکر ہو یا بعد کا ان لوگوں نے آنحضرتؐ کو بحیثیت رسول اور شارع حقیقی کے کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ یہ لوگ آنحضرتؐ کی حیثیت نبوی، احترام و تقدّس، عظمت و وقار اور مقام و منزلت کو ہمیشہ مشکوک و مشتبہ بنانے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہے اور اس ضمن میں ان لوگوں نے کوئی بھی دقیقہ فروگزاشت نہ ہونے دیا۔ اس ضمن میں چند واقعات ابوسفیان کے ملاحظہ ہوں

جیسے تقریباً تمام اہلسنّت کے مؤرّخین ومفسّرین نے اپنی اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔

جس وقت مہاجرینِ مکّہ کفّارِ قریش اور بنی اُمیّہ سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت فرماگئے تو ہی ابوسفیان تحائف گراں قدر لے کر نجاشی شاہِ حبشہ کے پاس ایک وفد لے کر گئے تاکہ مسلمانوں کو وہاں سے مُلک بدر کروا دیں۔ جب انکے حبشہ جانے کی اطّلاع حضرت ابوطالبؑ کو ہوئی تو آپ نے اپنے جواں سال فرزند جعفر طیّار کو ایک نظم کہہ کر دی جس میں آنحضرتؐ کی نبوّت کا ذکر، شاہِ حبشہ کی تعریف اور مسلمانانِ مکّہ کی مظلومیت اور قریش و بنی اُمیّہ کے ظلم کو بیان فرمایا تھا۔ نجاشی پر اس نظم کا اتنا اثر ہُوا کہ اس نے ابوسفیان اور اس کے وفد کو مایوس واپس کر دیا۔ اور اس نے دعوت کی کہ حضرت جعفر طیّارؑ آنحضرتؐ کی تعلیمات کا اس کے دربار میں ذکر کریں۔ سرکاری طور پر دربار میں مناظرہ کا انتظام ہوا جس میں علماءِ نصاریٰ بھی شریک تھے۔ یہ مناظرہ کئی دنوں تک جاری رہا جس کے نتیجہ میں نجاشی، اس کے چند وزراء، اُمراء اور رعایا کے افراد نے اسلام کی حقّانیت کو قبول کیا۔ اور اس طرح سرزمینِ افریقہ پر پہلی مرتبہ نظریۂ توحید کی تبلیغ اور نعرۂ توحید کو بلند کرنے والا آنحضرتؐ کا چچازاد بھائی، ابوطالب کا فرزند، بنی ہاشم ہی کی ایک فرد تھا۔ لیکن چونکہ حضرت جعفر طیّار کو آنحضرتؐ سے ایک تعلّق خاص اور خونی رشتہ داری تھی اس وجہ سے حضرت جعفر کا یہ اسلامی کارنامہ، سرزمینِ افریقہ کو بغیر ایک قطرہ خون بہائے فتح کرلینے والوں میں شامل نہیں کیا گیا، جبکہ آغازِ اسلام میں اسلام کے دو ہی تبلیغی مراکز تھے۔ ایک مکّہ، جہاں آپؐ بذاتِ خود تبلیغ دین میں منہمک تھے دوسرا سرزمینِ افریقہ (حبشہ) جہاں تبلیغ دین کی ذمّہ داری اور سربراہی آنحضرتؐ کی اجازت اور نیابت میں حضرت ابوطالبؑ کے نوجوان پسر جناب جعفر طیّار ادا فرما رہے تھے لیکن یہ اہم اور عظیم کارنامہ صرف تاریخ کے طالب علموں کے لئے محض ایک داستان کی حیثیت سے پڑھایا جا رہا ہے۔ اور یہ محض اور فقط اس وجہ سے نظرانداز کیا جا رہا ہے کہ اس کارنامے کو

انجام دینے والا بنی ہاشم اور حضورؐ کا ایک قریبی رشتہ دار تھا۔ اور ہر اس واقعہ کو ناقابلِ اعتناء بنا دینے کی بنی اُمیّہ نے پوری کوشش کی، جس واقعہ سے آنحضرتؐ کی عظمت و بزرگی اور احترام و تقدّس ثابت ہوتا ہو۔ اب یہی دیکھئے کہ صحابیت کی یہ تعریف کی جا رہی ہے کہ

"جس نے عالمِ اسلام میں پیغمبرؐ سے ملاقات کی اور آپؐ سے حدیث سنی اور بیان کی"۔ مگر نجاّشی نے نہ آپؐ سے ملاقات کی اور نہ ہی کوئی روایت بیان کی، اس لئے صحابیت کے زمرہ میں تو نجاّشی شامل نہ ہوا ؟ لیکن اس کی خدمات اور اس شخصیت کی عظمت ملاحظہ فرمائی جائے کہ حضرت اُمّ حبیبہ کا نکاح آنحضرتؐ سے پڑھانے والا نجاّشی اور نجاّشی نے جب اُمّ حبیبہ کو حبشہ سے آنحضرتؐ کی خدمت میں روانہ کیا تو آپؐ نے نہ ہی حضرت اُمّ حبیبہ سے دوبارہ خطبۂ نکاح پڑھا اور نہ ہی "مہر" ادا فرمایا۔ اس لئے کہ نجاّشی نے آنحضرتؐ کی طرف سے خود اپنے مال سے حضرت اُمّ حبیبہ کا "مہر" ادا کر دیا تھا۔ کتنا بھروسہ اور یقین تھا۔ سرکارِ دو عالمؐ کو نجاّشی کے دین و معرفت اور اس کے مالِ حلال پر کہ آنحضرتؐ نے اس کے تحائف بھی قبول فرمائے، اس کے پڑھائے ہوئے نکاح کو بھی قبول کیا اور اس ادا کردہ "مہر" پر بھی آپؐ نے کسی قسم کی بے اطمینانی کے اظہار کے بغیر قبول فرمایا۔ اور اُس کی عظمت و بزرگی اور ایمانِ کامل کی دلیل اس امر سے واضح ہے کہ وہ حکومتِ حبشہ سے دستبردار ہو کر ہجرتِ مدینہ کی غرض سے روانہ ہوا۔ لیکن مشیّتِ الٰہی کہ دورانِ ہجرتِ مدینہ اثنائے سفر میں اس نے انتقال کیا۔ آنحضرتؐ اس وقت قبرستانِ بقیع میں رونق افروز تھے کہ پروردگارِ عالم کا حکم پہونچا کہ نجاّشی نے انتقال کیا آپؐ اس کی نمازِ جنازہ ادا فرمائیں۔ اور آپؐ نے اصحابِ عظام سے کہا کہ تمہارے بھائی اصحمہ (نجاّشی) نے انتقال کیا، اس کی نمازِ جنازہ ادا کرو۔ چنانچہ اصحابِ پیغمبرؐ نے حضورؐ کی امامت میں نجاّشی کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔

کیا یہ عظیم المرتبت شخصیت آج تاریخِ اسلام میں اور مسلمانوں میں اسی عظمت و تقدّس اور احترام کی نظروں سے دیکھی جا رہی ہے جس حیثیت و منزلت کی یہ حامل تھی؟

آخر نجاشیؓ کو وہ مقام و منزلت کیوں نہیں دی گئی جو اور دیگر صحابیوں کو دی گئی۔؟
میری سمجھ میں اس کی دو وجوہ ہیں۔

(۱) نجاشی اور اس کے ساتھیوں نے اسلام جناب جعفر طیار کے ہاتھوں پر قبول کیا جو بنی ہاشم اور سرکارِ دو عالم کے رشتہ دار تھے۔ اگر یہ امر عظیم کسی بنی امیہ کی فرد کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا ہوتا تو آج یہ واقعہ تاریخ اسلام کی ہر کتاب میں سنہری اور جلی حروف سے لکھا ہوا نظر آتا اور ہر مورخ مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا مگر چونکہ یہ عظیم اور امتیازی فضیلت صرف سرکارِ دو عالم کے بھائی کو حاصل ہوئی اس لئے یہ ناقابلِ اعتناء اور قابلِ ذکر بلکہ قابلِ غور بھی قرار نہ دی گئی۔

(۲) جیساکہ روایتوں سے ثابت ہے کہ نجاشی کے ایک فرزند نصر ابنِ ابی نیزرؓ حضرت امام حسین علیہ السّلام کی نصرت میں واقعۂ کربلا میں شہید ہوئے۔ چنانچہ محدّث نوریؒ نے خاتمۂ مستدرک اور ابن حجر عسقلانی نے الاصابہ میں جو کچھ ان کے بارے میں لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :- یہ نجاشی بادشاہِ حبشہ کے فرزند تھے۔ صغر سنی میں مدینہ میں آکر مشرف بہ اسلام ہوئے خود آنحضرتؐ ان کی نگرانی و سرپرستی فرماتے تھے۔ جب نجاشی کا انتقال ہوا تو اہلِ حبشہ نے ان سے استدعا کی کہ اپنے باپ کی مسندِ حکومت پر متمکن ہوں تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے نزدیک جناب رسولِ خدا کی خدمت میں ایک گھنٹہ زندگی بسر کرنا تمہاری زندگی بھر کی بادشاہت سے بہتر و برتر ہے۔ آنحضرت کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت علیؑ سے وابستہ رہے۔ حوالئِ مدینہ میں جنابِ امیرؑ کی جو جائیداد تھی آنجنابؑ نے اس کی نگرانی اور اصلاح انھیں کے سپرد فرمائی ہوئی تھی۔ جو مزرعۂ ابی نیزر کے نام سے مشہور تھی۔ جسے حضرت علیؑ نے ابناءِ السبیل اور فقراءِ مدینہ کے واسطے وقف فرما دیا تھا۔ نصر ابن ابی نیزر کی زندگی کا آغاز و شباب علیؑ مرتضیٰ اور آپکے فرزندان (امام حسن اور امام حسین علیہم السّلام) کی خدمت میں گزرا۔ جب حضرت امام حسینؑ

مدینہ سے عراق کی سمت روانہ ہوئے تو یہ بھی آپؑ کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ حتیٰ کہ آغازِ جنگ ہونے کے بعد یہ بزرگوار بھی منصبِ شہادت پر فائز ہوئے۔"

اب اسی امر سے صاحبانِ دین و معرفت اندازہ کریں کہ ایک عیسائی اور شہنشاہی ماحول کا پروردہ نومسلم شخص دین و ایمان اور محبتِ رسُول میں کتنا سرشار تھا کہ اپنی خاندانی شہنشاہیت پر ٹھوکر مار کر دُنیا کے عیش و آرام، عزت و شہرت اور دولت و ثروت کو ٹھکرا کر خدمت و حضوری پیغمبرؐ پر نثار کر دیتا ہے۔ اور اصحابِ پیغمبرؐ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف یہ عیسائی خاندان کی نومسلم فرد ہے اور دوسری طرف بنی اُمیّہ ہیں جو اپنی حکومت و اقتدار کی خاطر جب تک کافر رہے مسلمانوں کو قتل کرتے رہے اور سرکارِ دو عالمؐ کے قتل کے منصوبے بناتے رہے، اور جب جبراً اسلام میں داخل ہوئے تو یہ اسلام کے خلاف سازش اور اصحابِ کرام اور آلِ رسُول کو اپنے اقتدار و حکومت کی بقاء اور سیاسی مقاصد کے لئے قتل کرتے رہے۔ تو کیا یہ دو طرح کے جذبات و کردار کے حامل صحابیوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے؟ اور صاحبانِ ایمان ان دونوں کو مساوی اور برابر قرار دے سکتے ہیں اور ایسا کرنا واقعی کوئی دینی خدمت اور دینداری کہی جا سکتی ہے؟ یہ تو واقعاتی پہلو پر ایک سرسری سا تبصرہ تھا۔ لیکن پروردگارِ عالم نے بھی اہلِ حبشہ اور نجاشی کے لئے کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ یا نہیں اس لئے کہ صاحبانِ اسلام کے لئے تو دلیل قاطع اور نصِّ صریح اسی وقت قابلِ قبول ہو سکتی ہے جب اُس کی سند قرآنِ کریم سے بھی حاصل ہوا۔ چنانچہ عالمِ اہلسنّت اور مفسّرِ قرآن حافظ ابنِ کثیر فرماتے ہیں:-

"صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے کہ نجاشی کے انتقال کی خبر رسُولِ خدا نے اصحاب کو دی اور فرمایا کہ تمہارا بھائی حبشہ میں انتقال کر گیا ہے۔ اس کے جنازے کی نماز ادا کرو اور میدان میں جا کر صحابہ کی صفیں مرتّب فرما کر آپؐ نے اُنکے جنازے کی نماز ادا فرمائی۔ ابنِ مردویہ میں

ہے کہ جب نجاشی فوت ہوئے تو حضورؐ نے فرمایا، اپنے بھائی کے لئے اُستغفار کرو۔ تو بعض لوگوں نے کہا کہ دیکھئے حضورؐ ہمیں اس نصرانی کے لئے اُستغفار کرنے کا حکم دیتے ہیں جو حبشہ میں مرا ہے۔ ابنِ جریر میں ہے کہ ان کی موت کی خبر حضورؐ نے دی کہ تمہارا بھائی اصحمہ انتقال کر گیا ہے۔ پھر حضورؐ باہر نکلے اور جس طرح جنازے کی نماز پڑھاتے تھے اُسی طرح چار تکبیروں سے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اس پر منافقوں نے اعتراض کیا۔ اس پر یہ آیت اُتری "یقیناً اہلِ کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو تمہاری طرف نازل ہوا ہے اور جو اُنکی طرف نازل ہوا ہے اُس پر بھی، اللہ سے ڈرتے رہنے والے ہیں۔ اور اللہ کی آیتوں کو تھوڑے تھوڑے مول پر بیچتے بھی نہیں۔ ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہے، یقیناً پروردگار جلد حساب لینے والا ہے۔" (آلعمران آیت ۱۹۹)۔ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نجاشی کے انتقال کے بعد ہم یہی سنتے رہے کہ ان کی قبر پر نور دیکھا جاتا ہے۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ نجاشی کا ایک دشمن اُس کی سلطنت میں نجاشی پر چڑھائی لایا تو مہاجرین نے کہا کہ آپ اس سے مقابلہ کرنے کے لئے چلیئے، ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ ہماری بہادری کے جوہر بھی دیکھ لیں گے اور جو حُسن سلوک آپنے ہمارے ساتھ کیا ہے اس کا بدلہ بھی اُتر جائے گا۔ لیکن نجاشی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لوگوں کی امداد کے ساتھ بچاؤ کرنے سے خدا کی امداد کا بچاؤ بہتر ہے۔" (تفسیر ابنِ کثیر جلد ا "سورۂ آلعمران آیت ۱۹۹ ص ۶۶ و ۶۷) اور سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "یقیناً تو ایمان والوں کا دشمن سب سے زیادہ یہودیوں اور مشرکوں کو پائے گا اور ایمان والوں سے سب سے زیادہ دوستی کے قریب یقیناً تو اُنھیں پائے گا جو خود کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ اور جب وہ اسکو سنتے ہیں جو کہ رسُول کی طرف سے بھیجا گیا ہے تو آپ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس سبب سے کہ اُنھوں نے حق کو پہچان لیا ہے، یوں کہتے ہیں کہ اے میرے ربّ! ہم سب مسلمان ہو گئے تو ہمکو بھی ان لوگوں کے ساتھ لکھ لے جو شہادت دینے والے

ہیں۔ اور ہمارے پاس کون سا عذر ہے کہ ہم اللہ پر اور جو حق ہم کو پہونچتا ہے اُس پر ایمان نہ لائیں اور اس بات کے امیدوار ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالحین میں داخل کردے گا، سو پروردگار عالم ان کے قول کے بموجب ایسے باغ عطا کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے اور نیکوکاروں کے لئے یہی جزا ہے" (سورۂ مائدہ آیت نمبر ۸۲ تا ۸۶)۔ لیکن ابن کثیر نے ان آیتوں کو نجاشی کے حق میں نزول کا اقرار کرنے کے بعد کچھ روایتوں کے ایسے اُلجھاوے پیدا کردیئے ہیں جس سے نجاشی کی شخصیت پردۂ خفاء میں چلی جائے اور کوشش یہی کی ہے کہ ان آیتوں کا صحیح مصداق نجاشی اور ان جیسے اس کے دوسرے ہمنوا بھی پس منظر میں چلے جائیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو" یہ آیت اور اس کے بعد کی چاروں آیتیں یعنی ۸۳ تا ۸۶ آیتیں، نجاشی اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئیں ہیں۔ جب ان کے سامنے حبشہ کے ملک میں حضرت جعفر ابن ابیطالبؓ نے قرآن شریف پڑھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے اور اس قدر روئے کہ ان کی ڈاڑھیاں تر ہوگئیں۔ مگر یہ خیال رہے کہ آیتیں مدینہ میں اُتریں ہیں اور حضرت جعفرؓ کا یہ واقعہ ہجرت کے پہلے کا ہے۔ یہ بھی مروی ہے کہ یہ آیتیں اس وفد کے بارے میں نازل ہوئیں جسے نجاشی نے حضورؐ کی خدمت میں بھیجا تھا کہ وہ آپؐ سے ملیں، حاضر خدمت ہوکر آپؐ کے حالات وصفات دیکھیں اور آپؐ کا کلام سنیں۔ جب یہ آئے، آپؐ سے ملے اور آپؐ کی زبان مبارک سے قرآن کریم سنا تو اُنکے دل نرم ہوگئے۔ بہت روئے دھوئے اور اسلام قبول کیا، اور واپس جاکر نجاشی سے یہ سب حال کہا۔ نجاشی اپنی سلطنت چھوڑ کر حضورؐ کی طرف آنے لگے لیکن راستے میں ہی انتقال ہوگیا۔ مگر صحیح روایات سے ثابت ہے کہ وہ حبشہ میں ہی سلطنت کرتے ہوئے فوت ہوئے، ان کے انتقال والے دن ہی حضورؐ نے صحابہ کو ان کے انتقال کی خبر دی اور اُن کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی"۔ (تفسیر ابن کثیر سورۂ مائدہ ص ۱۲۷ و ۱۲۸)۔ ابن کثیر کا یہ فرمانا کہ یہ آیات مدنی ہیں۔ یہاں تک تو صحیح

ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ حضرت جعفر ابنِ ابیطالب کا واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے یہ قارئین کیلئے مُغالطہ کا باعث ہے، یا تو سہواً ایسا ابنِ کثیر سے ہوا یا پھر وہی بنی اُمیہ کے جذبات کارفرما ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان آیات کا نزول جنگِ بدر کے بعد ہوا اور اس وقت حضرت جعفر ابنِ ابیطالبؓ، حبشہ میں ہی مقیم تھے۔ آپ کی واپسی فتح خیبر کے موقع پر مقامِ خیبر پر ہی ہوئی۔ اس واقعہ کی سند، آنحضرت کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ "میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں باتوں سے کس بات پر زیادہ خوش ہوں، آیا جعفر کے واپس آنے پر یا خیبر کے فتح ہونے پر"، آپؐ کے اس ارشاد سے بھائی سے ملنے کی صرف خوشی نہیں بلکہ اس میں ایک دینی رمز اور اسلامی خوشی شامل ہے۔ آنحضرتؐ کے اس ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ آیا میں حضرت جعفر ابنِ ابیطالبؓ کی عیسائی دُنیا پر کامیاب اسلامی فتح پر زیادہ خوشی کروں یا حضرت علیؑ کے ہاتھوں یہودیوں پر کامیاب فتح پر زیادہ خوشی کروں؟ کیا کہنا حضرت ابوطالب کی صحیح تربیت کا جو انھوں نے اپنے فرزندوں کی دی کہ جس کی بدولت آج سرکارِ دوعالم مسرور و شاداں ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ؎ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اب ابنِ کثیر کا حضرت جعفر ابنِ ابیطالب کے حق میں یہ شُبہہ پیدا کرنا کہ آپ ہجرت سے پہلے حبشہ گئے تھے اور یہ آیت ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہے (مقصد یہ ہے کہ حضرت جعفر طیار کو ان آیات کے مصداق میں شامل نہیں کیا جاسکتا، تو آیئے اس کے بھی پس منظر اور محرکات پر ایک سرسری سا جائزہ لے لیا جائے۔ حقیقت میں یہاں پہ بھی بنی اُمیہ کے گھناؤنے کردار کی پردہ پوشی کی جارہی ہے۔ جب پہلی مرتبہ ابوسفیان نجاشی کے دربار سے ناکام و نامراد واپس لوٹا، یہاں تک کہ جنگِ بدر کا واقع ہوئی۔ اور اس میں بنی اُمیہ کو ناقابلِ تلافی شکست ہوئی تو انھوں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کی خاطر دوبارہ ایک وفد عمر ابنِ عاص کی قیادت میں نجاشی شاہ حبشہ کے پاس

روانہ کیا تاکہ یا تو انھیں وہاں قتل کروا دیا جائے یا واپس لاکر مکّہ میں قتل کر دیا جائے۔ یہ آیاتِ قرآنیہ اسی کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں:۔

" اِدھر جناب رسالتمآبؐ مکّہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے۔ پس جب بدر کا واقعہ پیش آیا اور کفّار قریش کے چیدہ چیدہ افراد اس میں مارے گئے تو قریشی لوگ دارالنّدوہ میں جمع ہوئے۔ اور آپس میں مشورہ کیا کہ نجّاشی کے پاس جس قدر مسلمان موجود ہیں، ہمیں وہاں پہونچکر ان سے اِنتقام لینا چاہیئے۔ پس انھوں نے چندہ جمع کر کے نجّاشی کو ایک معقول رشوت دینے کے لئے اپنی مطلب برآری کی تجویز منظور کی، اور عمر ابنِ عاص، عمارہ بن اَبی معیط کو مہم کے لئے اِنتخاب کیا۔ چنانچہ یہ دونوں قیمتی تحائف اپنے ساتھ لے کر بحری راستہ عبور کرتے ہوئے **حبشہ** پہونچے۔ جب شاہی دربار میں داخل ہوئے تو انھوں نے نجّاشی کے تخت کے سامنے سجدہ کیا، چاپلوسی اور خوشامد کے طور پر کہنے لگے۔ اے بادشاہ! ہماری پوری قوم کے دِلوں میں آپ کی خیر خواہی کا جذبہ ہے اور وہ سب آپ کے ملک و قوم سے بہ دل و جان محبّت و خلوص کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ہمیں اپنی قوم نے صرف اس لئے بھیجا ہے کہ چند مفسد اور فتنہ پرداز آدمیوں کے شر سے آپ کو محفوظ رہنے کا مشورہ دوں۔ کیونکہ وہ لوگ ایک ایسے دروغ گو شخص کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ جو خود کو اللہ کا رسُول ظاہر کرتا ہے۔ ہماری پوری قوم میں سے سوائے چند بیوقوفوں کے اس کی بات کوئی نہیں سنتا۔ ہم نے پوری طرح اس سے مقاطعہ کر کے اُسے شہر سے نکال دیا تھا۔ چنانچہ وہ مجبوراً ایک "شعب" میں رہے۔ جہاں ان کے پاس کسی کی بھی آمد و رفت نہ تھی۔ ان کے اکثر ساتھی بھوک و پیاس کی شدّت سے مر گئے۔ پس تنگ آکر اس نے اپنے چچازاد بھائی کو آپ کے مُلک، دین اور رعیّت میں اَبتری پھیلانے کے لئے روانہ کیا ہے۔ آپ اس سے بچیں بلکہ اسے تمام ساتھیوں کے ساتھ ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم خود ہی اُن کا انتظام کر لیں گے اور آپ کی مزید تسلّی کے لئے ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اگر وہ لوگ آپکے دربار میں

داخل ہوں تو آپ کے سامنے سر بہ سجدہ ہونا تو درکنار، آپ کو شاہانہ شان سے سلام تک نہ کر سکے
نجاشی نے حضرت جعفر اور آپ کے ساتھیوں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ حضرت جعفر
دربار میں "نعرۂ تکبیر" بلند کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ انھوں نے تختِ شاہی کے سامنے
سجدہ نہیں کیا۔ عمرو ابنِ عاص نے بادشاہ کو مشتعل اور مخالف کرنے کی خاطر اس سے کہا
کہ یہ لوگ آپ کو سجدہ کرنے میں اپنی توہین اور ہتک سمجھتے ہیں۔ نجاشی نے دریافت کیا کہ
آپ نے میرے تخت کے سامنے سجدہ کیوں نہیں کیا اور دربارِ شاہی کے آداب کیوں ترک
کئے؟ جعفر ابن ابی طالب نے جواب میں کہا، ہم تو صرف اس ذات کو سجدہ کرتے ہیں جس نے
تجھے خلق فرمایا اور تاجِ شاہی کرامت عطا کیا۔ ہماری قوم بت پرستی کے دور میں اس قسم کی
غلطیاں کرتی تھی مگر خدا نے ہم میں اپنا ایک سچا نبیؐ مبعوث فرمایا ہے جس نے ہمیں سلام
کرنے کا طریقہ سکھایا جو اہلِ جنت کا طریقہ ہے۔ نجاشی سمجھ گیا کہ بات سچی ہے اس لئے کہ
توراۃ و انجیل میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ جعفر طیار نے نجاشی سے کہا کہ اپنے ساتھیوں
کیطرف سے صرف میں گفتگو کروں گا اور آپ ان لوگوں سے کہیئے کہ یہ بھی اپنے ایک ہی آدمی کو
گفتگو کے لئے منتخب کریں۔ چنانچہ عمرو ابن عاص گفتگو کے لئے تیار ہوا۔ حضرت جعفر نے کہا کیا
ہم غلام ہیں جو اپنے آقاؤں سے بھاگ کر یہاں آگئے ہیں؟

عمرو ابنِ عاص :- نہیں بلکہ آپ لوگ آزاد ہیں اور شرفاءِ قوم ہیں۔
جعفر طیار :- میرے ذمہ کوئی قتلِ ناحق ہے جس کا تم لوگ قصاص لینا چاہتے ہو؟
عمرو ابنِ عاص :- نہیں ہرگز نہیں، ایک قطرہ خون بھی آپکی گردن پر نہیں۔
جعفر طیار :- کیا ہم نے کسی کا مال چوری کیا ہے۔ جس کی ادائیگی ہم پر واجب ہے؟
عمرو ابنِ عاص :- نہیں۔
نجاشی :- پھر تم لوگ ان سے کس شئے کا مطالبہ کرنے کے لئے آئے ہو؟
عمرو ابنِ عاص :- یہ سب اور ہم لوگ ایک ہی دین پر تھے۔ لیکن یہ لوگ اپنا دین

چھوڑ کر ایک علٰحدہ دین پر چلے گئے۔ اس لئے ہماری قوم نے بھیجا ہے کہ آپ ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دیں۔

نجاشی :- تمہارا دین کیا ہے؟ اور ان لوگوں نے کون سا اختیار کر لیا ہے؟

اِس پر عمرو ابنِ عاص خاموش ہو گیا تو حضرت جعفر نے کہا، ہم جس پر پہلے تھے وہ دین شیطان کا تھا۔ اللہ سے کفر کر کے پتھروں کی پوجا کرتے تھے۔ اور اب جو دین ہم نے اختیار کیا ہے، وہ خدا کا دین ہے یعنی دینِ اسلام۔ جو خدا کے رسول اور خدا کی کتاب کے ذریعہ ہم تک پہونچا ہے۔ اور ہماری کتاب، حضرت عیسٰی کی کتاب کی طرح ہے۔ اور اُس کی تصدیق کرنے والی ہے۔ نجاشی نہایت ہی متحیرانہ انداز سے جعفر! یہ تو نے تو بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ پس فوراً ہی ناقوس بجایا گیا اور پادری اور راہب دربار میں حاضر ہوئے۔ نجاشی نے ان سے پوچھا، تمہیں اُس خدا کی قسم جس نے حضرت عیسٰی پر انجیل کو نازل فرمایا، بتائیے کہ کیا حضرت عیسٰی اور قیامت کے درمیان کوئی اور بھی نبی آنے والا ہے؟ پادری نے کہا، جی ہاں، ہمیں حضرت عیسٰی کی طرف سے بشارت دی گئی ہے کہ جو اِس نبی پر ایمان لائے گا گویا اُس نے میری تصدیق کی اور جس نے اس سے کفر کیا تو گویا اُس نے میرا انکار کیا۔ نجاشی نے حضرت جعفر سے متوجہ ہو کر کہا! تم لوگوں کو وہ نبی کیا بتلاتا ہے۔ کس چیز کا اَمر اور کس چیز کے نہی کا حکم دیتا ہے۔ حضرت جعفر نے جواب دیا، وہ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں معروف کا امر اور بُرائی سے نہی، ہمسایہ سے حُسنِ سلوک، صلۂ رحمی اور یتیم پروری سکھاتے ہیں۔ اور ہمیں صرف ایک خدا کی عبادت کا حکم دیتے ہیں جس کا کوئی شریک نہیں۔ نجاشی نے پھر کہا، اپنی کتاب میں سے کچھ سنائیے؟ جناب جعفر نے سورۂ عنکبوت اور سورۂ روم کی تلاوت فرمائی جس سے تمام درباریوں پر گریہ طاری ہو گیا اور انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ اِس پاکیزہ کلام کا کچھ اور حصہ بھی سنائیے۔ چنانچہ ان لوگوں کی خواہش پر آپ نے سورۂ کہف کی تلاوت فرمائی۔ عمرو ابنِ عاص جو اپنی جگہ پر انتہائی شرمساری کے ساتھ سر جھکائے ہوئے کھڑا

تھا، اس نے نجاشی کو بدظن اور غصّہ دلانے کی خاطر کہا، حضور یہ لوگ حضرت عیسٰیؑ اور ان کی والدہ ماجدہ کو بُرا کہتے ہیں۔ نجاشی نے جناب جعفر کو متوجّہ کرتے ہوئے کہا، آپ کا حضرت عیسٰیؑ اور ان کی مادرِ گرامی کے حق میں کیا نظریہ ہے؟ جعفرِ طیّار نے سورۂ مریمؑ کی تلاوت شروع کر دی جب حضرت عیسٰیؑ اور حضرت مریمؑ کا ذکر آیا تو نجاشی کہنے لگا۔ بخدا حضرت مریمؑ اور حضرت عیسٰیؑ کے حق میں یہ عقیدہ ہی درست ہے اور صحیح بھی، پس حضرت جعفرؑ اور آپ کے ساتھیوں سے کہا کہ آپ لوگ میرے مُلک میں بہ اَمن واَمان زندگی بسر کریں اور ابراہیمی گروہ پر کوئی تشدّد نہیں کیا جائے گا۔

عمرو ابنِ عاص :۔ اے نجاشی! ابراہیمی گروہ سے کون لوگ مراد ہیں؟

نجاشی :۔ یہی وہ لوگ ہیں اور انکا نبیؐ جس نے اِن لوگوں کو یہاں بھیجا ہے۔

یہ سنتے ہی تمام مشرکین کہنے لگے کہ "ملّتِ ابراہیمی" پر تو ہم لوگ ہیں۔ لیکن نجاشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور عمرو ابنِ عاص کا تمام مال نجاشی نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ تحفہ نہیں بلکہ تم لوگ مجھے رشوت دے رہے تھے، مجھے ایسے تحائف کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ جس خدا نے مجھے یہ مُلک عطا کیا ہے اس نے اس کے لئے مجھ سے کوئی رشوت نہیں لی تھی۔ حضرت جعفرؑ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے حبشہ میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی بلکہ ہم لوگ نہایت ہی اطمینان و سکون سے وہاں رہے اور مدینہ میں پروردگارِ عالم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ۔ الخ۔ لیکن عمرو ابنِ عاص نے اپنا مطالبہ (حضرت جعفر اور مسلمانوں کی واپسی) پھر دُہرایا جس پر نجاشی نے غصّہ کے عالم میں عمرو ابن عاص کو معہ تحائف کے نکلوا دیا۔ (تفسیرِ انوار النجف جلد ۵ ص ۱۵۷)۔

قارئین کرام غور فرمائیں کہ بنی اُمیّہ کو اسلام، پیغمبرِ خاتمؐ اور مسلمانوں سے کتنی شدید دشمنی ہے کہ وہ دیارِ غیر میں بھی مسلمانوں کو اَمن و سکون کی زندگی بسر کرتے ہوئے* پر تیار نہیں۔ بلکہ ان لوگوں کے قتل کر دینے کی طرح طرح کی سازشیں کر رہے ہیں اور کوئی بھی لمحہ اپنی شر پسندی کا ضائع

نہیں ہونے دیتے۔ لیکن عمرو ابنِ عاص کی تمام کافرانہ سازشیں، اسلام مٹانے کے جذبات اور تمام سیاسی تدبیریں، منافقانہ روش اور فکر و شعور کی تمام تر مدبّرانہ صلاحیتوں کو بنی ہاشم کے نوجوان فرد حضرت جعفر ابن ابی طالبؑ نے ناکام بنا کر رکھ دیا۔ اور عمرو ابنِ عاص نامراد بلکہ ذلیل و رسوا ہو کر ملک حبشہ سے لوٹے۔ ویسے تو حضرت جعفر بھی صحابی ہیں اور چند سال بعد عمرو ابنِ عاص بھی کفر کو ترک کر کے زمرۂ صحابہ میں شامل ہونے والے ہیں۔ تو کیا یہ دونوں جذبات و کردار، علم و فہم، معرفت و شعورِ دینی اور دین و دیانت کی مخلصانہ خدمت میں برابر اور ہم پلّہ قرار دیئے جا سکتے ہیں؟

تمام تاریخیں پڑھ جایئے اور "اناجیل" کا بھی مطالعہ کر جایئے، کبھی بھی کسی نبی اور ان کے ساتھیوں نے قزّاقی و رہزنی نہیں کی اور نہ ہی کسی لوٹ مار میں حصّہ لیا۔ مگر مسلمان مورخین و محدثین کی یہ گستاخانہ جرأت اور رسولِ اکرم کے حق میں بدترین توہین اور یہ جسارت بھی ملاحظہ ہو۔ "بدر کا واقعہ مسلمانوں کے بغیر قصد و ارادہ اور منصوبہ بندی کے واقع ہوا تھا۔ حضورِ اکرم اور تمام مسلمان اس جنگ کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ تو قریش کے اس بڑے قافلے کی سرکوبی کے واسطے مدینہ سے نکلے تھے جو شام سے آرہا تھا جس میں مالِ کثیر تجارت کا آرہا تھا اور جس کا امیرِ قافلہ ابوسفیان تھا، اس میں عمرو ابن عاص بھی شامل تھا۔ قافلہ تیس ۳۰ سواروں پر مشتمل تھا یہ لوگ جب بدر کے قریب پہونچ گئے تو حضورِ اکرم کو اطّلاع ملی، آپؐ نے صحابہ سے فرمایا وہ قافلہ آرہا ہے جس میں مالِ کثیر ہے اور دشمنوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ لہٰذا اس کی سرکوبی کے لئے چلو ممکن ہے حق تعالیٰ اس طرح تمہیں سامان عطا فرمائے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضورِ اکرم نے دُعا فرمائی کہ اے ربّ مسلمان پیادہ ہیں اپنے فضل سے انھیں سوار کر۔ یہ بھوکے ہیں ان کو شکم سیری عطا کر۔ یہ عریاں ہیں، انھیں لباس دے۔ یہ فقیر ہیں انھیں تونگری دے۔ چنانچہ جب یہ لوگ مدینہ منوّرہ میں واپس ہوئے تو ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جنھیں بہ کثرت اونٹ، کپڑے، رزق اور مال نہ ملا ہو۔" (مدارج النبوہ جلد ۲ ص ۱۴۱)۔

ظاہر ہے کہ یہ محدّث صاحب کی اپنی رائے نہیں بلکہ اس واقعہ کو انھوں نے بھی سابقہ کتب ہی سے اخذ کیا ہے۔ میں ان لوگوں سے جو عظمت ناموسِ صحابہ کا پرچار کرتے ہیں کیا دریافت کرسکتا ہوں کہ اس واقعہ سے کیا اصحابِ پیغمبرؐ کا لٹیرا اور قزاق ہونا ثابت نہیں ہوتا، کیا وہ واقعی اسی کردار کے حامل تھے؟ اور غضب تو دیکھئے کہ اس قزّاقی و رہزنی کی منصوبہ بندی خود آنحضرتؐ نے فرمائی (معاذ اللہ) اور وہ معاشرہ اور سماج جو عالمِ انسانیت ہی میں نہیں بلکہ عالمِ اسلام میں رہنما اور قابلِ تقلید تھا۔ اس کے تمام ممبر (معاذ اللہ) رہزنی و قزّاقی کے عادی دکھائے جارہے ہیں اور وہ بھی آنحضرتؐ کی سرپرستی میں۔ ؏

جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

وہ رہبرِ انسانیت، عدل پرور اور عدل پرست انسان جسے کافروں اور مشرکوں نے بھی باوجود دشمن ہونے کے امانتدار اور سچّا یقین کیا۔ لیکن مسلمان اس عدل پرور اور محافظ حقوقِ انسانیت شخصیت کو قزّاق و رہزن لکھ رہے ہیں۔ جیساکہ انبیاء و رسل علیہم السّلام کی بعثت ہی ان چار اصولوں کے نفاذ اور تحفّظ پر مبنی ہے۔ عدالت، مساوات اور حرّیت و حقوق کی پاسبانی۔ اگر معاذ اللہ بالفرض محال اس واقعہ کو صحیح گمان کربھی لیا جائے تو سرکارِ دوعالم کی حیثیت و منزلتِ نبوی، انسانی معاشرے میں کس مقام کی حامل ہوگی؟ حقیقت امر یہ ہے کہ اس بے بنیاد واقعہ کی اختراع بنی اُمیّہ نے اپنے باطلانہ دَورِ اقتدار میں کیا اور اُسے شہرت دی۔ جس سے ان کا مقصد ایک طرف تو اسلامی معاشرے میں پیغمبرِ اکرمؐ کی سیرت طیّبہ کی توہین اور اسے مشتبہ کرنا تھا۔ اور دوسری طرف بنی اُمیّہ کے سردار ابوسفیان کو مالدار ثابت کرنا تھا کہ تجارتی قافلہ اُسکا ساز و سامان لے کر آتا اور جاتا تھا۔ اور اس کے مالِ تجارت کو لوٹ کر انصارِ مدینہ نے اپنی مفلسی اور غربت کو دُور کیا، اور تیسری ایک سیاسی وجہ کی پردہ پوشی ہے کہ مدینۃ الرّسولؐ پر ابوسفیان نے کے اس جارحانہ حملہ کا جواز مہیّا کرنا ہے کہ وہ بلا وجہ مدینہ پر حملہ آور نہ ہوا بلکہ مسلمانوں نے اس کا تجارتی مال لوٹ لیا تھا، جس کی واپسی کے لئے ابوسفیان کو فوجی کارروائی کرنی

پٹی وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ ابوسفیان کی حیثیت اس قافلے میں ایک منتظم اور ہم شریکِ مال تجارت سے زیادہ نہ تھی۔ اور نہ ہی مسلمانوں نے اس تجارتی قافلہ پر حملہ کیا، اور نہ ہی اس کا مال لوٹا۔ بلکہ ابوسفیان مالِ تجارت کو مکّہ معظمہ میں اُتارنے کے بعد قریشِ مکہ کو ہمراہ لیکر مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ بنی اُمیّہ نے ابوسفیان کو بریّ الذمّہ کرنے اور مدینۃ الرّسول پر حملہ آور ہونے کے لئے ایک دلیل ایک جواز پیدا کرنے کی خاطر اس واقعہ کی نوعیت ہی کو تبدیل کر دیا۔ کیا مسلمانوں کے لئے یہ بے بنیاد اور توہین آمیز واقعہ قابلِ غور اور لائقِ توجّہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن حیرت و افسوس تو ہے ان مترجمین و ناشران کتب پر جو اس دَورِ ترقی میں بھی آنحضرتؐ کے بارے میں اِس قسم کے بے بنیاد اور توہین آمیز واقعات ترجمہ کر کے شائع کر رہے ہیں۔

جس غرور و تکبّر اور نخوت کے ساتھ کفّارِ قریش و بنی اُمیّہ نے مدینۃ الرّسول پر اَپنے زعمِ ناقص میں حملہ کیا تھا۔ قدرت نے ان کے تمام منصوبے خاک میں مِلا دیئے۔ کفّارِ قریش و بنی اُمیّہ انتہائی ذلّت آمیز شکست کے بعد پسپا ہونے پر مجبور ہوئے۔ بنی اُمیّہ کو بدر میں ایسی ناقابلِ تلافی جانی نقصان اٹھانا پڑا کہ جب ابوسفیان میدانِ جنگ سے ناکام و نامراد واپس مکّہ لوٹا تو اس نے حکم دیا کہ کوئی شخص اپنے مقتول پر نہ روئے گا اس نے رونے اور گریہ کرنے کی ممانعت اِس لئے کی تاکہ انتقامِ بدر کی آگ سرد نہ پڑ جائے، ورنہ اس سے قبل عربوں میں اپنے مُردوں اور مقتولین پر رونے کی ممانعت نہ تھی، اور نہ ہی اِسلام میں اس فطری جذبہ کے اِظہار پر کسی قسم کی پابندی اور ممانعت ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کفّارِ بنی اُمیّہ کی یہ سیرت (میّت پر نہ رونا) مسلمانوں نے کیونکر اپنا لیا۔ اور اسلام میں یہ کافرین بنی اُمیّہ کی سیرت اسلامی عقائد میں کیسے داخل ہو گئی؟ ہاں افراط و تفریط کی ممانعت ضرور ہے اور اسلام ایک عادلانہ روش کا دین ہے جو نہ زیادتی کی اجازت دیتا ہے اور نہ کسی فطری جذبے کے اِظہار پر پابندی عائد کرتا ہے۔ اس کے بعد اَبوسفیان نے دوبارہ مدینۃ الرّسول پر لشکر کشی کی اور میدانِ اُحد میں آنحضرتؐ نے اَنصار و

مہاجرین کے ساتھ بنی اُمیّہ اور قریشِ مکّہ کا مقابلہ کیا۔ لیکن صحابہ کرام کی ایک جماعت نے آنحضرتؐ کے ایک واضح حکم کو فراموش کردیا جس کی وجہ سے یہ حضور اکرم کی کامیاب فتح تقریباً شکست میں تبدیل ہوگئی۔ اس جنگ کے لئے ایک غلام حبشی کو مادرِ معاویہ (ہندہ) خاص کر تین شخصوں کے قتل پر اُبھارتی رہی۔ حضور اکرمؐ، حضرت علیؑ اور حضرت حمزہؓ۔ مگر حبشی نے آنحضرتؐ کے قتل میں کامیاب ہونے سے انکار کردیا کہ انھیں ہر وقت اصحاب اپنے گھیرے میں لئے رہتے ہیں اس لئے آنحضرتؐ پر میرا وار نہیں چل سکتا۔ اور حضرت علیؑ میدانِ جنگ میں انتہائی مستعد اور باخبر رہتے ہیں، انھیں بھی قتل کرنا سہل نہیں۔ رہے حمزہؓ تو یہ غصّہ اور طیش میں جب آتے ہیں تو ماحول سے بےخبر ہو جاتے ہیں، ایسے وقت ان پر وار کامیاب ہو جائے گا۔ اور ایسا ہوا بھی، حضرت حمزہؓ، حبشی ملعون ہی کے وار سے شہید ہوئے۔ مَیں جس امر کی طرف قارئین کی توجّہ مبذول کروانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کسی نے مسلمانوں کے ہی گروہ میں یہ مشہور کردیا کہ آنحضرتؐ قتل ہوگئے۔ اس خبر کے تصدیق کے لئے سب سے زیادہ بے چین ابوسفیان تھا۔ اور بار بار یہ لوگوں کے نام لے کر پوچھتا تھا کہ محمدؐ زندہ ہیں یا مر گئے۔ اِسے سب سے زیادہ بے چینی آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبّہ سے تھی۔ یہ آنحضرتؐ کی خبرِ مرگ سننے کے لئے انتہائی بے قرار تھا جس سے یہ امر واضح ہوا کہ مرگِ پیغمبرؐ کی تمنّا یہ بنی اُمیّہ کی دیرینہ خواہش رہی ہے مسلمانوں کا اس نظریہ سے نہ ہی کوئی تعلّق ہے اور نہ ہی وہ اس کیلئے بےچین اور فکرمند ہیں۔ اِسکے علاوہ مسلمانوں اور معیّتِ رسُولؐ میں عالمِ جہاد میں ایسے لوگ بھی شامل ہوا کرتے تھے جو مجاہد ہونے کے بعد بھی جہنّمی رہے۔ قزمان اِس جنگِ اُحد میں اِنتہائی بے دردی اور جانفشانی سے لڑا، آٹھ یا نو مشرکین کو بھی قتل کیا، جب شدید زخمی ہوگیا تو اسلامی کیمپ میں پہونچا دیا گیا۔ صحابہ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے اس کے جہاد کا ذِکر کیا تو جنابِ ختمی مرتبتؐ نے فرمایا، وہ جہنّمی ہے۔ زخم کی تکلیف وہ برداشت نہ کرسکا اور اپنے ہی سے

تیر سے اس نے اپنی رگ کاٹ دی جس کی وجہ سے اس کا سارا خون بہہ گیا اور پھر وہ مرگیا۔
(اس طرح وہ جنّت کے دروازے تک پہونچ کر جہنّم کا مستحق بن گیا۔ (تاریخ طبری جلد ۲
ص ۲۴۷)۔ اب اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ میں کیسے کیسے اور کن جذبات و
کردار اور صلاحیتوں کے حامل افراد شامل تھے۔ بہر طور فتح خیبر کے بعد اور فتح مکّہ سے قبل جب
ابوسفیان نقضِ عہد کے بعد تجدید عہد کے لئے مدینہ آیا تو حضرت اُمّ حبیبہ دخترِ ابوسفیان نے
پیغمبرِ اکرم کے بستر پر بھی اپنے باپ ابوسفیان کو یہ کہہ کر بیٹھنے نہیں دیا کہ "تو نجس یعنی مشرک ہے
اور یہ بستر پاک و پاکیزہ ہے"۔ کاش آج کے خارجی حضرات، ابوسفیان کے حق میں اسی کی بیٹی
حضرت اُمّ حبیبہ زوجۂ آنحضرتؐ کے برتاؤ ہی کو پیشِ نظر رکھ کر خلافت و ملوکیت میں جو فرق
ہے اُسے سمجھنے کی کوشش کرتے۔ جب باپ کا بسترِ رسُول پر بیٹھنا خود اُسکی لڑکی گوارہ نہیں کرسکتی
تو پھر خلافتِ رسُول جو حقیقت میں مرتبۂ نیابتِ الٰہیہ ہے اس عظیم اور دینی درجہ پر اس کی اولاد
کیونکر بٹھائی جاسکتی ہے جو بسترِ رسُول پر بھی بیٹھنے کے لائق و مستحق نہ ہو۔ اس کے بعد فتح مکّہ
کے وقت ابوسفیان، عظمت و منصب نبوّت پر ایمان نہیں لایا بلکہ مسلمانوں کی قوّت و
کثرت کو دیکھ کر ابوسفیان اور دیگر قریش و بنی اُمیّہ نے ہتھیار ڈالا تھا۔ نورانیتِ ایمان اور
بنی اُمیّہ یہ تو متضاد چیزیں تھیں، ہاں اقتدارِ اسلامیہ کیلئے بنی اُمیّہ نے اپنی گردنیں عارضی طور پر اور
مصلحتِ وقت کے تحت جُھکا دیں تھیں جیسا کہ خود ابوسفیان کی اس گفتگو سے ظاہر ہے۔
جو اس نے آنحضرتؐ کے چچا حضرت عباسؓ کے ساتھ کی تھی۔" ابوسفیان نے جب اسلامی لشکر
کی شان و شوکت کو دیکھا تو انتہائی حیرت کے ساتھ حضرت عباسؓ سے کہنے لگا! تمہارا بھتیجا
تو بہت بڑا بادشاہ ہوگیا ہے، جس پر حضرت عباسؓ نے اُسے ڈانٹ کر فرمایا کہ اے بدبخت یہ
بادشاہت نہیں بلکہ نبوّت ہے۔ تو اس نے کہا، چلو یہی سہی، لیکن ہے تو حکومت (اقتدار)
اور ابوسفیان کے یہ اقتدار و حکومت کے جذبات اس کی نسلوں میں اُترتے چلے گئے۔ آج
ابوسفیان نے ۸ھ ہجری میں آنحضرتؐ کی نبوّت کو بادشاہت، اقتدار و حکومت گمان کر رہا

ہے اور کل اس کی نسل میں یزید ابنِ معاویہ کا یہ عقیدہ ۶۱ھ ہجری میں سرِ حسینؑ کو دیکھکر ظاہر ہونے والا ہے کہ نہ کوئی وحی آئی اور نہ ہی کوئی فرشتہ آیا۔ بلکہ بنی ہاشم (آنحضرتؐ) نے اقتدار و حکومت کا ڈھونگ رچایا تھا۔ بہر طور اس کے بعد جب اسلامی لشکر کو جنگِ حُنین میں ابتدائی مراحل پر کچھ کامیابی حاصل ہوئی تو بنی اُمیّہ کہ جن کے دلوں میں اسلام سے دشمنی اور آنحضرتؐ سے کینہ و عناد پوشیدہ تھے وہ اس طرح ظاہر ہوئے کہ ابو سفیان خوشی میں "لاتؔ و ہبل" کو آوازیں دینے لگا اور نصاریٰ کے حق میں نعرے لگاتا رہا، لیکن جب حالات نے پلٹا کھایا اور مسلمانوں کی شکست کے آثار نمایاں ہوگئے اور یہاں تک کہ آنحضرتؐ کی معیت اور میدانِ جنگ میں صرف چار صحابی باقی رہ گئے جن میں سے تین بنی ہاشم اور ایک غیر بنی ہاشم صحابی حضرت عبد اللہ ابنِ مسعود میدانِ جنگ میں باقی اور ثابت قدم تھے تو ابو سفیان کے اسلام دشمنی کے جذبات، خوشی اور شادمانی مسلمانوں کی شکست خوردگی پر دوچند ہوگئی اور وہ کہنے لگا کہ اب ان کا بھاگنا سمندر سے پہلے ختم نہیں ہوگا۔ اور اسی طرح کے لاف و گزاف کے ساتھ طعن و تشنیع کرتا ہوا چلا کر کہتا رہا کہ مسلمانو! اب یہ تمہارا جادو (اسلام) باطل ہوگیا ہے۔ اور صفوان ابنِ اُمیّہ بھی اس کا اس اَمر میں ہم آواز و ہمنوا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں۔" (تاریخ کامل، ابو الفداء، الخمیس، ابنِ ہشام، سیرۃ النبیؐ جلد ۴۔ تاریخ طبری، تاریخ الامم الملوک اور ابنِ کثیر شامی وغیرہ)۔

آنحضرتؐ کے انتقال اور نصب خلافتِ حضرت ابو بکر کے وقت اَبو سفیان مدینہ میں نہیں تھا، جب یہ مدینہ آیا تو اسے اس نصب خلافت کا علم ہوا تو یہ اس اَمر پر انتہائی غضب ناک ہو کر کہنے لگا کہ وہ دونوں کہاں ہیں یعنی حضرت عباس اور حضرت علیؑ" اور پھر یہ سیدھے حضرت علیؑ کے پاس پہونچا اور کہنے لگا "خلافت بنی تیم میں جا رہی ہے۔ بخدا خلافت کا تم سے زیادہ کوئی مستحق نہیں۔ اپنا ہاتھ نکالو میں تم سے بیعت کرتا ہوں۔ اور اگر کسی نے مخالفت کی تو میں مدینہ کو سواروں سے اور پیدلوں سے بھر دوں گا۔ اگر حضرت علیؑ

کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو آج اسلام کا کیا حشر ہوا ہوتا، یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن حضرت علیؑ کا تدبّر و فراست اور ابوسفیان کے اِسلام کے ساتھ اس کے قلبی بُغض و عناد کی صحیح واقفیت، اس کے اِسلام دشمنی جذبات سے کماحقّہ، حضرت علیؑ کی آگاہی کا نتیجہ تھا کہ ابوسفیان نے اِسلام کو مٹانے کی خاطر جس شاطرانہ چال کی ابتداء کرنی چاہی تھی حضرت علیؑ نے اس سازش کو روبہ عمل نہ ہونے دیا۔ آپؑ، ابوسفیان کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں، اَبوسفیان! تو اِسلام اور مسلمانوں کا ہمدرد کب سے ہوگیا، تجھے اِسلام سے کیا سروکار؟ اگر تو خلافت کو میرا حق سمجھتا ہے تو مَیں اپنے حق کے لئے غیرحق کی مدد نہیں نہیں چاہتا۔ آپؑ نے اپنے موقف کی اس طرح وضاحت فرمائی۔ "اَے لوگو! فتنہ و فساد کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر خود کو نکال لے جاؤ، تفرقہ اور انتشار کی راہوں سے اپنا رخ موڑ لو، فخر و مباہات کے تاج اُتار ڈالو، (صحیح طریقۂ عمل اختیار کرنے میں) کامیاب وہ ہے جو اُٹھے تو بَر و بال کے ساتھ اُٹھے، ورنہ (اقتدار کی کرسی) دوسروں کے لئے چھوڑ بیٹھے اور اس طرح خدا کو (بدامنی سے) راحت میں رکھّے (اس وقت خلافت کے لئے کھڑے ہونا) یہ ایک (ایسا) گندہ پانی اور ایسا لقمہ ہے جو کھانے والے کے گلوگیر ہو کر رہے گا۔ پھلوں کو ان کے پکنے سے پہلے چُننے والا ایسا ہے جیسے دوسروں کی زمین میں کاشت کرنے والا۔ اگر بولتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ دُنیاوی اقتدار کے خواہاں ہیں اور خاموش رہتا ہوں تو کہتے ہیں کہ موت سے ڈر گئے ہیں۔ افسوس اب یہ (اسطرح کی باتیں کرتے ہیں) جبکہ مَیں ہر طرح کے نشیب و فراز دیکھے بیٹھا ہوں۔ خدا کی قسم ابوطالبؑ کا فرزند موت سے اتنا مانوس ہے کہ بچّہ اپنی ماں کے پستان سے بھی اتنا مانوس نہیں ہوتا۔ (ان میں کوئی وجہ میرے سکوت کی نہیں) البتّہ میرے سینے میں علم کے وہ اَسرار پوشیدہ ہیں کہ اگر مَیں اُنھیں ظاہر کردوں تو تم اِس طرح سے لرزنے اور کانپنے لگو جس طرح گہرے کنوؤں میں رسّیاں لرزتی اور کانپتی ہیں۔" (نہج البلاغہ حصّہ اوّل، خطبہ نمبر ۵ صفحہ ۸۷)۔

ابوسفیان کے ان تمام تر اسلام دشمن جذبات، بغض و عناد، قبائلی عصبیت اور اقتدار پرست ذہنیت سے مسلمان واقف تھے۔ لیکن جب حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کے مشورہ سے ابوسفیان کے بڑے بیٹے یزید کو شام کا گورنر مقرر کر دیا اور یزید کے بعد ابوسفیان کے دوسرے بیٹے امیر معاویہ حکومتِ شام پر مقرر ہوئے تو ابوسفیان کی اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں، فتنہ و فساد کی آگ یکلخت خاموش ہو گئی۔ کیا واقعی بنی امیہ (اپنی اقتدار پرستی کو فراموش کر کے) صحیح مسلمان ہو گئے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، بنی ہاشم اور اسلام کے خلاف دشمنی کی آگ بنی امیہ کے دلوں میں بظاہر سرد پڑ گئی تھی۔ مگر ختم نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ جس منزل اور اقتدار کے حصول کے خاطر ابوسفیان نے ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ منزل خود بخود ان کے قریب آ رہی تھی۔ اور اس منزل کی قربت کی پہلی سیڑھی ولایت شام تھی۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ اگر کسی شخص کے خباثتِ نفس کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو اس کا خوشی اور غم کے موقعوں پر بغور مطالعہ کرو۔ اس کے نفس میں چھپا ہوا شیطان تمہیں ظاہر بہ ظاہر نظر آ جائے گا۔ حضرت عمر کے دور تک تو ابوسفیان کے جذبات و ریشہ دوانیاں پردہ خفا میں چلی جاتی ہیں۔ لیکن جیسے ہی مجلسِ شوریٰ نے حضرت عثمان کو مملکتِ اسلامیہ کا تیسرا سربراہ مقرر کیا۔ جنگِ بدر کا ابوسفیان پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے حضرت عثمان کو جو مشورہ دیا، وہ یہ تھا۔ "اب بنی تمیم و عدی (یعنی حضرات شیخین) کے بعد حکومت تم کو ملی ہے، اسے گیند کی طرح نچاؤ اور اس کا مرکز صرف بنی امیہ کو قرار دو۔ اس کی قسم جس کی قسم .... کھاتا ہے۔ میں مدتوں سے اس حکومت کا امیدوار تھا اور اب تو یہ ہماری اولاد میں وراثتاً چلے گی۔ یاد رکھو خلافت ایک سلطنت ہے اس کے علاوہ جنت اور جہنم کوئی چیز نہیں۔" (الاستیعاب جلد ۴ صفحہ ۸۷ و شرح نہج البلاغہ جلد ۱ صفحہ ۱۳)۔

قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا کہ بنی امیہ کے اس بوڑھے سردار کے دل و

دماغ اور قلب و نظر پر کس حد تک اقتدار کا نشہ اور حکومت کا بھوت مسلط رہا کہ یہ مرتے
دم تک اسلام اور اقتدار پرستی میں فرق، نبوت و بادشاہی میں امتیاز بھی حاصل نہ
کرسکا۔ تو پھر یہ عظمت و احترامِ پیغمبر کے ساتھ اسلام کی روحانیت و نورانیت کو کیا
خاک سمجھ پاتا۔ جس بیباکانہ جرأت سے اس نے حضرت عثمان کی خلافت کو حکومت اور جنت
و جہنم کے عدم وجود کا اقرار کیا ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ یہ حشر و نشر اور
روزِ معاد کا بھی قائل نہ تھا، اس کے بعد یہ بھاگتا ہوا حضرت حمزہ کی قبر پر گیا اور لاتیں مار کر
کہنے لگا۔ "اے ابو عمارہ اٹھو، دیکھو جس حکومت و اقتدار کے لئے تم نے جہاد کیا تھا آج وہ
ہمارے بچوں (یعنی بنی امیہ) کے لئے کھیل بن گیا ہے۔" (صوت العدالت جلد ۳ ص ۲۰۸۔)
بنی امیہ اور بالخصوص ابوسفیان اور اس کی اولاد کے دل و دماغ اور قلب و نظر پر عفریت
اقتدار و حکومت کچھ ایسا مسلط ہوا کہ اس اقتدار پرستی کا نشہ اس کی نسلوں میں اترتا
چلا گیا۔ جس میں غرق و مدہوش ہو کر انھوں نے ہر اقدارِ اسلامی کو تباہ و برباد، اور دین
پرست اصحابِ رسول کو قتل کیا، حد تو یہ ہے کہ آلِ رسول کے کمسن بچوں تک کو بھوکا پیاسہ
ذبح کر ڈالا۔ اور پھر ان کے ظلم و ستم اور بغض کے انتقام کی آگ یہیں پر سرد نہیں ہوئی
بلکہ آلِ رسول میں بچوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے دربدر رسوا کرا کے اپنے پایۂ تخت
دمشق میں بلوا کر قید خانے میں بند کروا دیا۔

بنی امیہ کی رسول اور اسلام دشمنی اور اقدارِ اسلامی کی پامالی اور تباہی پر اسلام
کا ہر مفکر روتا ہوا گیا ہے۔ چنانچہ اسلام جب خلافت راشدہ سے گزر کر حدودِ ملوکیت میں
پہونچا تو اس کے اقدار کی تباہی و بربادی اور اس کے روئے زیبا کو کس حد تک مسخ کر دیا گیا
تھا، اسے مولانا مودودی صاحب کی تحریریں ملاحظہ فرمائیں:۔

"سب سے پہلا سر جو زمانۂ اسلام میں لے جایا گیا وہ حضرت عمار ابن یاسر (صحابیٔ
رسول) کا سر تھا۔ جو جنگِ صفین میں کاٹ کر امیر معاویہ کے پاس لایا گیا۔ دوسرا سر بھی

عمر ابن الحمق کا تھا جو کاٹ کر حضرت معاویہ کے پاس لایا گیا۔ پھر اُسے بر سرِ عام گشت کرانے کے بعد لے جا کر اُن کی بیوی کی گود میں ڈال دیا گیا۔ ایسا ہی وحشیانہ سلوک مصر میں حضرت محمدؐ ابن ابی بکر کے ساتھ کیا گیا' انھیں قتل کر کے ان کی لاش کو گدھے کی کھال میں رکھ کر جلا دیا گیا (یہ پہلے شہید کی میّت ہے جو جلائی گئی۔ وہ لوگ جو انھیں یعنی امیرِ معاویہ کو "خال المومنین" کے خطاب سے نوازتے ہیں وہ حضرت محمدؐ ابن ابی بکر کے بارے میں کیا کہتے ہیں کیا یہ "خال المومنین" نہ تھے؟ اور کیا اُمّ المومنین حضرت عائشہ کے بھائی نہ تھے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ صرف "خال المومنین" کا لقب یہ خارجی صرف امیرِ معاویہ کو عطا کرتے ہیں اور پھر "خال المومنین" کے رشتے سے حضرت محمدؐ ابن ابی بکر کو کس دلیل و جواز کی بناء پر علٰحدہ کر دیا گیا۔ اور پھر ان دونوں ماموؤں کا موقف اور درجۂ ایمانی کس منزل پر ہے؟ جبکہ ان میں سے ایک ماموں، دوسرے "خال المومنین" کا قاتل اور اس کی لاش کی توہین کرنیوالا ہے، طاھو)۔ بسرؔ ابنِ ارطاۃ جسے حضرت معاویہ نے پہلے حجاز و یمن کو حضرت علیؑ کے قبضے سے نکالنے کے لئے بھیجا، پھر ہمدان پر قبضہ کرنے کے لئے مامور کیا۔ اس نے یمن میں حضرت علیؑ کے گورنر عبید اللہ ابن عباس کے دو چھوٹے بچّوں کو ماں کی موجودگی (گود) میں قتل کر دیا' ان بچّوں کی ماں اِس صدمہ سے پاگل ہوگئی۔ بنی کنانہ کی ایک عورت جو یہ ظلم دیکھ رہی تھی، چیخ اُٹھی "کہ مردوں کو تو نے قتل کر دیا' اب ان بچّوں کو کس لئے قتل کر رہا ہے۔ بچّے تو "دورِ جاہلیّت" میں بھی نہیں مارے جاتے تھے۔ اے ابنِ ارطاۃ جو حکومت بچّوں اور بوڑھوں کے قتل اور بے رحمی و برادر کُشی کے بغیر قائم نہ ہو سکتی ہو اس سے بُری کوئی حکومت نہیں۔ اس نے دوسری زیادتیوں کے ساتھ ایک ظلمِ عظیم یہ بھی کیا کہ جنگ میں جو مسلمان عورتیں پکڑی گئی تھیں ان سب کو لونڈیاں بنالیا۔ امیر معاویہ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے اور سیاسی اغراض کے لئے شریعت کی حدیں توڑ ڈالنے کی جو ابتداء ہوئی تھی، ان کے نامزد کردہ جانشین یزید کے عہد میں بدترین نتائج تک پہنچ

گئیں "۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۷۶ تا ۱۷۹، بحوالہ طبری جلد ۴ ص ۷۹ و الاستیعاب جلد ۱ ص ۲۳۵ و ابن الاثیر جلد ۳ ص ۱۸۰ و ابن خلدون جلد ۲ ص ۱۸۲ و مسند ابن حنبل و طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۲۵۳ و البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۶۵ وغیرہ)۔

اب ایسی حکومتیں کہ جن میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہر چہار جانب برپا ہو، بغیر اس امتیاز کے کہ وہ مسلمان کس درجہ کا صحابی ہے اور زہد و تقویٰ، علم و معرفت کے ساتھ اس کی خدماتِ دینی کی حیثیت کس درجہ عظیم و ناقابل فراموش ہیں صرف حکومتوں کے غلط روش پر اعتراض، رسولؐ و آلِ رسولؐ کی محبت اتنا بڑا سنگین جرم تھا کہ یہود و نصاریٰ ان اسلامی مملکتوں میں تو انتہائی محفوظ اور امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن امان نہ تھی تو آلِ رسولؐ، اصحابِ رسولؐ اور متقی و پرہیزگار مسلمانوں کے لئے اس دورِ پُر آشوب کے جس کی بربریت و حیوانیت، ظلم و ستم پر چنگیز و ہلاکو کی روحیں حیرت زدہ ہیں۔ آج پاکستان میں ان ادوارِ سیاسی کو بھی اسلام کے "نشاطِ ثانیہ" کا نام دیا جا رہا ہے۔ ہر اُس شخصیت کو کہ جس نے جس نسبت سے خدا و رسولؐ کو اذیت دی اسلام کا استحصال کیا اُسے اسلام کا ہیرو قرار دیا جا رہا ہے، اب چاہے وہ مردوں میں ہو یا عورتوں میں۔ چنانچہ قاتلِ حضرت حمزہؓ یعنی حبشی ملعون سے کون واقف نہیں۔ لیکن اسے "حضرت حبشی رضی اللہ عنہ" لکھا جا رہا ہے۔ جب بنی اُمیّہ کے غلاموں کو تحفظات دینے کا یہ عالم ہے تو بنی اُمیّہ کے لئے ایسے اذہان و افکار کے حامل کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ جب بنی اُمیّہ میں بھی ان افراد کا معاملہ ہو جو صاحبانِ اقتدار و حکومت گزرے ہیں۔ مگر ایسا لکھنے اور کہنے والے افراد شاید یہ نہیں جانتے کہ آج کا نوجوان نہ غافل ہے نہ ہی جاہل۔ ابتدائی درجات سے لے کر جامعہ کی سطح تک تاریخ اسلام، مذہبیات اور نظریاتِ اسلامی کی کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ مجھے خارجیت کی اس تحریف اور اختراع سے کوئی فکر لاحق نہیں ہے اس لئے کہ ہماری وہ بنیادی کتابیں جو صرف عربی اور فارسی

زبانوں میں تھیں اور جن سے کل تک صرف علماء ہی مستفید ہوتے تھے آج یہ کتابیں اُردو میں منتقل ہوتی جا رہی ہیں اور ہر طالبِ علم ان سے باسانی استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔ اچھا ہے کہ یہ خارجی حضرات جو کچھ بھی یہ لکھنا چاہتے ہیں لکھیں اور قارئین اسے اصل کتابوں سے موازنہ کر کے دیکھ لیں کہ اصل کتاب میں ان کی ان تحریروں کی حقیقت کیا ہے، اور کس طرح سے یہ مَن مانی تاویلات، تحریفات میں کس حد تک بد دیانتی سے کام لے رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ احمقوں کی جنّت میں ابھی تک محبوس ہیں اور خود کو یہ بنی اُمیّہ کے باطلانہ دورِ اقتدار میں سمجھتے ہیں کہ ان کا لکھ دینا حرف آخر ہے یہ دَورِ علم و فکر کی روشنی اور جمہوریت کا دَور ہے ہر شخص اَب کیوں اَور کیسے؟ اور ۲ + ۲ مثبت ۲ + ۲ یعنی چار کا قائل ہے۔

"اٰلعمران" میں ارشاد ہوتا ہے کہ "خدا اس اَمر کا شاہد ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور فرشتے اور صاحبانِ علم جو عدل پر قائم ہیں۔ گواہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں، وہی غالب حکمت والا ہے۔" (اٰلعمران آیت نمبر ۱۷)۔ مَیں یہاں پر حدیثوں کو اس وجہ سے تحریر نہیں کرتا کہ ممکن رواۃ کے ثقہ اور غیر ثقہ یا پھر حدیث ہی پر بے اعتباری کا اظہار کر دیا جائے۔ صاحبانِ علم سے مراد رسُول اکرم اور آپؐ کے اصحاب میں نمایاں حیثیت سے حضرت علیؑ ہی اس آیت کے مصداق ہو سکتے ہیں اس لئے کہ خداوندِ عالم نے اپنی گواہی اَور فرشتوں کی گواہی کے ساتھ ایسے علماء کو گواہ قرار دیا ہے جو "عدل" پر قائم ہوں۔ اور عدل کے خلاف ظلم ہے یعنی جہاں عدل ہو گا وہاں ظلم نہ ہو گا، اور جہاں ظلم ہو گا وہاں عدل نہیں ہو گا۔ اور ظلم کیا ہے؟ اس کی قرآن (سورۂ لقمان) میں اس طرح وضاحت ہے کہ "خدا کا کسی کو شریک قرار نہ دو، اس لئے کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔" اب اس وضاحت کے بعد یہ اَمر واضح ہے کہ وہ لوگ جو کفر و شرک کو ترک کر کے اسلام میں داخل ہوئے وہ مسلمان اور مومن تو ہو سکتے ہیں لیکن پروردگار کے شاہد وہ ملائکہ کے ساتھ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اور اس فہرست (اُمّتِ محمدیہ) میں صرف

اور فقط حضرت علیؑ کی ذات ہے جو کفر و شرک کی آلودگی سے پاک و منزّہ رہی جیسا کہ تمام اسلامی کتب سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آپ مکلّف ہونے سے قبل عالمِ طفلی میں مسلمان تھے اور رسولِ اکرم کی رسالت کی گواہی دینے والے آپؑ پہلے شخص ہیں۔ چنانچہ سورۂ فاطر میں ارشاد ہوتا ہے کہ "خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں، یقیناً خدا زبردست بخشنے والا ہے۔" (سورۂ فاطر آیت ۲۸) چنانچہ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے کہ "خدا کے ساتھ سچا علم اُسے حاصل ہے جو اُس کی ذات کیساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ اُس کے حلال کئے ہوئے کو حلال، اور اُس کے حرام کئے ہوئے کو حرام جانے۔ اُس کے فرمان پر یقین کرے۔ اس کی وصیّت کی نگہبانی کرے۔" (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صہ ۷۸)۔

اِن آیاتِ قرآنی کی روشنی میں اب راسخون فی العلم کی وضاحت بہت آسان ہوگئی ہے۔ صاحبانِ علم وہ ہیں جو مشرک و کافر نہ ہوں۔ حدودِ الٰہی سے واقف ہونے کے ساتھ خدا اور ملائکہ کے ساتھ وہ بھی شاہد ہوں۔ اور راہِ عدل پر قائم ہوں تو ان کا شمار علماء میں ہوگا اور انھیں علماء میں درجہ بلند انھیں حاصل ہے۔ جو کامل علم رکھتے ہیں یعنی راسخون فی العلم ہیں۔ کتنی بڑی بدنصیبی اور اسلام کا یہ المیہ ہے کہ بعض مفسّرین (جو بنی اُمیّہ کے حامیوں میں تھے) اس کی تفسیر میں علماءِ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کو راسخون فی العلم کا مصداق قرار دیا ہے۔ چنانچہ تمام کتبِ اسلامیہ میں حضرت علیؑ کا یہ دعویٰ اب بھی موجود ہے کہ "لوگوں کے ایمان لانے سے برسوں قبل میں نماز گزار و‍ں میں شامل تھا اور میں غارِ حرا میں رسولِ اکرم کے ساتھ رہا جبکہ ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا انسان وہاں نہیں ہوتا تھا۔" علماءِ اہلسنّت نے اپنی تصنیفات میں راسخون فی العلم حضرت علیؑ اور ائمہؑ اہلبیتؑ کو ہی قرار دیا ہے۔ مولانا ولی اللہ فرنگی محل، اپنی "تفسیر" میں لکھتے ہیں: "حدیثوں میں آیا ہے کہ راسخون فی العلم بعد پیغمبرؐ ائمہؑ معصومین ہیں۔ اس لئے کہ صحابہ اور تابعین تمام

مشکلات اور متشابہہ احکام میں ائمہؑ معصومین ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور ائمہؑ معصومینؑ، دوسروں کی طرف ہرگز رجوع نہ کرتے تھے۔" (معدن الجواہر) اس کے علاوہ ازالۃ الخفاء مقصد دومؒ، ینابیع المودۃ، جمع الفوائد، ارجح المطالب اور الاستیعاب وغیرہ میں انس بن مالک، سلمان فارسی، سعید بن المسیّب، ابن عباس، اور ابن مسعود سے بھی روایت ہے کہ راسخون فی العلم کے ائمہؑ اہلبیتؑ مصداق و مراد ہیں۔

قرآن کریم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس کی ایک آیت دوسری آیت کے مصداق و معنی کی بھی تصدیق کرتی جاتی ہے۔ چنانچہ صاحبانِ علم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ" تجھ سے پہلے بھی جتنے پیغمبر ہم نے بھیجے سبھی مرد تھے جن کی طرف ہم وحی اتارتے تھے پس تم اہلِ کتاب سے پوچھو (پوچھ لو) اگر خود تمہیں علم نہ ہو تو۔" (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۳ سورۂ انبیاء آیت ۷، ص ۴) ۔ اب میں کیا کہوں اِس بے بسی اور بیچارگی پر کہ اہل ذکر کا ترجمہ ابنِ کثیر نے اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کیا ہے اور پیغمبرؐ کو حکم ہو رہا ہے کہ آپؐ ان سے پوچھیں، شہادت طلب کریں یعنی پیغمبرؐ سے بھی اہلِ کتاب (معاذ اللہ) زیادہ عالم تھے۔ یہ بغضِ علیؑ اور حبِّ معاویہ کی بدترین مثال نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ علیؑ کے ذکر کو چھپانے کی خاطر اہلِ کتاب کو رسُولِ کریم سے بھی (معاذ اللہ) بڑا عالم ثابت کیا جا رہا ہے لیکن سورۂ نمل میں ابنِ کثیر مجبور ہو گئے حضرت علیؑ کا نام لکھنے پر جہاں یہ آیت دُہرائی گئی ہے۔ مگر حضرت علیؑ کے نام اور ائمہؑ اہلبیتؑ کے نام کے ساتھ کچھ اور بنی ہاشم کے نام بھی شامل کر کے اس آیت کے مصداق کو مشتبہ کر دیا ہے، بہرطور ملاحظہ فرمائیں :۔

" تجھ سے پہلے بھی ہم انسانوں کو ہی بھیجتے رہے جن کی جانب وحی اُتارا کرتے تھے پس اگر تم نہیں جانتے تو یاد والوں سے دریافت کر لو۔" (سورۂ نمل آیت نمبر ۴۳)

ابنِ کثیر نے اہلِ ذکر کا ترجمہ سورۂ انبیاء کی آیت ۷ میں اہلِ کتاب کیا ہے اور سورۂ نمل آیت ۷ میں "یاد والوں" کیا ہے۔ اگر اہلِ ذکر کا ترجمہ ہی نہ کیا ہوتا، تب بھی کوئی حرج نہ تھا

لیکن اَہلِ ذکر کا ترجمہ اَہلِ کتاب اور "یاد والوں" کرنے کا صرف مقصد یہ ہے کہ اَہلِ ذکر کو پردۂ خفا میں رکھا جائے مگر جب آیت نے گلا پکڑ لیا تو اَہلِ ذکر کو مشتبہ کرنے کی خاطر کچھ ایسے نام بھی شامل کر دیئے کہ اَہلِ ذکر کی اَہمیت و عظمت اور امتیازی حیثیت مشکوک اور ناقابلِ ذکر ہو جائے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں:۔

" ابنِ عبّاس فرماتے ہیں کہ اَہلِ ذکر سے مراد اَہلِ کتاب ہیں۔ مجاہد کا قول بھی یہی ہے۔ عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ ذکر سے مراد قرآن ہے جیسے اَنَا نَحنُ نَزَّلنا الذِّکرَ" الخ میں ہے۔ یہ قول بجائے خود ٹھیک ہے۔ لیکن اس آیت میں ذکر سے مراد قرآن لینا درست نہیں کیونکہ قرآن کے تو وہ لوگ منکر تھے۔ پھر قرآن والوں سے پوچھ کر اُنکی تشفّی کیونکر ہو سکتی تھی۔ اِسی طرح امام اَبو جعفر باقر علیہ السّلام سے مروی ہے کہ ہم "اَہلِ ذکر" ہیں یعنی یہ اُمّت، یہ قول بھی اپنی جگہ درست ہے۔ فی الواقع یہ اُمت تمام اُمتوں سے زیادہ عِلم والی ہے اور اہلبیّت کے علماء دیگر علماء سے درجہا بڑھ کر ہیں جبکہ وہ سنّتِ مستقیمہ پر ثابت قدم ہوں جیسے علیؑ، اِبنِ عبّاس، حسنؑ، حسینؑ، محمدؑ بن الحنفیہ، علیؑ بن حسین (امام زین العابدین) علی بن عبداللہ ابنِ عباس، اَبو جعفر باقر یعنی محمد بن علی بن حسینؑ اور ان کے صاحبزادے جعفر اور ان جیسے اور بزرگ حضرات، خدائے تعالیٰ کی رحمت و رضا انھیں حاصل ہو۔" (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۳ ص ۲۳۶ سورۂ نمل آیت ۴۲) ۔ جہاں تک حضرت ابنِ عبّاس، محمّد بن الحنفیہ، علی ابنِ عبداللہ ابنِ عبّاس کا تعلّق ہے ان حضرات نے نہ ہی "راسخون فی العلم اور اَہلِ ذکر ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ ہی ان کا شمار اَئمۂ اہلبیّت میں تھا۔ حضرت ابنِ عبّاس سے جب یہ دریافت کیا گیا کہ آپ کے عِلم اور حضرت علیؑ کے عِلم میں کیا نسبت ہے؟ تو آپ نے فرمایا، علیؑ ایک علم کا دریا ہیں اور میری بساطِ علم (علیؑ کے مقابل) ایک قطرہ جیسی ہے۔ دوسری شخصیت عبداللہ ابنِ مسعود کی ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو حضرت علیؑ کا شاگرد کہتے تھے۔ قارئین حدیث کی کتابوں میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اَب اس منزل پر اگر ممدوح کا

قول پیش کر دیا جائے تو دعویٰ کی سند و دلیل واضح ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت علیؑ خود فرماتے ہیں کہ "اے لوگو مجھ سے دریافت کرو، قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ۔ یہ علم کا جوہر ہے، یہ رسُول کا لعاب دہن ہے۔ یہ علم مجھے جناب رسُولِ خدا نے اِس طرح بھرا ہے جس طرح پرندہ اپنے بچّے کو دانہ بھراتا ہے۔ تحقیق میرے پاس اوّلین و آخرین کا علم ہے۔ آگاہ ہو، اگر میرے لئے مسند بچھائی جائے اور مَیں اس پر بیٹھ جاؤں تو اہلِ توریت کو توریت سے ایسا فیصلہ کروں کہ توریت خود بول اُٹھے کہ علیؑ نے سچ کہا ہے، جھوٹ نہیں کہا ہے اور تمہیں وہی فتویٰ دیا ہے جو پروردگار نے مجھ پر نازل فرمایا ہے۔ اور انجیل والوں کو انجیل سے وہی فتوےٰ دوں کہ خود انجیل پکار اُٹھے کہ علیؑ نے سچ کہا ہے۔ اور قرآن والوں کو قرآن سے اس طرح فتویٰ دوں کہ خود قرآن شہادت دے کہ علیؑ نے سچ کہا ہے، جھوٹ نہیں کہا اور نہیں ایسے اَمر کا حکم دیا ہے جو خدا نے مجھ پر نازل فرمایا ہے۔ جبکہ قرآن شب و رُوز تم پڑھتے ہو۔ کیا تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو قرآن میں نازل شدہ تمام اُمور سے آگاہ ہو؟ سوال کرو مجھ سے قبل اس کے کہ میں تم سے جدا ہو جاؤں۔ مجھے دانے میں شگافتہ اور روح کو پیدا کرنے والے کی قسم ہے کہ اگر مجھ سے ایک ایک آیت کے متعلّق دریافت کرو۔ رات میں اُتری ہو یا دن میں، مکّی ہو یا مدنی، سفری ہو یا حضری، ناسخ ہو یا منسُوخ، محکم ہو یا مُتشابہہ، یا اس کی تاویل ہو، یا تنزیل۔ اَلبتّہ میں تم کو یہ سب بتا سکتا ہوں" (کتاب نہج البلاغہ)۔ حضرت علیؑ کے اس دعوئ علمی پر قرآن مجید کی متعدّد آیتیں شاہد ہیں، کہ حضرت علیؑ کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپنے یہہ دعویٰ مسجدِ نبویؐ کے منبر سے کیا، اس وقت ہزاروں کی تعداد میں صحابہ کرام موجود تھے لیکن کسی نے بھی حضرتؑ کے اس دعوے کی مخالفت اور تردید نہیں کی جو حضرت علیؑ کے صداقت کی بیّن دلیل ہے۔ اب میں اپنے موضوع "حیاتِ خیرُالبشر" کیطرف واپس آتا ہوں۔ آنحضرتؐ کے اِنتقال کے بعد بنی ہاشم میں جس شخصیّت نے سب سے پہلے اِنتقال

گیا - وہ خود سرکارِ دو عالم کی دختر حضرت فاطمۃ الزہراؑ ہیں - چنانچہ جب حضرت علیؑ معصومہؑ کی تدفین سے فارغ ہوئے تو آپ جناب ختمی مرتبت کی قبر کے پاس تعزیت کیلئے تشریف لے گئے اور آپ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں " یارسول اللہ! آپ کو میری جانب سے اور آپ کے پڑوس میں اترنے والی اور آپ سے جلد ملحق ہونے والی آپؐ کی بیٹی کی طرف سے سلام ہو - یارسولؐ! آپ کی برگزیدہ بیٹی کی رحلت سے میرا صبر و شکیب جاتا رہا - میری ہمت و توانائی نے ساتھ چھوڑ دیا - مگر آپؐ کی مفارقت کے حادثۂ عظمیٰ اور آپؐ کی رحلت کے صدمۂ جانکاہ پر صبر کر لینے کے بعد مجھے اس مصیبت پر بھی صبر و شکیب ہی سے کام لینا پڑے گا - جبکہ میں نے اپنے ہاتھوں سے آپ کو قبر کی لحد میں اتارا اور اس عالم میں آپ کی روح نے پرواز کی کہ آپؐ کا سرِ اقدس میری گردن اور سینے کے درمیان رکھا تھا - (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط) - اب یہ امانت پلٹائی گئی، گروی رکھی ہوئی چیز چھڑا لی گئی - لیکن میرا غم بے پایاں اور میری راتیں بے خواب رہینگی یہاں تک کہ خداوندِ عالم میرے لئے بھی اسی گھر کو منتخب کرے - جس میں آپؐ رونق افروز ہیں - وہ وقت آگیا کہ آپؐ کی بیٹی آپکو بتائیں گیں کہ کس طرح آپؐ کی امت نے ان سے ...... سلوک کیا .... آپؐ ان سے مکمل طور پر دریافت کیجئے اور تمام احوال و واقعات دریافت فرمالیں - یہ تمام مصیبتیں ان پر گزر گئیں - جبکہ آپ کو گزرے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا - اور نہ ہی آپؐ کے تذکروں سے زبانیں بند ہوئیں - اور آپؐ دونوں پر میرا سلامِ رخصتی ہو - نہ ایسا سلام جو کسی ملول و دلِ تنگ کی طرف سے ہوتا ہے - اب اگر میں (اس جگہ سے) پلٹ جاؤں تو اس لئے نہیں کہ آپؐ سے میرا دل بھر گیا ہے اور اگر ٹھہرا رہوں تو اس لئے نہیں کہ میں اس وعدے سے بدظن ہوں جو اللہ نے صبر کرنے والوں سے کیا ہے " (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲۰۰ ص ۵۴۲) -

اب حضرت علیؑ جیسے عالمِ دین کا رسول اللہ کو " یارسول اللہ کہہ کر سلام کرنا واقعات

کو مجملاً بیان کرنا اور یہ کہنا کہ تفصیل خود آپؐ کی صاحبزادی آپؐ کو بتائیں گی کہ اُن پر کیا گزری،
دوسرے یہ کہ حضرت علیؓ نے اس پورے "خطبہ" میں ایک جگہ بھی لفظ "موت" کو استعمال
نہیں فرمایا اور آپ اس طرح سے پیغمبرِ اکرم کو مخاطب فرماتے ہیں، جسطرح کوئی زندہ کو
مخاطب کرتا ہے۔ کیا حضرت علیؓ اس امر سے آگاہ نہ تھے کہ مُردہ سنتا نہیں؟ تو کیا حضرت
علیؓ نے جو یہ "سلام" پیغمبرِ خاتم کو کیا فعلِ عبث تھا؟ یا معاذ اللہ کم علمی کی بنا پر تھا؟ اب
ڈاکٹر عثمانی صاحب کی سُنیئے، آپ فرماتے ہیں "مُردہ بہر حال مُردہ ہے، سُننا سُنانا اس کے
بس کی بات نہیں۔ اِسے تو کوئی کچھ بھی نہیں سُنا سکتا، جوتیوں کی آواز ہو یا اور کوئی بات، چاہے
وہ اللہ کے آخری رسُول کیوں نہ ہوں" (کتاب عذابِ قبر ص۱۱ ڈاکٹر مسعود عثمانی، توحید
روڈ کیماڑی کراچی)۔ ڈاکٹر موصوف نے اس ضمن میں آیاتِ قرآنیہ درج کیں ہیں اور اسکی
غلط تاویل کی ہے۔ اِس پر انشاء اللہ اگلے صفحات پر مکمل بحث ہوگی، یہاں پر صرف یہ عرض ہے کہ
آپ کا مذہب اور عقیدہ تو سیرتِ صحابہ کا پابند ہے تو کیا حضرت علیؓ آپ کے صحابہ کرام سے
خارج ہیں؟ اگر نہیں تو حضرت علیؓ کو یہ علم نہیں تھا کہ رسُول کسی امر اور کسی بات کے سُننے کا شعور
نہیں رکھتے۔ یا تو حضرت علیؓ کے بارے میں اس گمانِ بد کو عقیدہ قرار دیں کہ صحابہ کو علمِ قرآن
حاصل نہ تھا اور وہ بھی حضرت علیؓ جیسی شخصیّت کو جنکے بعد تمام صحابہ کے عِلم و معرفت کی حیثیت و
منزلت نہ صرف یہ کہ مشکوک ہو جائے گی بلکہ عظمتِ صحابہ کلھم عدول کے قلعہ کی تمام دیواریں
بُنیادوں سے اکھڑ جائیں گی جس کے بعد پھر آپ یہ نہ کہہ سکیں گے کہ مجھے دینِ صحابہ کی معرفت
سے حاصل ہوا۔

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے وہ تمام آیتیں جو کفّار کے متعلّق نازل ہوئیں ہیں اور جو
بُتوں کی حالتوں اور صاحبانِ حیات کے درمیان بُتوں کی وضاحت کرتی ہیں۔ ان آیتوں کا
مصداق انھوں نے جناب رسالتمآب کی موت قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں۔
"اور اللہ کے علاوہ، وہ دوسری ہستیاں جن کو لوگ (حاجت روائی کے لئے) پکارتے ہیں

وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔ موت کے بعد وہ بالکل مردہ ہیں۔ ان میں جان کی رمق تک باقی نہیں ہے۔ انھیں اپنے متعلق بھی یہ تک معلوم نہیں کہ وہ کب (دوبارہ) زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے (النمل آیات ۲۰، ۲۱)۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب تشریح فرماتے ہیں کہ اس ارشاد میں کسی کا کوئی استثنیٰ نہیں، نہ انبیاء کا اور نہ اولیاء کا۔ اور جب وفات کے بعد کسی میں بھی جان کی ایک رمق تک باقی نہیں رہتی پھر حیات، سماع اور عرض اعمال کا اثبات کیسا۔ کتنے انبیاء ایسے ہیں جن کو حاجت روائی اور مشکلکشائی کے لئے پکارا گیا ہے۔ اگر انبیاء کی کوئی خصوصیت ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کو بیان کر دیتا اور اس طرح عام اعلان نہ کرتا کہ کسی مرنے والے میں بھی جان کی رمق باقی نہیں رہتی" (وفات النبیؐ ص ۲۳)۔ مجھے علم نہیں کہ انبیاء کرام اور اولیاء اللہ سے ڈاکٹر صاحب کو کیا نقصان پہونچا ہے کہ یہ ان عظیم شخصیتوں کے دشمن ہو رہے ہیں۔ ان آیات میں انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کے ذکر کا تو کہیں دور دور تک پتہ نہیں چلتا، اور نہ ہی آیتوں کے مصداق یہ حضرات ہیں بلکہ ان آیتوں کا اطلاق تو کسی عام مسلمان پر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چہ جائیکہ اس کا مصداق ڈاکٹر صاحب انبیاء و اولیاء کو قرار دے رہے ہیں۔ اور ترجمے میں بھی انھوں نے دیانتداری کو برقرار نہیں رکھا، اس میں تحریف کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ ترجمہ ملاحظہ فرمائیں "جن جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کئے ہوئے ہیں، مُردے ہیں زندہ نہیں، انھیں تو یہ بھی شعور نہیں کہ کب اُٹھائے جائیں گے (سورۂ نمل آیات ۲۰، ۲۱)۔ اب اس کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیے "جن معبودانِ باطل سے لوگ اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں وہ کسی چیز کے خالق نہیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ جیسے خلیل الرحمن حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا تم انھیں پوجتے ہو جنھیں خود بناتے ہو۔ درحقیقت تمہارا اور تمہارے کاموں کا خالق صرف اللہ سبحانہٗ تعالیٰ ہے۔ بلکہ تمہارے معبود جو خدا کے سوا ہیں جمادات ہیں، بے روح چیزیں ہیں وہ

سنتے، دیکھتے اور شعور رکھتے نہیں۔ انھیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ قیامت کب ہوگی؟ تو ان سے نفع کی امید اور ثواب کی توقع کیسے رکھتے ہو؟ یہ تو اس خدا سے ہونی چاہیئے جو ہر چیز کا عالم اور تمام کائنات کا خالق ہے" (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۳ صے ۲۸)۔ تو قارئین نے ملاحظہ فرمایا کہ ذکر بُتوں کا ہو رہا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے دِل کے پھپھولے کِس طرح سے پھوڑ رہے ہیں کہ زبردستی کھینچ تان کر بُتوں کے ذکر میں انبیاءِ کرام اور اولیاء اللہ کو شامل کر رہے ہیں ؏

خود بدلتے نہیں قرآن بدل دیتے ہیں ہوئے کِس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق (اقبال)

اور جبکہ پروردگار عالم نے جنابِ ختمی مرتبت کے لئے یہ فرمادیا ہے کہ وہ موت' اموات یا میّت نہیں بلکہ زندہ (احیاءؑ) ہیں تو پھر آخر یہ ضد کیوں ہے کہ پروردگارِ عالم کے حکم کی مخالفت میں اپنی من مانی تاویلات کر کے انبیاء و رُسل اور اولیاء اللہ کو مُردہ قرار دے دیا جائے۔ آخر ان حضراتِ کرام کے نظریۂ حیات سے ان لوگوں کو کیا تکلیف اور کیا نقصان پہونچ رہا ہے؟ جبکہ آنحضرتؐ کا' فرمان کفّارِ بدر کے مقتولین کے ضمن میں یہ تھا کہ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ یہ تم لوگوں سے بہتر طور پر میری باتیں سنتے اور سمجھتے ہیں ۔اس کے بعد پھر یہ کہنا کہ آپؐ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے، کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے تو ہمیں آنحضرتؐ کے فرمان پر اعتماد و اعتبار کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب نے سورۂ قصص کی آیت نمبر ۸۸ سے تمام انسانوں (کافروں) کیساتھ آنحضرت کی موت کا استدلال فرمایا ہے اور آیت کے صرف پانچ (۵) الفاظ لکھے ہیں۔ "کُلُّ شَیْءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجْہَہٗ ط یعنی ہر شئے فنا ہو جائے گی سوائے اللہ کی ذات کے"۔ (وفات النبیؐ صے) یہاں پر" وجہ "کا ترجمہ اللہ کی ذات بھی ڈاکٹر صاحب نے حصولِ غرض کی خاطر غلط کیا ہے۔ اس آیت کا مکمّل ترجمہ یہ ہے "اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارنا، بجز اللہ کے اور کوئی معبود نہیں، ہر چیز فنا ہونے والی ہے مگر اس کا مُنھ اسی کے لئے فرمانروائی ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤگے"۔ (سورۂ القصص آیت ۸۸)۔ علاّمہ ابنِ کثیر، مجاہد و

ثوری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ہر چیز باطل ہے مگر وہ کام جو خدا کی رضا جوئی کے لئے کئے جائیں ان کا ثواب رہ جاتا ہے۔ (ابنِ کثیر جلد ۴ صفحہ ۴۸۹) جب پروردگارِ عالم کی رضا کے تحت کیا ہوا محض "عمل" باقی رہ جاتا ہے تو جس نے پروردگارِ عالم کی خوشنودی اسکی پسند و مرضی اور رضا کی معرفت کرائی اور جس کی وجہ سے عملِ خیر اور پروردگار کی عبادت ہو رہی ہے خود اُسی کی ذات (یعنی آنحضرت کی شخصیت) فنا ہو گئی؟ آیت میں "کُلُّ شَیْءٍ ہَالِکٌ" کے بعد استثنیٰ موجود ہے۔ "اِلَّا وَجْہَہٗ" "تمام شئی فنا ہو جائے گی سوائے اس کی "وجہ" کے اور لفظِ وجہ پر، انشاء اللہ آگے بحث آرہی ہے میں یہاں پر "وجہ" کا کوئی ترجمہ نہیں کرتا۔ یہاں پر صرف اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ تمام اشیاء کے فنا میں "وجہ" کے لئے استثنیٰ موجود ہے یعنی "وجہ" اشیاء کے ساتھ فنا سے ہمکنار نہیں۔ اس لئے اس آیت سے بھی بالکلیتہ سرکارِ دو عالم کیواسطے فنا کی دلیل قائم نہیں کی جاسکتی۔

اس کے بعد پھر ڈاکٹر صاحب "سورۂ المؤمنون" کی آیت درمیان سے لکھ کر ترجمہ کر دیتے ہیں ملاحظہ ہو۔ "اِنَّکُمْ بَعْدَ ذَالِکَ لَمَیِّتُوْنَ ط ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ تُبْعَثُوْنَ۔" پھر اس زندگی کے بعد تمہیں موت آکے رہے گی اور اس کے بعد قیامت کے دن تم پھر اُٹھائے جاؤ گے (ترجمہ)۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب اس آیت کی اس طرح تشریح فرماتے ہیں۔ کہ معلوم ہوا کہ ہر مرنے والے کو قیامت کے دن اُٹھایا جائے گا۔ پھر قیامت سے پہلے مرنے والا اس قبر کے اندر کیسے زندہ ہو سکتا ہے۔" (وفات النبیؐ ص۳۳) جہاں تک قیامت سے پہلے زندگی کا تعلق اس کے متعلق تو شیعہ و سُنی روایتوں کے انبار ہیں جن کے انکار کی کوئی صحیح وجہ اور جواز موجود نہیں۔ لیکن یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی عادت کے مطابق صرف آیتوں سے اپنے مطلب کے الفاظ کا انتخاب کر لیا ہے ورنہ آیتوں کے تسلسل سے یہ امر واضح ہے کہ ایک انسان کئی منازل موت یعنی انتقال در انتقال کے بعد پیدا ہوتا ہے چنانچہ ملاحظہ فرمائیں:۔" یقیناً ہم نے انسان کو ایک بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا

پھر اُسے نطفہ بنا کر محفوظ جگہ میں قرار دے دیا۔ پھر نطفہ کو ہم نے جما ہُوا خون بنا دیا۔ پھر اس خون کے لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا کر دیا، پھر گوشت کے ٹکڑے سے ہم نے ہڈیاں پیدا کر دیں، پھر ہڈیوں کو ہم نے گوشت پہنا دیا اور پھر ایک اور ہی پیدائش میں پیدا کر دیا۔ برکتوں والا ہے وہ خدا جو سب سے اچھی پیدائش کرنے والا ہے۔ اس کے بعد تم سب یقیناً مر جانے والے ہو پھر قیامت کے دن بلاشبہ تم سب اُٹھائے جاؤ گے۔" (تفسیر ابن کثیر آیات ۱۱ تا ۱۶، سورۃ المومنون سے جلد ۳ صہ ۵)۔ اس آیت سے بھی مرگِ پیغمبرؐ کا استدلال صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس آیت سے ایک انسان کی تخلیق کے مختلف مدارج موت یا انتقالِ منازل کی وضاحت ہے اور اس میں ایک انسان کی مکمل تخلیق کی حالت سے قبل مختلف منازلِ انتقال کا ذکر ہے کہ کتنی منازل اموات سے گزرنے کے بعد انسان تخلیق کی آخری منزل سے ہمکنار ہُوا۔ لیکن ہر انسان ان تمام منازل سے نہیں گزرا۔ اس میں بھی استثنیٰ پایا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ نہ ہی حضرت آدمؑ کی طرح مٹی سے پیدا ہوئے اور نہ ہی آپ کسی مرد کے نطفہ سے پیدا ہوئے۔ اس لئے اس آیت میں عمومیت کے باوجود استثنیٰ موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ آیت میں قیامت میں اُٹھائے جانے کا ذکر ہے قیامت سے قبل زندہ کئے جانے کی نفی نہیں۔ پروردگارِ عالم کا واضح حکم ہے کہ جو کچھ تم نہیں جانتے وہ اہلِ ذکر سے پوچھو اور اہلِ ذکر "راسخونَ فی العِلم" ایک ہی گروہ کے لوگ ہیں جیسا کہ پچھلے صفحات پر ناظرین و قارئین کی نگاہوں سے گزرا۔ میں یہاں پر حیات قبل از قیامت کے بارے میں حضرت علیؑ کے ارشادِ گرامی کو پیش کرتا ہوں۔ حضرت علیؑ کی شخصیت تو متنازعہ شخصیت نہیں ہے اس لئے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ "قرآن علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ قرآن کے ساتھ ہے۔" (متفق بین الفریقین) چنانچہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ "اور مشایعت کرنے والے اور مصیبت زدہ (عزیز و اقارب) پلٹ آئے، تو اسے قبر کے گڑھے میں اُٹھا کر بٹھا دیا گیا، فرشتوں سے سوال و جواب کیواسطے۔ سوال کی دہشتوں اور امتحان کی ٹھوکریں کھانے کے واسطے۔ پھر وہاں کی سب سے بڑی

آفت کھولتے ہوئے پانی کی مہمانی اور جہنّم میں داخل ہونا ہے۔ اور دوزخ کی لپٹیں۔ اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تیزیاں ہیں۔ نہ اس میں راحت کے لئے کوئی وقفہ ہے، اور نہ سکون و آرام کے لئے کچھ دیر کے واسطے بچاؤ ہے۔ نہ روکنے والی کوئی قوّت ہے، نہ نہ اب سکون دینے والی موت، نہ تکلیف کو بھلا دینے والی نیند، بلکہ وہ ہر وقت قسم قسم کی موتوں اور گھڑی گھڑی کے (بنت نئے) عذابوں میں ہوگا۔ ہم اللہ ہی سے پناہ کے خواستگار ہیں۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۱ صفحہ ۲۲) ۔ اب حضرت علیؑ کے اس ارشاد کی روشنی میں مرنے اور قبر میں مدفون ہو جانے کے بعد بھی انسان کو دوبارہ زندہ کیا جاتا ہے اور فرشتوں کے (منکر و نکیر) سوالات کے جوابات اُسے دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ قیامت کے بعد کافروں پر دوران عذاب مختلف قسم کی کئی موتیں اور گذرتیں ہیں حضرت علیؑ کے الفاظ یہ ہیں۔" بَیْنَ اَطْوَارِ الْمَوْتَاتِ "۔ قسم قسم کی موتیں۔

ڈاکٹر صاحب! آپ چونکہ موت سے فنا کا تصوّر وابستہ کئے ہوئے ہیں اس لئے حقیقت امر اور واقعہ کی نوعیت آپ کے ذہن میں واضح نہیں ہو رہی ہے۔ لفظ "میّت" قرآن میں صرف مُردہ انسان یا فانی شخص کے لئے ہی نہیں آیا ہے۔ بلکہ زندہ اور سوئے ہوئے انسان کے لئے بھی آیا ہے۔" اے صاحبانِ ایمان بدگمانیوں کی کثرت سے بچو، یقیناً بعض بدگمانیاں گناہ ہیں، اور بھید نہ ٹٹولا کرو اور تم سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مُردہ بھائی (میتاً) کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ تم کو اس سے گھن آئے گی، اور اللہ سے ڈرو اور ڈرتے رہو بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔" (سورۂ حجرات آیت ۱۲) ابنِ کثیر نے غیبت کے ضمن میں متعدّد قول نقل کئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا، تم نے سلمان کے گوشت کا سالن کھا لیا جبکہ تم نے انھیں یوں یوں کہا (یعنی غیبت کی) اس پر یہ آیت نازل ہوئی " میتاً " اس لئے کہ وہ سوئے ہوئے تھے اور یہ ان کی غیبت کر رہے تھے۔" (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۵ صفحہ ۸۵) اور اِسے درمنثور سیوطی جلد ۶ صفحہ ۹۵ پر بھی

ملاحظہ فرمائیں :- اب جبکہ زندہ فرد کے لئے بھی قرآن نے لفظ "میت" کو اختیار و استعمال کیا ہے جو کہ خوابیدہ تھے۔ اور مُردہ و مقتول کے حق میں لفظ "میت" کے استعمال کو منع فرمایا ہے۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ڈاکٹر صاحب اس لفظ "میت" سے اتنے الرجک کیوں ہیں۔ اور انبیاء و رسل اور اولیاء اللہ کو موت کے گھاٹ اُتار دینے پر بضد کیوں ہیں آخر ان مقدّس شخصیتوں کی حیات سے ڈاکٹر صاحب کے کن مفادات کو نقصان پہونچ رہا ہے ؟ اور پھر رسُول کی اُمّت میں رہ کر رسُول کا کلمہ پڑھنے کے باوجود رسُول کی موت کے اس شدّت سے خواہاں کیوں ہیں ؟

عذابِ قبر میں ڈاکٹر عثمانی صاحب سورۂ البقر کی اس آیت کو پیش کرتے ہیں۔ "تم اللہ کے ساتھ کفر کا رَوَیّہ کیسے اختیار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے۔ اس نے تمکو زندگی عطا فرمائی۔ پھر وہی تمہاری جان سلب کرے گا۔ پھر وہی تمہیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے (سورۂ بقر آیت ۲۸)۔ سورۂ البقر کی اس آیت سے تو ثابت ہوا کہ زندگیاں تو صرف دو ہیں۔ آخر قبر دُنیا کی یہ تیسری زندگی آپ کہاں سے لے آئے تو چپ ہو جاتے ہیں اور بس" (عذابِ قبر ص ۱۵)۔ ظاہر ہے کہ یہ خطاب کافروں سے ہو رہا ہے اور آپ اس آیت کو عمومیت اس حد تک دے رہے ہیں کہ مومن و مسلم اور شہداء راہِ حق کے ساتھ کافرین کو بھی ایک ہی صف میں کھڑا کر رہے ہیں۔ جبکہ شہداء کے لئے لفظ "موت" کا استعمال و گمان بھی منع کر دیا گیا ہے تو اس طرح سے تو شہداء کی صرف ایک موت (پیدائش سے قبل) اور ایک ہی حیات (پیدائش کے بعد) قیامت تک کے لئے ثابت ہوئی۔ اب دوسری اور تیسری کا بھی یہاں یہ سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اگر بحث برائے بحث ہے تو پھر اس کا کیا جواب ہے آپ کے پاس ؟ حضرت علیؑ کے قول کے مطابق تین موت اور تین حیات کا تو ذکر ہوا اب اسے ابنِ کثیر کی تفسیر میں بھی ملاحظہ فرمائیں :- "کُنتُمْ اَمْوَاتاً" کہ تم اپنے باپوں کے پیٹھ میں مردہ تھے یعنی کچھ بھی نہ تھے۔

اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مار ڈالے گا یعنی موت ایک روز ضرور آئے گی، پھر وہ تمہیں قبروں سے اٹھائے گا۔ پس ایک حالت مُردہ پن کی دُنیا میں آنے سے پہلے پھر دوسری دُنیا میں مرنے کی اور قبروں کی طرف جانے کی۔ پھر روز قیامت اُٹھ کھڑے ہونے کی۔ ۲ دو زندگیاں اور ۲ دو موتیں۔ ابو صالح فرماتے ہیں کہ قبر میں انسان کو زندہ کر دیا جاتا ہے۔" (تفسیر ابن کثیر، جلد ۱، صفحہ ۸۸)۔ قارئین نے ملاحظہ فرمایا کہ اس طرح ۳ تین زندگیاں اور ۳ تین موتوں کا ذکر موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ خداوندِ عالم کا ارشاد ہے کہ مومن اور کافر کی حیات اور موت برابر نہیں۔ تو پھر یہ کفّار کی حیات و موت کو مومن اور شہداء کے مساوی قرار دینے کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے جبکہ پروردگارِ عالم کا حُکم ہے کہ "لَا یَسْتَوِیْ" برابر نہیں۔

اس کے بعد سورۂ مومن کی آیت ۱۱ سے اس طرح اِستدلال فرماتے ہیں "کافر کہیں گے کہ اے ہمارے رَبّ تو نے وَاقعی ہمیں ۲ دو مرتبہ موت اور ۲ دو دفعہ حیات دے دی۔ اب ہم اپنے قصوروں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے۔" ترجمہ سورۂ المومن آیت ۱۱" اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ بتائیے کہ ۲ دو زندگیوں اور ۲ دو موتوں کے بعد یہ تیسری زندگی اور یہ تیسری موت کیسی، تو سنبھل کر ارشاد فرمایا جاتا ہے کہ دیکھو کیا مُوسیٰ کے زمانے میں ایک مُردہ گائے کے ٹکڑے سے مار کر زندہ نہیں کیا گیا، کیا عیسیٰؑ مُردوں کو زندہ نہیں کر دیا کرتے تھے۔ اس شخص کی راکھ کو کیا اللہ تعالیٰ نے جمع کر کے زندہ نہیں کیا۔ جس نے اپنی اولاد کو وصیّت کی تھی کہ اس کی لاش کو جلا کر سمندر میں بہا دیں۔ کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ ۳ تین زندگیاں اور ۳ تین موتیں ہوتی ہیں۔ کہا جائے کہ یہ انبیاء کے معجزات اور اللہ کی کرشمہ کاری کی نشانیاں ہیں تو سَر ہلنے لگتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ روح کا تھوڑا سا تعلّق اس قبر والے مُردہ جسم سے بہر حال باقی رہتا ہے۔ پوچھا جائے کہ پھر قرآن کے اِس فرمان کا کیا ہوگا کہ قبر کے مُردے بالکل مُردہ ہیں، ان میں جان کی رمق تک باقی نہیں۔ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ (سورۂ النّمل آیت ۲۱) ۔۔۔ " عذابِ قبر صفحہ ۱۵"۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اِنتہائی بد دیانتی

سے اور تفسیر بالرّائے سے کام لیتے ہوئے "اَموات غیر اَحیاءٍ" قبر کے مُردے بالکل مُردہ ہیں۔ جان کی رمق تک نہیں ہے۔ کیا ہے، حالانکہ اس آیت کا تعلّق کسی بھی قبر کے مُردے سے نہیں ہے بلکہ یہ آیت پتھّروں کے بتوں کے لئے ہے اور انھیں کے لئے یہ ارشاد ہوا ہے کہ وہ مُردہ بے جان ہیں جن میں حیات نہیں۔ ڈاکٹر عثمانی صاحب کی دینی بددیانتی ملاحظہ فرمائیں کہ کس جرأت وجسارتِ بے دینی کے ساتھ قرآنی آیات کے ساتھ آپ تمسخر فرمائے ہیں۔

گر ہمیں مکتب است وہمیں مُلّا است ؏ کارِ طفلاں تمام خواہد شد

ملاحظہ فرمائیں، اَب جبکہ قرآن سے حضرت مُوسیٰ وحضرت عیسٰی کے وقت تین حیات اور تین مُمات یعنی اسی عالمِ آب وگل میں ایک انسان کا مرنے کے کئی دِنوں بعد دوبارہ زندہ ہوجانے کا ذکر موجود ہے اور پھر یہ قرآن کا ذکر ہے کوئی تاریخ یا حدیث یا تفسیر نہیں کہ بے اعتباری کی کوئی گنجائش ہو مگر کیا کہنا ڈاکٹر صاحب کے علم ویقین اور جذبۂ ایمانی کا کہ کس حسین طریقے پر معجزاتِ انبیاء اور اللہ کی کرشمہ سازی قرار دے کر اسے تسلیم کرنے سے اِنکار کردیا لیکن مَیں اپنے نوجوان دوستوں کی معرفت اور یقین کے لئے یہ عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت مُوسیٰ کے وقت جو مُردہ گائے کے ذریعے زندہ کیا گیا آخر تھا تو وہ مُردہ اور اسے تین حیات اور تین موت حاصل ہوئی۔ چاہے وہ معجزے کے ذریعہ ہی سہی، اسی طرح اس مرے ہوئے اور جلے ہوئے انسان کی راکھ جمع کی گئی اور اسے زندگی ملی۔ اَب یہ معجزہ کہیئے یا اَولیاء اللہ کے اختیار وتصرّف جو پروردگارِ عالم کی طرف سے انھیں عطا کیا جاتا ہے۔ اگر صرف دو موتیں اور دو ہی حیاتیں ہوتیں تو پھر پروردگارِ عالم حضرت مُوسیٰ اور حضرت عیسٰی کی زندگی میں متعدّد بار اس کے اظہار کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن میں اِس ذکر کی موجودگی سے ہی اس اَمر کی بیّن دلیل ہے کہ حیات وموت کی مختلف اور متعدّد منزلیں ہیں مسلمان وہ ہے جو قرآن پر ایمان لائے نہ یہ کہ تنقید کرے۔ چنانچہ تین موتوں کا مزید ذکر ملاحظہ ہو۔ "عبدالرّحمٰن ابنِ زید کا بیان ہے کہ (پہلے) حضرت آدمؑ کی پیٹھ سے انھیں پیدا کیا (باہر لایا) اور عہد وپیمان لے کر

بے جان کر دیا۔ پھر ماں کے پیٹ سے انھیں پیدا کیا۔ پھر دُنیاوی موت دی۔ پھر قیامت والے دِن ان کو زندہ کرے گا۔" (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۸۸)۔ اب کتنی مُوتیں اور حیاتیں اور اُن کی منزلیں ثابت ہوئیں۔ فنا اس کے بعد "رُوزِ اَلَسْت" کی پیدائش، اسکے بعد موت پھر پیدائش اسکے بعد پھر موت پھر قبر میں سوال و جواب حیات اور پھر موت پھر قیامت کے بعد حیات اس کے علاوہ موت سفرِ حیات کی منزلیں ہیں تو پھر اس میں حیرانی و پریشانی کیسی کہ کتنی منزلیں گزریں اور کتنی باقی ہیں۔ قرآن میں تو کئی مقامات ایسے بھی ہیں جہاں پر صرف ایک موت اور ایک ہی حیات کا ذکر ہے مثلاً "وہ ذات جس نے موت اور حیات کو خلق کیا"، (سورۂ مُلک)۔ یہاں پر تو صرف ایک حیات اور ایک موت کا ذکر ہے نہ دو، نہ تین، نہ چار۔ اور پھر حیات کا ذکر بعد میں ہے، موت پہلے ہے۔ تو اب اگر موت سے مراد "روزِ اَلَسْت" یا اس سے قبل کا عرصہ لیا جائے تو پھر حیاتِ دُنیا ہی پر ختم ہو جاتی ہے اور حیات سے مراد حیاتِ آخرت لی جائے تو ہمارا یہ دُنیاوی دورِ حیات نہیں، موت قرار پائے گا۔ اب کیا خیال ہے اس حیرانی و پریشانی سے کون نجات دے؟ اس لئے پروردگارِ عالم نے قرآن کے ساتھ مفسّرینِ قرآن کو بھی بھیجا ہے جنھیں کہیں "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْم" "اَہلِ ذکر" اور "مَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتَاب" کی حیثیت سے متعارف بھی کروا دیا تھا لیکن قوم کی بدنصیبی کہ تاویلِ قرآن ان سے حاصل کیا جو خود محتاجِ ہدایت تھے، وہ ہمیں کیا تعلیم دیتے سے

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (اقبال)

ڈاکٹر عثمانی صاحب، سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۳۴، ۳۵ سے رسُولِ اکرم کی موت کی دلیل اس طرح پیش فرماتے ہیں: "ہمیشگی تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لئے نہیں رکھی ہے۔ اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔" (سورۂ الانبیاء، آیات نمبر ۳۴، ۳۵) اِن آیت سے بھی پیغمبرِ اکرم کی موت ثابت نہیں ہوتی۔ آیت

میں اِستفہامیہ یعنی سوالیہ انداز ہے ۔" آپ سے پہلے میں نے کسی کو حیاتِ جاوید نہیں دی"
جب عالمِ تکوین میں بجز ذاتِ واجب اور سرکارِ دوعالم کے نور کے علاوہ کوئی تیسری مخلوق
تھی نہیں تو پھر ہمیشگی کی زندگی کس کو دی جاتی ۔ اس کے علاوہ جس کی نہ ابتدا رہو اور نہ انتہا
تو ایسی ذات صرف پروردگارِ عالم کی ہے کسی مخلوق کی نہیں ۔ آیت کو سمجھنے کے لئے صرف
ایک لفظ کو بدل دیا جائے تو مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے مثلاً قرآن ہم نے آپ سے
پہلے تو کسی کو بھی نہیں دیا" تو اس سے کیا اس امر کی نفی ممکن ہے کہ آپ کو بھی قرآن نہیں دیا ۔
اِس وضاحت کے بعد آپ غور فرمائیں کہ جنگِ بدر کے شہداء یقیناً حیاتِ جاوید کے حامل و
مالک ہیں اور یہ حضرات یقیناً آپ سے قبل درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور حیاتِ جاوید کے
مالک بنے تو پھر آیت کا مفہوم ہی خبط ہوجائے گا ۔ لامحالہ یہ ترجمہ ہوا کہ حیاتِ جاوید تو میں نے
آپ ہی کو دی ۔ آپ سے قبل میں نے کسی کو حیاتِ جاوید نہیں دی ۔ تو یہ لوگ جو آپ کی موت
کے خواہاں ہیں وہ کیا سمجھتے ہیں کہ " اگر آپ مرجائیں تو یہ لوگ ہمیشہ زندہ رہیں گے (جبکہ
ہر جاندار (نفس) کو موت کا مزہ چکھنا ہے" ۔ اگر آپ مرجائیں تو کیا یہ لوگ ہمیشہ زندہ رہیں گے
اِس میں کفّار کی حیات ابدی کی نفی ہے نہ کہ سرکارِ دوعالم کے موت (فنا) کی دلیل اور حیاتِ
جاوید کی نفی ۔

درحقیقت اس سے منشائے الٰہی حیاتِ پیغمبر کے عقیدے کی توثیق ہے اسی وجہ
سے اِرشاد ہوا کہ " اگر مرجائیں یا قتل ہوجائیں" ، جبکہ علمِ کردگار میں یہ امر تھا کہ پیغمبر انکی ناجائز
خواہشات اور تمنّا کے تحت نہ ہی قتل ہوں گے اور نہ ہی مریں گے ۔ اب رہا پیغمبر کے فنا
ہونے کا نظریہ تو اسے اس لئے مِلّت میں پھیلایا گیا کہ اس دین کو لاوارث قرار دیے دیا جائے
تاکہ قرآنی آیات کی من مانی تاویلات دین میں غلط قسم کے نظریات پر کسی کو لب کشائی اور
تنقید کی ہمت و جسارت نہ ہو ۔ اور اگر تاجدارانِ وقت اُلٹے پیروں اپنے آباؤ اجداد کے
اعمال و جذبات اور کردار عمل کی طرف بہ آسانی لوٹ جائیں ۔ جس کے بعد یہ اگر دیندار و نیک

بے بنیاد الزامات عائد کر کے انھیں قید و بند یا قتل کریں تو عامۃ النّاس اِسے بھی دینی خدمت اور انھیں دین پرست ہی سمجھیں۔ اَب اس آیت کو " اٰلعمران" کی متذکرہ بالا آیت کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں تو مطالب و معنی صاف اور آیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔
"یعنی محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسُول ہیں۔ ان سے قبل بھی بہت سے رسول گزر چکے۔ پس اگر یہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم اُلٹے پیروں لوٹ جاؤ گے" الخ"۔ جیساکہ یہاں پر بھی غیر یقینی جملہ " اگر مر جائیں یا قتل ہو جائیں"، کافر اور مشرکوں کے دِلی جذبات کی وضاحت کر رہا ہے کہ وہ لوگ آپؐ کی موت اور قتل کے خواہاں تھے۔ اِسی طرح سورۂ الانبیاء کی متذکرہ بالا آیت میں بھی " اگر تم مر گئے تو کیا یہ (کفّار) ہمیشہ زندہ رہیں گے"؟ یہاں پر کافرین اور مشرکین کے وجود، حیثیت اور انجام کی وضاحت ہے نہ کہ "مرگِ پیغمبرؐ" کے اثباتی پہلو اور فنا و موت کی دلیل۔ یہ خارجی حضرات جو اِن آیاتِ قرآنی سے "مرگِ پیغمبرؐ" کا اِستدلال کر رہے ہیں غلط ہے اور تاویل میں سراسر خطا ہے۔ اگر یہ صحیح فکر و شعور اور اِدراک سے کام لیتے تو انہی آیات سے حیاتِ پیغمبرؐ کا اثبات اور فنا کی نفی ثابت ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان آیات کو مرگِ پیغمبرؐ کی اِطّلاع و سَنَد پر گمان کر لیا جائے تو جیساکہ میں نے قبل میں عرض کیا ہے کہ پھر قرآن میں تناقص ثابت ہے جو ناممکن ہے۔ آج چودہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی علمائے یہود و نصارٰی باوجود کوشش بسیار کے قرآن میں نقص ثابت نہ کر سکے۔ لیکن اس دورِ حاضر میں خارجیت اور ناصبیت قرآن کی مَن مانی تاویل اور تفسیر بالرّائے کر کے اس میں بے بنیاد نقص ثابت کرنے کے لئے کوشاں نظر آرہی ہے۔ خداوندِ عالم مسلمانوں کو اس تفسیر بالرّائے اور تمسخر فی القرآن جیسے گناہ سے محفوظ رکھے۔ حقیقت اَمر تو یہی ہے کہ متذکرہ بالا آیتوں سے حضرت ختمی مرتبتؐ کی حیاتِ جاوید ثابت ہے۔ اَب اگر کسی کی عقلِ خام، بیمار فکر اس اَمر کا اِدراک نہ کر سکے تو حق و صداقت اور اعجازِ قرآنی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس لئے کہ قرآن ببانگِ دہل اِعلان کر رہا ہے۔ کہ اس کی صحیح اور (صحتمند) تاویل بعد خدا اور رسُول صرف " راسخون فی العلم " اَہلِ ذکر ہی جانتے

ہیں۔ اور یہ کہ جس امر سے تم واقف نہیں ہو اُسے اہلِ ذکر سے معلوم کرو۔ اس کے علاوہ ان دونوں ہی آیتوں میں لفظ "اگر" موجود ہے اور "اگر" کا اس جگہ پر استعمال ہوتا ہی جہاں پر صحیح علم نہ ہونے کی بناء پر حالات غیر یقینی ہوں اور کہنے والا بے خبر ہو۔ ان امور کا پروردگارِ عالم کے حق میں گمان بھی کفر ہے اس لئے کہ وہ علیم و حکیم بالذّات ہے اور واقعات و حالات اس کے حکم اور مرضی کے تابع ہیں۔ وہ حالات و واقعات کا محتاج و پابند نہیں۔ اب تک تو گفتگو مرگِ پیغمبرؐ کی نفی کے ضمن میں تھی، اب حیاتِ پیغمبرؐ کے اثباتی حیثیت میں بھی آیاتِ قرآنیہ پر غور فرمائیں "ہم نے آسمان و زمین کی خلقت کے وقت، اور نہ خود ان کی پیدائش کے وقت انھیں "شاہد" قرار دیا۔ اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا معاون نہیں بناتا" (سورۂ کہف آیت نمبر ۵) اس آیت میں گمراہوں کے زمین و آسمان کی خلقت میں گواہ نہ ہونے اور پروردگارِ عالم کے معاون نہ ہونے کی نفی ہے کہ گمراہ نہ شاہد ہیں نہ ہی معاون۔ مگر بالکلیہ نفسِ شہادت کی نفی نہیں ہے۔ اس سے دو امر واضح ہیں۔

(۱) گمراہ، بداعمالوں کے تخلیق آسمان و زمین کے وقت شاہد ہونے کی نفی۔

(۲) اور اسی کے ساتھ ہادیانِ کرام، اولیاءُ اللہ، انبیاء و رسل کے شاہد ہونے کے ساتھ پروردگارِ عالم کے امر میں معاون ہونے کا اعلان۔

یعنی گمراہ کنندہ معاون نہیں، تو ظاہر ہے کہ ہدایت کنندہ معاون ہیں۔ اسی وجہ سے انبیاء و رسل کی اطاعت، ان کی خوشنودی و اتّباع پروردگارِ عالم کی اطاعت و خوشنودی قرار دی گئی اور ان سے اختلاف و سرکشی کا مترادف ہے۔ تو اس وضاحت کے بعد لفظ "شاہد" کے معنی اور اس کے استعمال پر غور فرمائیں۔ فریقین کے علماء نے "شاہد" کے معنی "حاضر و ناظر" کیا ہے۔ چنانچہ احمد رضا خاں صاحب نے کنز الایمان میں اور عبدالحق محدّث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں "شاہد" کا ترجمہ حاضر و ناظر ہی کیا ہے، ملاحظہ ہو:۔

"اے نبیؐ ہم نے آپ کو گواہی دینے والا (حاضر و ناظر) بشارت دینے والا، اللہ

کے حکم کی طرف بُلانے والا، روشن چراغ بھیجا ہے۔" (سورۂ احزاب آیت ۴۶، مدارج النبوۃ جلد ۱ صفحہ ۱۲۳)۔ اس سے آپؐ کی دو حیثیتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک شرعی حیثیت "بشیر و نذیر" نیک اعمال کی ترغیب اور اس کی جزا میں جنّت و انعامِ الٰہی کی بشارت اور برائیوں سے ڈرانے والا۔ اس کی سزا و غضب پر متنبہ کرنے والا یعنی نذیر۔ لیکن آپؐ کی دوسری حیثیت "شاہد" یہ عالمِ تخلیق و تکوین سے متعلّق ہے۔ یعنی کائنات کی خلقت آپؐ کے مشاہدے میں ہو رہی تھی اور آپ بحیثیت گواہ و شاہد کے موجود تھے۔ اب اس عالمِ تکوین میں ارواحِ انبیاء کی تخلیق ہو یا انوارِ ملائکہ کی، لوح و عرش و کرسی ہو یا تخلیق آب و گِل، اب چاہے خلقتِ ارض و سما ہو یا حیات و ممات کی منزلیں، زمان و مکان (ماضی، حال، مستقبل) یا علم و جہل اور ان کی منازل غیب و شہود۔ اب جو کچھ بھی زمین و آسمان کے حدود کے درمیان میں ہے حضورؐ کے لئے شہود کی منزل میں ہے جس کیواسطے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "ہر شئے کا احصاد مَیں نے امامِ مبین میں کر دیا ہے۔" (سورۂ یٰسین)۔ یہاں امامِ مُبین سے قرآن مجید مراد نہیں ہے بلکہ شخصیّت ہے اور حضورِ انور سے بہتر و اعلیٰ اس آیت کا مصداق اور کون ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ تمام انبیاء و رُسل اور اوصیاء کرام و ائمہ کرام کے امام آپؐ ہی ہیں۔ اب اگر میرے اس عقیدے کو غلو یا باطل نہ قرار دیا جائے تو مَیں عرض کر دوں گا کہ دراصل توحید کا نظریہ بھی بغیر سرکارِ دو عالم کو شریک کئے ہوئے مکمّل اور خالص نہیں ہوتا جہاں تک توحیدِ الٰہی کا تعلّق ہے تو اس کے وجود، اس کی ابتداء و انتہاء کا کوئی علم نہیں اور جس کا وجود عالمِ تکوین یا عالمِ تخلیق کی ابتداء و ایجاد سے قبل ہی موجود تھا۔ ہر صفت جس کی ذات کے ساتھ ہے۔ مگر سرکارِ دو عالم کا وجود عالمِ تکوین و تخلیق کی انتہائی اوّلیت سے وجود میں آیا کائنات نہ تھی لیکن ایک وجود ممکن جو وجودِ واجب (اپنے خالق) کے سامنے سر بسجود اور حمد و ثناء میں مصروف بندگی تھا۔ اور اس ذات واجب الوجود اور تخلیق ذات ممکن الوجود کے سوا کب تک دوسری مخلوق زیورِ خلقت سے مزیّن نہ ہوئی، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

ہوسکتا ہے کہ کچھ ایسے اذہان جو ہر فعل اور عقیدے میں کفر و شرک کو تلاش کرنے کے عادی ہیں وہ میرے اس عقیدے کو بھی شرک کی عینک لگا کر نہ دیکھنے لگیں اسلئے عرض ہے کہ اسے عقل و فکر کی طہارت و معرفت کیساتھ آیاتِ قرآنی کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں تو انھیں عالمِ تکوین سے لیکر عرصۂ قیامت تک خدا کے ساتھ ہر منزل پر رسُولؐ ہی رسُولؐ نظر آئیں گے اب چاہے وہ اطاعتِ الٰہی کی منزل ہو یا عقیدہ و نظریات کا ذکر۔ بغیر شرکت رسُولؐ کے اُمّت کا کوئی بھی عمل اور عقیدہ قابلِ نہیں، یہاں تک کہ عفو و درگزر و بخشش کا اِمکان بھی بغیر رضائے مصطفٰےؐ کے ممکن نہیں۔ اور توحیدِ الٰہی، ذاتِ رسُولؐ کو شامل کئے بغیر ناقابلِ فہم ہے اور اسکی مرضی کے حصول کے حق میں ناقابلِ عمل ہی نہیں، محال و ناممکن ہے۔ اور اس امر و عقیدے کی ایکبار میں پھر وضاحت کردوں کہ ذاتِ واجب الوجود عالم و قادر، خالق و حکیم و دانا بالذّات ہے۔ وہ ناظر و شاہد بالذّات ہے یہ اِختیار و قدرت اس میں خارج سے داخل نہیں ہُوا۔ یعنی کائنات کی خلقت میں اسکے لئے پہلے سے کوئی مثال مشاہدے میں نہ تھی کہ جسکے مشاہدے کے بعد اشیاءِ عالم کو خلق کیا اور نہ ہی ان مشاہدات و تخلیق سے اسکے عِلم میں اِضافہ ہوا۔ اسکی تمام صفات و قدرت عین ذات ہیں جبکہ سرکارِ دو عالمؐ مخلوق ہیں، حادث ہیں۔ اور آپؐ کو علم و قدرت، اِختیار و تصرّف قدرتِ الٰہی نے عطا کیا، اور مشاہدے نے یقین و معرفت میں بلندی عطا کی۔ اب نور سے نور کی تخلیق ہوئی سرکارِ دو عالمؐ کے مشاہدے میں ہے۔ آگ، پانی، ہوا، مٹّی نے ترتیب پائی اور خلقت چلی، آپکے مشاہدے میں ہی۔ اور پھر آپؐ کے ہمراہ جنھیں قرآن نے "عالین" کہا وہ بھی دیکھ رہے ہیں۔ اب اگر منزلِ کُن پر حضرت آدمؑ کو دیکھا تو "فیکُوْنْ" کی منزل پر حضرت نوحؑ مشاہدے میں ہیں، اب اگر "کُن" کی منزل میں اُمّتِ موسٰی و عیسٰی نظر آئی تو اُمّتِ مسلمہ "فیکُوْنْ" کی منزل پر۔ اور جب اُمّتِ مسلمہ "کُن" کی منزل پر آئی تو قیامت "فیکُوْنْ" کی منزل پر دکھا دے رہی ہے جیساکہ آپؐ نے فرمایا "ہم اور قیامت ساتھ ساتھ ہیں"۔ اور اسی طرح کائنات میں "کُنْ فَیَکُوْنْ" کا عمل جاری ہے، اور اس کی تفسیریں، تعبیریں اور تصویریں بن رہی ہیں، اور گزر رہی ہیں اور قیامت تک یہ صدا ہے......

"کُن فَیَکُونْ" کائنات میں جاری وساری ہے بقولِ علامہ اقبال ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے گویا ۔ کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکُونْ

توجب کائنات ابھی تک اپنی تخلیق کی منازل سے گزر رہی ہے تو کائنات کی تخلیق کا شاہد (گواہ) ہی فنا ہوگیا (معاذ اللہ) اسے موت کھا گئی۔ محترم وفات النبیؐ کے پوسٹر لکھنے والے سرکارِ دو عالم کو اس کائنات کو لے کر عرصۂ محشر تک جانا ہے۔ اور جب سے بھی عمل کرنے والوں کا وجود ہے اور رہے گا۔ سرکارِ دو عالم ان پر بحیثیت شہید (حاضر وناظر) کے نگراں ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں:۔ "اور جب قیامت کے دِن تمام اُمّتوں کو ان کے شاہدوں کے ساتھ لائیں گے اور (اے رسُول) آپؐ ان تمام پر شاہد ہوں گے۔ اور ہم نے جو کتاب آپؐ پر نازل کی ہے اس میں وضاحت ہے ہر شئی کی۔ ہدایت ورحمت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لئے" (سورۂ نحل آیت ۸۹) ۔ قرآن کی اس آیت سے تو رسُول اکرم گزشتہ انبیاء و رُسل کی اُمّتوں پر شاہد (یعنی حاضر وناظر) تھے۔ تو پھر اپنی ہی اُمّت کے وقت آپؐ (معاذ اللہ) فنا ہوگئے۔ اب جبکہ قرآن کی روشنی میں آپؐ تخلیق کائنات کی ابتدائی منازل سے لیکر انبیاء و رُسل کے مبعوث ہونے اور قیامت میں دوبارہ اُٹھنے اور پھر حشر ونشر کی منزل پر شافعِ محشر کی حیثیت میں آنے تک حاضر وناظر ہیں۔ اور تمام اُمور آپؐ کی حضوری (مشاہدے اور علم) میں انجام پذیر ہورہے ہیں تو اس کے بعد پھر کسی کا یہ کہنا کہ وہ مُردہ بہر حال مُردہ ہے، سُننا سنانا اس کے بس کی بات نہیں۔ اِسے تو کوئی کچھ بھی نہیں سُنا سکتا۔ جوتیوں کی آواز ہو یا اور کوئی بات، چاہے وہ اللہ کے آخری نبیؐ ہی کیوں نہ ہوں،" معاذ اللہ، نقل کفر کفر نباشد۔

کتنی بڑی بے لگامی اور بدکلامی ہے یہ گفتگو سرکارِ دو عالم کی بارگاہ میں کہ "جوتیوں کی آواز" آنحضرتؐ کے لئے بھی لکھا جارہا ہے۔ کیا یہی عظمتِ مصطفےٰ کا مقام اور منزلت ہے؟ ان بدکلام مصنّفین کی نگاہوں میں اگر اسلام اور توحید پرستی اسی کا نام ہے تو آخر کفر کی کون سی منزل ہوگی؟ کیا اِس قسم کی گفتگو اور تحریر خدا و رسُول کی اذیّت کے مترادف نہیں؟

ایسے ہی لوگوں کے لئے ارشادِ ربّ العزّت ہے کہ " جو لوگ خدا اور اس کے رسُول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دُنیا و آخرت میں لعنت ہے خدا کی ۔ اور ان کے لئے نہایت ہی ذلیل عذاب ہے " (سورۂ احزاب آیت ۵۷) ۔ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے کہ " یہ آیت عام ہے کسی طرح بھی خدا کے رسُول کو کوئی تکلیف دے وہ اس آیت کے تحت ملعون ہے اور مُعذّب ہے اس لئے کہ رسُولُ اللہ کو ایذا دینی گویا خدا کو ایذا دینی ہے ، جس طرح آپؐ کی اطاعت عین اطاعتِ خدا ہے " (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۴ صفحہ ۳۵) ۔ اب کیا یہ بھی توحید پرستی کے لئے ضروری ہے کہ رسُول کو مُردہ ثابت کرنیکی خاطر " جوتیوں کی آواز کا " ذکر کیا جائے ، کیا اسے " قدموں کی آواز سے " واضح نہیں کیا جا سکتا تھا ؟ ؎

خِرد نے کہہ بھی دیا لَا اِلٰہ تو کیا حاصِل ٭ دِل و نظر جو مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اب اگر یہی ضد ہے کہ رسُول کی آواز مُردے نہیں سنتے ہیں تو ملاحظہ فرمائیں " مواہبِ لَدُنّیہ میں امام فخر الدّین رازی اور بیہقی دلائل النّبوۃ میں یہ واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضوؐر کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں اُس وقت ایمان لاؤں گا جب تک میری " مری ہوئی " لڑکی کو آپ دوبارہ زندہ نہ کر دیں گے ۔ حضوؐر اکرم نے اس کے قبر پر کھڑے ہو کر آواز دی (اے فلاں بنتِ فلاں) اُسی وقت لڑکی قبر سے برآمد ہوئی اور کہا " لبّیک و سعدیک یا رسُول اللہ " الخ " حدیث تک " ۔ حضوؐر اکرم کا مُردوں کا زندہ فرمانا متعدّد مرتبہ واقع ہوا ہے ۔ نیز پتھروں اور کنکریوں کا آپؐ کے دستِ مبارک پر تسبیح کرنا نیز حَجَرُالاَسود کا آپ کو سلام کرنا اور استن حنانہ کا آپؐ کے فراق میں گریہ وزاری کرنا ، مُردوں کے کلام سے زیادہ اَتم و اَبلغ ہے ۔ رہا حضرت عیسٰیؑ کا آسمان پر اُٹھایا جانا تو ہمارے نبیؐ کو شبِ معراج میں اس سے کہیں بالاتر مقامات پر لے جایا گیا ۔ اور وہاں تک کوئی بھی نہیں لے جایا گیا ۔ پھر آپؐ کو مزید درجاتِ عالیہ سے مخصوص فرمایا گیا ۔ مثلاً خلوتِ قدس میں مناجات کا سننا اور قسم قسم کے مشاہدات و کرامات سے سرفراز ہونا وغیرہ ۔ الحاصل تمام انبیاء و رُسل علیہم الصّلوٰۃ والتّسلیم

کو جتنے بھی فضائل و کرامات اور معجزات دیئے گئے تھے وہ تمام حضورؐ اکرم کی ذات ستودہ صفات میں بدرجۂ اُتم موجود ہیں۔" (مدارج النبوۃ جلد ۱ ص۲۱۷، از عبدالحق محدث دہلوی)

اَب بتائیں کہ کتنی موتیں اور کتنی زندگیاں ہوئیں اور یہ کہ مُردے آنحضرتؐ کا کلام سنتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ روح پیکر سے نکل جانے کے بعد دوبارہ اسی پیکر میں داخل ہوئی یا نہیں؟۔ تو برادرِ محترم! مشیتِ الٰہی کے رموز و نکات مصلحت اور اولیاء اللہ جو پروردگارِ عالم کے نمائندے ہیں، ان کے تصرفات و اختیارات کو ہماری فکرِ ناقص، نہیں سمجھ سکتی، کتنے افسوس کی بات ہے کہ دیگر اقوامِ عالم تو چاند و سورج پر کمند ڈال رہے ہیں اور مسلمانوں کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں کہ ان کا رسولؐ زندہ ہے یا مُردہ؟ اور وہ مُردوں کو اپنی آواز دے سکتا اور سُنا سکتا ہے یا نہیں؟۔ ہوسکتا ہے کہ منکرینِ حدیث متذکرہ بالا واقعہ کا انکار کردیں تو آیئے دیکھیں قرآن سمعِ موتی کے بارے میں کیا نظریہ پیش کرتا ہے۔" اور بہ تحقیق کوئی قرآن ہو کہ چلائے جائیں جس سے پہاڑ، یا شگافتہ کی جائے (طے کی جائے) زمین، یا کلام کریں اُس سے مُردے (تو وہ یہی ہے) بلکہ تمام اُمور اللہ کے قبضے میں ہیں" الخ (سورۂ رعد آیت ۳۰۔ تفسیر انوار النجف جلد ۸ ص۱۳۷) جس سے ثابت ہوا کہ جس کے پاس قرآن یعنی علمِ کتاب ہے وہ مُردوں سے بھی کلام کرسکتا ہے اور پہاڑوں کو بھی چلا سکتا ہے اور زمین کی مسافت بھی طے کرسکتا ہے آنحضرتؐ سے قبل انبیاءِ بنی اسرائیل نے بھی یہ تمام معجزات بالفعل کرکے دکھلائے لیکن قوم ایمان لانے کے بجائے انبیاء علیہم السّلام کی تکذیب کرتی رہی۔ جیسا کہ حضرت مُوسٰیؑ کے وقت مُردہ زندہ کیا گیا۔ حضرت سلیمانؑ کے وصی حضرت آصف بن برخیا نے تخت بلقیس آنِ واحد میں یمن سے منگالیا۔ جبکہ حضرت آصف نہ ہی یمن گئے تھے اور نہ ہی "ملکۂ سبا" سے آپ متعارف تھے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ آپ کو کتاب کا کچھ علم دیا گیا تھا (کتاب کا مکمل علم نہیں) جس پر آپ کے اختیار و تصرف کا یہ حال تھا کہ جو چیزیں لوگوں کے لئے غیب کی منزل پر تھیں ان کے لئے وہ شہود و حضور یعنی نظروں کے سامنے تھیں حضرت سلمان فارسی کا انتقال مدائن میں ہوا جبکہ (۳۵ھ) میں آپ مدائن کے گورنر تھے۔

حضرت علیؑ ظہر کے بعد مدائن تشریف لے گئے اور حضرت سلمان فارسی کی نمازِ جنازہ پڑھا کر واپس مدینہ آکر نمازِ عصر پڑھائی۔ آخر یہ اتنا طویل فاصلہ حضرت علیؑ نے کیونکر اس مختصر سے وقت میں طے کیا؟ کیا آپؑ (معاذ اللہ) جادوگر تھے؟ ہرگز نہیں یہ وہی اختیار و تصرّف ہے جو قادرِ مطلق اپنے اولیاءِ کرام کو عطا کرتا ہے اور جس کا ذکر اوپر آیات میں ہو چکا ہے۔ مزید اطمینان کیلئے ملاحظہ فرمایئے "کافر یہ کہتے ہیں کہ آپ رسُول نہیں ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ (میری رسالت پر) خدا کی اور اُس شخص کی گواہی کافی ہے جسے کتاب کا مکمّل علم دیا گیا ہے۔" (سورۂ رعد آیت ۴۳) اِس کی تفسیر میں علماء کے تین قول ہیں:-

(۱) اس سے خود مراد پروردگارِ عالم ہے۔

(۲) اولیاءِ اہلبیتؑ اطہار۔

(۳) عبداللہ ابنِ سلام اور جناب سلمان فارسی۔

پہلی توجیہ اس لئے غلط ہے کہ اس کا "عطف" اللہ پر ہے اور قاعدے کی رُو سے "معطوف" کو علیحدہ ہونا چاہیئے۔ دوسری یہ کہ اللہ کا ذکر گواہی کی حیثیت پہلے ہی موجود ہے پھر تکرار کی کیا ضرورت۔ تیسری توجیہ اس لئے باطل ہے کہ یہ "سورہ مکّی" ہے اور اہلِ کتاب میں مسلمان ہونے والے بعدِ ہجرت اسلام سے مشرّف ہوئے۔ اور عبداللہ ابنِ سلام بھی بعدِ ہجرت مشرّف بہ اسلام ہوئے اس لئے ان کی شہادت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس کے علاوہ اہلِ کتاب آنحضرتؐ کو رسول کب مانتے تھے جو آپؐ کی رسالت کی شہادت دیتے۔ اگر وہ آپؐ کو رسول مانتے ہوتے تو مسلمان نہ ہو جاتے اس وجہ سے من عندہ علم الکتاب کا مصداق اہلِ کتاب کو قرار دینا تاویل میں یقیناً خطا ہے۔ اب رہے جناب سلمان فارسی تو انھوں نے خود کو اس کا مصداق نہیں کہا۔ اب صرف دوسری توجیہ اور مصداق باقی بچتا ہے تو اس کے لئے علماءِ اہلسنّت کے ارشاد ملاحظہ فرمائیں:- "علّامہ سلیمان قندوزی حنفی نے **من عندہ علم الکتاب** کا مصداق حضرت علیؑ کو قرار دیا ہے۔" (ینابیع المودّۃ میں تفسیر معدن الجواہر جلد ۳، اور روح المعانی جلد "۴"

صفحہ ۲۰۳ وغیرہ سے اس آیت کا مصداق حضرت علیؑ کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:
"حضرت علیؑ سے سوال کیا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ ابن مریم مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے اور حضرت سُلیمانؑ ابن داؤدؑ، پرندوں کی بولی سمجھا کرتے تھے۔ کیا آپ کو یہ مرتبہ حاصل ہے؟ آپ نے فرمایا حضرت سلیمان ابنِ داؤد علیہ السلام، ہُدہُد کے غائب ہو جانے پر ناراض ہو گئے۔ ہُدہُد کو پانی کا علم تھا اور وہ اس اَمر میں رہنمائی کرتا تھا۔ سلیمانؑ کو علم نہیں تھا کہ پانی ہَوا کے نیچے موجود ہے، حالانکہ حضرت سلیمانؑ کی اطاعت میں ہَوا، اِنسان، جنّ اور حیوان موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ارشاد فرماتا ہے: "اگر اس قرآن کے ذریعے پہاڑ اپنی جگہ سے چلائے جائیں، اور اسکے ذریعے شہروں کا فاصلہ طے کر لیا جائے، اور مُردے زندہ کر دیئے جائیں (تو یہ تمام کام اللہ ہی کے لیے ہے) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے آسمان و زمین کی ہر غائب چیز کا ذکر کتابِ مبین میں موجود ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے چُن لیا تھا۔" اور ہم اس قرآن کے وارث ہیں، جس کے ذریعہ پہاڑ چلائے جا سکتے ہیں، شہروں کا فاصلہ قطع کیا جا سکتا ہے اور مُردوں کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔ اور ہم اس کتاب کے وارث بندے ہیں۔" (ینابیع المودّۃ صفحہ ۱۷، از علّامہ شیخ سلیمان قندوزی حنفی سنّی مفتیِ اعظم قسطنطنیہ) اسکے علاوہ ابنِ عباس، ابوسعید خدری، سعید ابنِ جبیر اور محمد ابن الحنفیہؒ وغیرہم سے بھی مروی ہے کہ اِس آیت کے مصداق حضرت علیؑ ابنِ اَبی طالب ہیں۔

مجھے اہلبیتؑ کرام کی فضیلت سے یہاں پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ مَیں صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اگر قرآن کا حقیقی عِلم کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ بھی مُردوں سے نہ صرف یہ کہ کلام کر سکتا ہے بلکہ مُردوں کو زندہ بھی کر سکتا ہے۔ اور قرآن کا علم سرکارِ دو عالمؐ سے بہتر کسے حاصل ہے تو پھر یہ کہنا کہ نبیِّ آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم مُردوں کو اپنی آواز نہیں سُنا سکتے یا مُردے آپؐ کی آواز نہیں سُن سکتے کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے، اور یہ کتنی بڑی توہین و گستاخی ہے۔ بارگاہِ خدا و رسُولؐ میں۔ پروردگارِ عالم اس بے دین جسارت اور شیطانی وسوسوں سے مسلمانوں کو

محفوظ رکھے۔ اِرشاد باری تعالیٰ ہے کہ "ہم تجھے یہاں سے لے بھی جائیں تو بھی ہم ان سے اِنتقام لینے والے ہیں یہ جو وعدہ ان سے کیا ہے وہ تجھے دِکھا دیں گے، یقیناً ہم اس پر بھی قدرت رکھتے ہیں" (سورۂ زخرف آیت ۴۱) ۔تفسیر ابنِ کثیر نے حضرت قتادہ سے روایت کی ہے اللہ کے نبیؐ دُنیا سے اُٹھائے گئے اور انتقام باقی رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو آپکی اُمّت میں وہ معاملات نہ دِکھائے جو آپ کو ناپسندیدہ تھے۔ بجز حضورؐ کے تمام انبیاء کہ ان کی اُمّتوں پر عذاب آئے۔ ہم سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب حضورؐ کو یہ معلوم کرایا گیا کہ آپؐ کی اُمّت پر کیا کیا وبال آئیں گے۔ اس وقت سے لے کر وصال کے وقت تک کبھی حضورؐ کھِل کھِلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھے گئے" (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۵ صفحہ ۳۵) ۔سرکارِ دو عالم کے رنج واندوہ کی وجہ جو تاریخ و تفسیر اور قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ بنی اُمیّہ کا اقتدارِ دُنیا ہے۔ جیسے پروردگارِ عالم نے اپنے حبیبؐ کو ایک خواب کے ذریعہ مطّلع فرمایا اور آپؐ نے بنی اُمیّہ کو بندروں کی شکل میں اپنے منبر پر کودتے پھاندتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کے بعد آپؐ اپنی حیات دنیا میں پھر کبھی نہیں مُسکرائے۔ ویسے تو بعدِ رسُولؐ جنگِ جمل وصفّین اور نہروان واقع ہوئیں لیکن اس میں کوئی ایسا امر بظاہر نہیں دِکھائی دیتا کہ جس کا اِنتقام پروردگارِ عالم پر لینا واجب ہو۔ اس لئے کہ اِن جنگوں میں طرفین مدِّمقابل ہوئے۔ قتل کیا اور قتل ہوئے اور جو باقی بچے وہ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ بعدِ رسُولؐ سوائے کربلا کے سانحۂ عظمیٰ کے کہ ایسا عظیم واقعہ تاریخ آدم و عالم میں نہیں ملتا کہ جس میں جہادِ حق کرنے والوں میں بچّوں اور عورتیں تک شامل تھیں اور اس سانحۂ عظمیٰ میں سرکارِ دو عالم کے گھرانے کے کمسن بچّوں کو بھی قتل کیا گیا تاکہ نسلِ رسُولؐ میں آپ کا نام لینے والا بھی باقی نہ رہے۔ خداوندِ عالم کا خود ان لوگوں سے اِنتقام لینے کا مقصد بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا قصاص و انتقام لینے والا کوئی نہ تھا اور واقعہ اتنا عظیم اور شہادت پانے والے بے گناہ و بے قصور تھے اور اس واقعہ کا تعلق عظمتِ اسلام اور عظمتِ مصطفٰے سے متعلّق تھا۔ تو سوائے کربلا کے واقعہ کے مجھے کوئی ایسا عظیم اور ظلم و بربریّت کا شکار واقعہ نہیں ملا' اِسے پروردگارِ عالم

نے بھی قرآن میں فتح عظیم سے موسوم کیا ہے اور فرمایا کہ میں نے اسے آخر زمانہ یعنی آخری اُمّت کا مقدّر قرار دیا ہے۔ کربلا میں امام عالی مقام کی شہادت درحقیقت شہادتِ مصطفٰے ہے۔ اور یہ شہادتِ عظمٰی بھی نواسے کی معرفت آپؐ کو ہی حاصل ہوئی۔ اسے علماءِ اہلسنّت کے تحریر کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے۔ "باقی رہا کمال شہادت کا کہ آپؐ کو بذاتِ خاص نصیب نہ ہوا۔ اس کے ہونے میں فتنہ تھا کیونکہ شہادت دو قسم کی ہے۔ ایک سِرّی یعنی زہر وغیرہ سے مارا جانا، یہ ادنیٰ درجہ شہادت ہے اس واسطے آپؐ کو نہ دی۔ دوسری شہادت جہری، وہ یہ ہے کہ مارا جائے آدمی مسافرت اور تکلیف میں اور کاٹے جائیں جانور اس کے اور پھینکی جائے لاش اُس کی۔ اور ماری جائے اولاد اور بھائی اس کے۔ اور لُوٹا جائے مال اُسکا اور قید کی جائیں عورتیں اور کٹے جائیں بچّے یتیم اس کے، اور یہ سب حال ہو اس کا واسطے رضائے الٰہی کے ہو پس اگرچہ یہ اعلیٰ درجہ شہادت کا ہے مگر اس کے ہونے میں کفّار کو خوشی ہوتی اور مسلمانوں کے دل ٹوٹ جاتے۔ اور موجبِ دین میں خلل کا ہونا اس واسطے یہ بھی مناسب نہ ہوا۔ پس حکمت الٰہی یہ ہوئی کہ دیجئے یہ کمال بھی آپؐ کو بعد آپ کی وفات کے اور بعد مقتضی ہونے خلافتِ راشدہ کے وہ مدّت بھی حکم نبوّت میں تھی بواسطہ آپؐ کے دونوں صاحبزادوں کے۔ پس نائب کیا حق تعالیٰ نے ان دونوں کو اپنے حبیبؐ کا اور کیا ان دونوں کو آئینہ آپؐ کے جمال کا کہ بیٹا فرمایا ہے ان دونوں کو رسُول اللہ نے اپنا کہ جب پیدا ہوئے جب عنایت ہو چکا خلعتِ شہادت قسمِ اوّل جو سِرّی تھا۔ جناب رسالتمآبؐ کو بواسطہ حضرت امام حسنؓ کے جو بڑے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کے تو اس کے بعد عطا ہوا خلعتِ جہری کا بواسطہ حضرت امام حسینؓ کے جو چھوٹے فرزند دلبند تھے آپؐ کے، اور جیسا کہ شہادت سِرّی بکمال آپکو نصیب ہوئی ویسے ہی شہادتِ جہری بھی خوب کمال کے ساتھ مرحمت ہوئی۔ اب سنئے وجہ اس کے جہری ہونیکی (۱) خبر آئی اس کی آسمان سے بذریعۂ وحی کے لائے جبرئیلؑ۔ (۲) اور فرشتے بھی اس کی خبر آپؐ کو دے گئے۔ (۳) بار بار وحی کا آنا اس مقدّمہ میں۔ (۴) بتایا گیا مقام شہادت کا وحی

میں کہ وہ کربلا ہے۔ (۵) بتایا گیا زمانہ اس کا آنحضرت کو کہ وہ سالہ ۶۱ ہجر ہوگا۔ (۶) یہ کہ حضرت علی علیہ السلام نے سفرِ صفّین میں بوجہ الہام یا بسبب تعلیم فرمانے حضرت نبوی کے خبر دی۔ (۷) خون ابلا زمین سے۔ (۸) خون برسا آسمان سے۔ (۹) جنّات کے رونے کی آواز آئی۔ (۱۰) شیروں نے حفاظت کی لاش مبارک کی۔ (۱۱) داخل ہوئے سانپ انکے قاتلوں کے ناک میں۔ (۱۲) چلا آتا ہے یہ غم امّت میں وقت شہادت سے آج تک۔

(محمد عبد الرّب ابن محمد عبد الخالق حنفی القادری دہلوی۔ مرج البحرین فی ذکر شہادۃ الحسین ص ۲۷)

یہ اتنا عظیم اور دلسوز واقعہ ہے کہ کائنات میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی جس میں خود رسُول کے گھرانے کے کم عمر اور کمسن بچّے بھوکے، پیاسے ذبح کر دیئے گئے۔ اور غضب تو دیکھئے کہ کسی اُمّت میں ایسی بدترین مثال نہیں ملتی کہ صرف اقتدارِ دنیا کی خاطر بعدِ نبیؐ اُمّت والوں نے اپنے نبی کے گھرانے کی عورتوں اور بچوّں پر اس بدترین حیوانیت و درندگی و بربریت کا برتاؤ کیا ہو کہ جس میں پردہ نشین نبی زادیوں کو غلاموں اور کنیزوں سے بھی بدتر حالت میں بے پردہ شہروں اور بازاروں، درباروں میں تشہیر کرنے کے بعد قید خانوں میں لے جاکر بند کر دیا گیا ہو۔ اسی عظیم واقعہ کی طرف پروردگارِ عالم اپنے حبیبؐ کو متوجّہ فرمارہا ہے کہ ہم آپؐ کو دُنیا سے لے بھی گئے تو بھی یہ دکھا دینگے کہ ان سے اِنتقام کیونکر لیا جائے گا۔ اور یہ اِنتقام کسی حد تک بنی عباس نے بنی اُمیّہ کے تاجداروں سے لیا کہ انھوں نے اِنکے حکمرانوں کو نہ صرف یہ کہ قتل کیا بلکہ حکمرانوں (سابق) کی لاشیں اور ہڈّیاں بھی قبروں سے نکال کر نذرِ آتش کر دیں۔ اور یہ یعنی بنی عباس، آنحضرت کے قبیلہ بنی ہاشم ہی کی ایک شاخ ہیں لیکن اِقتدار و حکومت کے مستحکم ہو جانے کے بعد انھوں نے بھی جو ظلم و ستم آلِ رسُول پر رَوا رکھے وہ بھی بنی اُمیّہ سے کچھ کم نہ تھے۔ اب پروردگارِ عالم بہت ممکن ہے کہ اس اِنتقام کو خاندانِ رسُول ہی کی ایک فرد حضرت امام مہدی علیہ السّلام کے ذریعہ تکمیل تک پہونچائے اور اپنے حبیبؐ کو اس اِنتقام کی حیثیت و نوعیت کا مشاہدہ کرائے۔ اس کی مکمّل تفصیل آپ حضرات تاریخ و حدیث اور تفسیر میں

ملاحظہ فرمائیں۔ میں عرض کرنا چاہتا تھا کہ پروردگارِ عالم نے اس آیت میں آنحضرتؐ کے حق میں لفظ "موت یا میّت" کو اختیار نہیں فرمایا بلکہ لفظ "نَذْہَبَنَّ" فرمایا ہے اور علماءٗ جانتے ہیں کہ "نَذْہَبَنَّ" کا لفظ زندہ لوگوں کیلئے آتا ہے مُردوں کیلئے نہیں آتا۔ یعنی دُنیا سے لے بھی جائیں تو بھی اِنتقام دکھادیں گے۔ یہ نہیں کہ آپ مر بھی جائیں تو ہم اِنتقام لیں گے۔ اب اگر رسُول زندہ نہیں ہیں اور آپ کا تعلق دنیا سے نہیں تو یہ پروردگار کس کو دکھائے گا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ رسُول ہیں اور آپ دیکھنے اور سننے کی صلاحیّت بھی رکھتے ہیں۔ اور یہ ذکر قیامت کا نہیں ہے بلکہ اِسی آب و گِل کا ہے۔ اب حیاتِ پیغمبر کے ضمن میں مزید شواہد بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ۵۵۷ھ میں سلطان نورالدّین زنگی نے آقائے دوجہاں کو ایک رات میں مسلسل تین مرتبہ خواب میں دیکھا کہ آپؐ دو آدمیوں کی طرف اِشارہ کرکے فرماتے ہیں کہ جلد آؤ اور ان دونوں کے شر سے مجھے نجات دو۔ نورالدّین سمجھ گیا کہ کوئی عجیب و غریب اَمر مدینۂ منوّرہ میں وُقوع پذیر ہوا ہے۔ سلطان مذکور اپنے معتمد ساتھیوں کے ساتھ مدینۂ منوّرہ پہنچ گیا اور اِعلان کیا کہ مدینہ کا ہر باشندہ حاضر ہو اور سلطان سے اپنا اِنعام حاصل کرے۔ اِعلان کے بعد اہلِ مدینہ آئے اور اِنعام لیکر چلے گئے۔ مگر وہ دونوں اَشخاص جنھیں آنحضرتؐ نے سلطان کو خواب میں آکر دِکھایا تھا، نہیں دِکھائی دیئے۔ سلطان نے لوگوں سے دریافت کیا کہ کیا کوئی ایسا بھی ہے جو حاضر نہ ہوا ہو؟ لوگوں نے کہا صرف دو آدمی جو مغرب کے رہنے والے ہیں، اور وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور وہ کسی سے کلام تک نہیں کرتے سلطان نے حکم دیا کہ ان دونوں کو بھی حاضر کیا جائے۔ جب یہ دونوں حاضر ہوئے تو سلطان نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ یہی دونوں ہیں جنھیں خواب میں اِسے دکھایا گیا تھا۔ سلطان نے جب انھیں ڈرایا دھمکایا تو انھوں نے اعتراف کیا کہ ہم عیسائی ہیں اور ہمیں اسلئے بھیجا گیا ہے کہ آنحضرتؐ کے جسمِ اقدس کے ساتھ گستاخی کریں جس رات کو ہماری سُرنگ قبر شریف تک پہونچنے والی تھی بارش شروع ہوگئی اور گرج و چمک نے وہ زور باندھا کہ ایک زلزلۂ عظیم برپا ہوگیا اور اسی

رات کو آپ یہاں تشریف لائے۔ اور ہم جسدِ اطہر کو نکال نہ سکے سلطان ان باتوں کو سن کر غضبناک ہوا اور ساتھ ہی اس پر رقّت طاری ہوگئی اور وہ بہت رویا۔ بالآخر حجرۂ شریف کی جالی کے نیچے ان دونوں ناپاکوں کی گردن ماردی گئی اور ان کی لاشوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان نے روضہ کے چاروں طرف خندق کھدوا کر اسمیں سیسہ پگھلا کر اس خندق کو بھروا دیا تاکہ آئندہ کوئی ایسی حرکت نہ کرنے پائے۔ (جذب القلوب صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹ و مدارج النبوۃ جلد "۱" از عبد الحق محدّث دہلوی)۔ جب تک کوئی واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوتا تاریخ میں نہیں آسکتا۔ علمائے تاریخ کا مدینۂ منورّہ کے اس عظیم واقعہ کو من وعن اپنی کتابوں میں تحریر کرنا واقعہ کی حقیقت پر دلیل ہے کہ یہ واقعہ ظہور پذیر ضرور ہُوا۔ اس واقعہ کے مندرجہ ذیل امور قابلِ غور ہیں۔

آنحضرتؐ کے انتقال سے تقریباً پانچسو سال بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ یہ کیسی موت ہے کہ آنحضرتؐ مرنے کے بعد بھی مدینہ کے ان امور سے واقف و آگاہ ہیں کہ جن امور سے اہلِ مدینہ باوجود زندہ ہونے کے بھی آگاہ نہیں۔ اور آنحضرتؐ مرنے کے بعد بھی اس امر پر مطّلع ہیں کہ دنیا میں کیا کیا امور وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد بھی ڈاکٹر عثمانی صاحب کا یہ کہنا کہ "مردہ بہرطور مردہ ہے۔ سننا سُنانا اُس کے بس کی بات نہیں۔ اسے تو کوئی کچھ بھی نہیں سُنا سکتا...... کی آواز ہو یا کوئی اور بات۔ چاہے وہ اللہ کے آخری نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کیوں نہ ہوں۔ بہرطور اس گستاخانہ تحریر کا علم تو آنحضرتؐ کو یقیناً ہو گیا ہوگا اور آپؐ ہی بہرطور اس توہین پرستانہ، توحید پرستی پر سزا وجزا دینے کے مُختار ہیں۔ مَیں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کتنی قوّت و اختیار آپؐ کو اپنے پروردگار سے حاصل ہے کہ ایک مُردہ (سوئے ہوئے انسان) کے دل و دماغ پر آپؐ اس حد تک اثر انداز ہوئے اور دو مردود شخصوں کی مکمل شبیہہ (جو مدینہ میں موجود تھے) آپؐ نے ترکی کے بادشاہ کو اس کے خواب میں دکھائی، اور جب بادشاہ نے اصل شخصوں کو عالمِ بیداری میں دیکھا تو خواب میں دکھائے گئے شخصوں کی صورتوں کو پہچان لیا۔ آخر سرکارؐ دو عالم کی اس حیات اور اختیار و تصرفات کو موت (فناء) کی کون سی قسم

قرار دی جائے جو زندوں سے زیادہ باخبر اور با اختیار ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "مجھ پر امت
کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں جو بد ہیں انھیں میں چھپاتا ہوں اور جو نیک ہیں انھیں
بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتا ہوں۔ چھپانے" پیش نہ کرنا مراد ہوگا۔ گویا اس پر سنّتِ الٰہی جاری
ہے کہ پیش کرنے کے بعد اعمال ثبت ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جو پیش نہیں کئے جاتے ہیں وہ درجہ
اِعتبار سے محو و ساقط کر دیئے جاتے ہیں نیز اِنہی خصائص میں ہے کہ سیّد عالم کے حضور امت
کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ اور حضور ان کے لئے اِستغفار یعنی طلب آمرزش کرتے ہیں
ابنِ مبارک نے سعید ابنِ مسیّب سے روایت کی ہے کہ کوئی ایسا دن نہیں ہے مگر یہ کہ حضورؐ
کی بارگاہ میں صبح و شام اُمّت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں تو حضورؐ انھیں ان کی پیشانیوں
اور ان کے اعمال سے پہچانتے ہیں" (عبد الحق محدّث دہلوی کتاب مدارج النبّوۃ جلد نمبر "۱"
صفحہ ۲۶۰)۔ اب بہت ممکن ہے کہ ان واقعات اور احادیث پر کچھ اذہان بے اعتباری کا
اِظہار کریں اس لئے بہتر یہی ہے کہ قرآن سے بھی اس کا ثبوت پیش کر دیا جائے تاکہ لب کشائی
اور بلا وجہ بحث کے اِمکان بھی ختم ہو جائیں کہ نبی ہمارے اعمال سے واقف ہیں یا نہیں"
اور کہہ دیجئے کہ تم عمل کرتے رہو۔ عنقریب دیکھے گا اللہ تمہارے عمل کو اور اس کا رسُول اور
صاحبانِ ایمان۔ اور ضرور تم کو ایسے کے پاس جانا ہے جو تمام ظاہر اور چھپی ہوئی چیزوں کا جاننے
والا ہے، سو وہ تم کو تمہارا سب کیا ہوا بتلا دے گا" (سورۂ توبہ آیت ۱۰۵) اس ضمن میں
ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ "بخاری سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ جب کسی مسلمان کا
نیک عمل تمہیں پسند آئے تو کہو "کئے جاؤ۔ اللہ تمہارے عمل کو دیکھ رہا ہے اور اس کا رسُول اور
مومنین بھی اس سے واقف ہو رہے ہیں" (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۲ صفحہ ۱۱) آیت "فسیری اللہ عملکم"
مشترک ہے۔ خدا و رسُول اور مومنین پر اس لئے اس میں زمان و مکان کی قید نہیں لگائی جا سکتی۔
اِس لئے عمل کرنے والوں کو جس طرح پروردگارِ عالم، کل، آج اور آئندہ کل کو بھی دیکھ رہا ہے۔
اسی طرح رسُول اور صاحبانِ ایمان بھی دیکھ رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پروردگارِ عالم

آپنے علم وقدرت سے دیکھ رہا ہے اور رسُول، صاحبانِ ایمان مشاہدے اور مادّی ذرائع سے۔
چنانچہ ائمۂ اہلبیتؑ کرام سے بھی اس کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ "حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ تم لوگ کیوں حضرت رسالتمآبؐ کو ناراض کرتے ہو؟ تو پوچھا گیا کہ حضور وہ کیسے؟ اُس پر آپؑ نے فرمایا کہ تمہارے اعمال ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ جب وہ تمہاری بُرائیاں دیکھتے ہیں تو بہت ناراض ہوتے ہیں۔ لہٰذا تم آنحضرتؐ کو ناراض نہ کیا کرو بلکہ خوش کیا کرو۔ (تفسیر انوار النجف جلد ۷ صفحہ ۱۲۷)۔ اس سے ثابت ہوا کہ آنحضرتؐ کا رشتہ آج بھی اس کائنات سے باقی اور مسلسل ہے اور یہ کہ آپؐ کا وجود فنا نہیں ہوگیا۔ جس طرح آپؐ پیکرِ بشری میں آنے سے قبل پچھلی اُمتوں اور انبیاء پر "شاہد" تھے آج بھی شاہد (حاضر و ناظر) ہیں۔ اور اس نظریے کی تصدیق قرآن کی یہ آیت بھی کررہی ہے۔ "ہم نے آپؐ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے (الانبیاء آیت ۱۰۷) اور جس دَور میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ یہ بھی ایک عالم ہے۔ اور سرکارِ دو عالمؐ کی ذات ہمارے لئے بحیثیت "رحمت" موجود ہے۔ اور یہ آیت اور متذکرہ بالا آیتیں حیات النبیؐ پر محکم دلیلیں ہیں اگر عقل و فکر میں طہارت اور ذہن رسا کیساتھ کوئی ایمان معرفت کی منزل پر فائز ہو تو اس کے لئے ان آیاتِ قرآنی میں کھلی ہوئی نشانیاں اور دلیلیں حیاتِ پیغمبرؐ کے حق میں واضح ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کی یہ آیت حیاتِ پیغمبرؐ پر یقین کی دعوت دے رہی ہے۔ "اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسُول مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اور اگر یہ لوگ جب کبھی بھی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے (حبیبؐ) تیرے پاس آجاتے اور اللہ سے استغفار کرتے اور رسُول بھی ان کے لئے استغفار کرتے تو یقیناً یہ لوگ اللہ کو معاف کرنے والا مہربان پاتے۔" (سورۂ نساء آیت ۶۴)۔ ویسے تو اس آیت کی وجہ نزول منافقین کی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے قتلِ پیغمبرؐ کا منصوبہ بنایا تھا۔ اور پروردگارِ عالم نے اپنے رسُول کو اس سے باخبر کردیا تھا۔ مگر آیت عام ہے اور منسوخ نہیں۔ ہر دَور میں گنہگار ہوں گے اور انھیں استغفار و توبہ کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اور پروردگارِ عالم کا یہ ارشاد کہ رسُول کی ذات بھی

ان توبہ کرنے والوں کے حق میں استغفار کرے تو خدا کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائینگے۔
جس سے یہ امر ثابت ہے کہ آج رسُول اُمّت کے اعمال سے باخبر ہیں اور گنہگاروں کی
ندامت پر توبہ کی قبولیت کے لئے استغفار فرما رہے ہیں۔ اگر (معاذ اللہ) آپؐ کا وجود
نہیں ہے تو استغفار کون کر رہا ہے۔ اور گناہ معاف کیونکر ہو سکتے ہیں؟ جبکہ پروردگارِ عالم
نے قبولیتِ توبہ کو منحصر استغفارِ پیغمبرؐ پر کر دیا ہے۔ اس لئے یہ امر واضح ہے کہ جب تک گناہ
کرنے والے اور توبہ کرنے والے موجود ہیں ان کے گناہوں کی بخشش کا ذریعہ رسُول بھی
ان کے لئے استغفار کریں۔ تو پروردگارِ عالم گناہوں کو معاف فرمائے گا۔ اس لئے کہ شرط یہی
ہے کہ رسُول ان کے لئے استغفار کریں۔ اب جو قوم حیاتِ پیغمبرؐ ہی کی منکر ہے اور اس کا عقیدہ
یہ ہے کہ رسُول (معاذ اللہ) فنا ہو گئے تو اسے اپنے گناہوں کی مغفرت سے مایوس ہو جانا چاہئے
اس لئے کہ توبہ کی قبولیت کا ذریعہ انھیں حاصل نہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں عبدالحق محدث دہلوی صاحب
نے ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے "خلیفۂ زمانہ ابو جعفر امیر المومنین نے امام مالکؒ سے مسجدِ نبوی
میں مناظرہ کیا۔ امام مالک نے اس سے فرمایا، اے امیر المومنین! اپنی آواز کو مسجد
میں پست کرو اس لئے کہ حق تعالٰے نے ایک جماعت کو سکھاتے ہوئے فرمایا، اپنی آوازوں کو
بارگاہ نبویؐ میں اونچی نہ کرو۔ اور ایک جماعت کی مدح و تعریف میں فرمایا..... بیشک
جو لوگ اپنی آوازوں کو خوب پست کرتے ہیں (آخر آیت) اور ایک گروہ کی مذمت و برائی
میں ارشاد فرمایا...... جو لوگ حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں۔ یقیناً رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کی عزت و حرمت بعد وفات بھی ایسی ہی ہے جیسی آپؐ کی حیاتِ شریفہ میں تھی۔ اس پر خلیفہ
رونے لگا اور خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد ابو جعفر نے کہا کہ اے عبداللہ! میں اپنے چہرے کو دعا
میں قبلہ سے پھیروں، یا رسُول اللہ سے۔ اس پر امام مالک نے فرمایا کہ تم رسُول اللہ سے کیوں
منہ پھیرتے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارے وسیلہ ہیں اور تمہارے والد حضرت آدم صفی اللہ کے روزِ قیامت
وسیلہ ہیں۔ جاؤ حضورؐ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر آپؐ سے شفاعت مانگو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

اُور اگر وُہ اپنی جانوں پر ظلم کر لیں تو بارگاہِ نبوّت میں حاضر ہو کر مغفرت مانگیں ..... اُلخ
(سورۂ نساء آیت ۶۴) کتاب مدارج النبّوۃ جلد "۱" صہ ۵۱۴ ۔ اِس اَمر میں اس مُغالطہ کا اِمکان ہے کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اِستغفار کی قبولیت کا دارومدار صرف روضۂِ اَنور پر حاضری ہی میں منحصر ہے، اُیسا نہیں ہے۔ ورنہ بہت سے اُیسے لوگ ہیں جنھیں آپؐ کی حیاتِ طیّبہ میں بھی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ جیسے اویس قرنیؒ، نجاّشی اور اُن کے ساتھی، اِن کے علاوہ بھی کئی ایسی شخصیتیں گزری ہیں۔ پروردگار عالم کے اس حکم سے منشاء یہ ہے کہ آپؐ کائنات کے لئے رحمت بنا کر مبعوث ہوئے اَب اگر خدا کی رحمت و بخشش کے خواہاں ہو۔ تو جہاں بھی ہو آپؐ کی معرفت و وسیلہ سے رحمت اِلٰہی چاہو تو پروردگار بھی تم پر رحم فرمائے گا۔
جیسا کہ ارشادِ خداوندِ عالم ہے کہ "اُے صاحبانِ ایمان، اللہ سے ڈرو اُور اس تک وسیلہ سے پہنچو، اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم سب فلاح پاؤ" (سورۂ مائدہ آیت ۳۵)۔ یہاں پر صاحبانِ ایمان (یعنی جو مومن ہیں) سے ارشاد ہو رہا ہے کہ خدا تک پہونچنے کا وسیلہ تلاش کرو، اُور اس کے ذریعہ خدا تک پہنچو۔ (کچھ مفسّرین نے یہ تفسیر کی ہے کہ "وسیلہ" سے مراد وُہ مقام بلند ہے جو صرف آنحضرتؐ ہی کے لئے مخصوص ہے۔ یہ تاویل میں خطا ہے اِس لئے کہ وہ جگہ جب صرف رسُولِ اکرمؐ کیواسطے مخصوص ہے پھر تمام مومنین کو اِسے حاصل کرنے کا حکم بیکار ہے جبکہ وہ مخصوص صرف سرکارِ دوعالمؐ کے لئے ہے اور یہ تاویل بھی آنحضرتؐ کے اس فرمان کی روشنی میں غلط ہے اِس لئے کہ حضرت ختمی مرتبتؐ نے اَپنے اَہلبیتؑ کرام کے واسطے متعدّد بار فرمایا ہے کہ یہ لوگ جنّت میں میرے ساتھ ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ قرآن میں نبیّین، صدّیقین، صالحین اُور شہداء کے لئے اِرشاد ہے کہ یہ لوگ ایک ساتھ ہوں گے اور یہ اَچھے رفیق ہوں گے۔ اَب "وسیلہ" پر بھی غور فرمالیں کہ "وسیلہ" اس ذریعہ کو کہتے ہیں جس سے مقصود تک پہونچا جائے۔ اَب اگر وسیلہ کا مصداق جنّت قرار دیا جائے تو وہ مقصود ہے مقصود تک پہونچنے کا وسیلہ نہیں۔ تو گفتگو کو مختصراً عرض کرتے ہوئے یہی گزارش ہے مقصود مومن مرضی اِلٰہی، یا بقول اقبالؔ ع۔ "شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن"۔

اور جیسا کہ آیت کے اگلے حصے میں بھی وضاحتِ جہاد موجود ہے تو اس جہاد اور مرضی مولا اسکی خوشنودی و اکرام و رحمت کے لئے رسُول کے وسیلے سے اس تک پہنچو جو انعام یافتہ ہیں۔ اور اس کی منشاء مرضی کے حامل۔ ہم اسی اَمر کی تو دعا صبح سے شام تک اپنی نمازوں میں کرتے ہیں کہ پروردگار ہمیں اُن لوگوں کا سیدھا راستہ دکھا جن پر تو نے اپنی نعمتیں نازل فرمائیں اور وہ یہی ہیں انبیاء و رسل، صالحین، صدّیقین، شہداء اور اولیاءِ اہلبیت پر جو خدا کے محبوب و مخصوص بندے ہیں۔ ان کے راستے پر چلتے ہوئے اگر ہم ان سے دولتِ عقل و فہم، نعمتِ ایمان و یقین، حقِّ معرفت و دیانت، صدق و صفا اور زہد و تقویٰ کے ساتھ نعماتِ دُنیا میں سے کسی بھی نعمت کو طلب کریں تو یہ شرک نہیں اس لئے کہ ہم غیر اللہ سے نہیں بلکہ اولیاء اللہ سے طلبِ نُصرت و استعانت کر رہے ہیں۔ یہ خدا کے بندگانِ خاص کہ جن کے راستے پر چلنے کا خود پروردگار ہمیں حکم فرما رہا ہے۔ ہم تک اس کی نعمت و رحمت کے پہونچنے کا وسیلہ اور ذریعہ یہی بندے ہیں۔ ان بندوں سے گھبرانے اور وحشت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یہ خدا کی مخلوق ہیں لیکن ایسی مخلوق جو عبد و معبود کے مابین ایک رشتۂ محکم ہیں ایک مسلسل غیر منقطع ذریعہ اور وسیلہ ہیں اس کی رحمت و نعمت کا ہمارے اور معبود کے درمیان، اور یہی وہ بندگانِ خاص ہیں، پروردگارِ عالم کے جو اس کی صفات و قدرت کے مظہر ہیں۔ جن کی خوشنودی خدا کی خوشنودی، جن کی اطاعت خدا کی اطاعت اور جن کی نافرمانی خدا کی نافرمانی کے مترادف ہے۔ تو ان سے طلبِ نُصرت و استعانت حقیقت میں خالق ہی سے طلب استعانت ہے اس میں شرک و بدعت کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں۔ اور پروردگارِ عالم کے یہ مخصوص و محبوب بندے بھی ہماری احتیاج سے واقف، کمزوریوں سے آگاہ اور ہمارے اعمال پر نگراں ہیں۔ ہمیں ہر عالم اور ہر حالت میں ان کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی ہدایت پروردگار نے فرمائی ہے کہ ہم ان کی آواز پر لبّیک کہیں تاکہ وہ ہماری اس مادّی حیاتِ ناقص کو حیاتِ کامل میں تبدیل فرما دیں۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں :-

"اے صاحبانِ ایمان لبّیک کہو، اللہ اور اُس کے رسُول (کی دعوت پر) جب وہ تمہیں بلائیں تاکہ تمہیں زندگی عطا ہو اور یقیناً اللہ حائل ہے انسان کے دِل کے درمیان اور اسی کی طرف تم سب جمع ہو گے" (سورۂ انفال آیت ۲۳)۔ اِس آیت میں خطاب کافروں اور مشرکوں سے نہیں ہے بلکہ مومنوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور زندہ مومنوں کو مُردوں کو نہیں۔ اب یہ کتنی حیات ہوئی، ایک دنیاوی، دوسری رسُول کی آواز پر لبّیک کہنے کے بعد اور تیسری "یَومَ یُبعَثُون"۔ اب کون پوچھے ڈ عثمانی صاحب سے کہ کتنی موتیں اور حیاتیں اس پیکرِ بشری کی خلقت و انتقال سے وابستہ ہیں۔ قرآن مجید کی اس آیت کی مزید تشریح کے لئے مذکورہ سابقہ آیتوں پر غور فرمائیں جس میں پروردگار عالم نے شہداء کو احیاء صاحبانِ حیات کہا اور سورۂ حج میں مومنین کو جو اپنے بستر پر بھی انتقال کریں رزقِ حسن کا وعدہ ہے اور رزق بقائے حیات کے لئے فراہم کیا جاتا ہے جو فنا ہو گیا ہو اُس کے لئے تو رزق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ حیات وہی ہے جس کے لئے قرآن نے پہلے ہی اعلان کر دیا ہے کہ تمہارے فکر و شعور اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ "لَاتَشْعُرُون"۔ یہ جا بجا فکر و شعور میں لرزش اور قرآنی نعمت فہم و ادراک کا فقدان صرف اِس وجہ سے ہے کہ "محمّد ابنِ عبداللہ اور محمّد رسُول اللہ" کا ابھی تک فرق سمجھ میں نہیں آیا۔ ابھی تک فکروں پر دورِ جاہلیّت سوار ہے۔ ذرا غور تو کریں، دادا شیبۃ الحمد (عبد المطّلب) والد عبد اللہ (خدا کا بندہ) خود آپ احمد، محمّد، محمود اور والدہ آمنہ۔ کیا دورِ جاہلیّت میں اس سے بہتر فکری انداز میں اسلام کا عملی تعارف ممکن تھا؟ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ صرف بشریّتِ رسُول ہی تک نگاہ معرفت محدود رہی اب چاہے ماضی ہو یا آج کا یہ دور۔ نورانیتِ رسُول اس دور میں بھی ناقابلِ فہم تھی اور آج بھی کچھ ایسا ہی نظر آرہا ہے پروردگارِ عالم تو اپنے رسُول کو اس منزلِ بلند پر فائز قرار دے رہا ہے کہ اس کی اتّباع و غلامی میں زندہ لوگوں کو ایک اور حیاتِ کامل بھی عطا ہو رہی ہے۔ اب اس کے برعکس کوئی اتّباع و پیروی اور معرفتِ رسُول ہی سے عاری ہو تو پھر اس کے لئے یقیناً فنا یعنی موت ثابت ہے۔ تو

نتیجتاً یہ اَمر ثابت ہوا کہ حیات، و موت کی منزلیں تو سرکارِ دو عالم کے قدموں سے وابستہ ہیں ۔
اب اگر لوگ دشمنیٔ رسُول و آلِ رسُول میں بھٹک کر ان کے غیروں (تاجدارانِ دُنیا) کے دامن سے وابستہ ہو کر اپنے ایمان و عاقبت کو برباد کریں تو نہ ہی اس میں رسُول پر کوئی الزام عائد ہو سکتا ہے اور نہ ہی قرآن پر۔ اب کسی کا قرآن کی اس متشابہہ آیت "اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ" سے آنحضرت کو میّت (مُردہ) قرار دے کر کافرین و مشرکین کے مُردوں میں شامل کر دینا اور ان اَموات کیساتھ پیغمبرِ اکرم کے جسدِ اَطہر کو ان کے مماثل قرار دینا توحید پرستی نہیں بلکہ توہین پرستی ہے حقیقت میں شرک ہی ہے اس لئے کہ اپنے نفس پر حضورِ اکرم کی حیثیت و منزلت کا موازنہ کرنا اطاعتِ رسُول سے انحراف و سرکشی کے مترادف ہے جبکہ پروردگارِ عالم مومن کی حیات و موت کو کافروں اور بدکرداروں کی حیات و موت کے برابر اور مماثل نہیں قرار دیتا تو کس حیثیت و اختیار سے کافر مُردوں میں رسُولِ اکرم کو شامل کیا جا سکتا۔ کیا یہ فرمانِ ربّ العزت کی مخالفت نہیں ؟ اور جو خدا و رسُول کے فرمان کی مخالفت کرے اسکا موقف اور حیثیت کیا ہوگی ؟ لیکن افسوس تو ہے ان خارجی و ناصبی مکتبِ فکر کے حامل اذہان پر کہ جو بظاہر کلمہ تو حضورؐ کا پڑھتے ہیں لیکن روحانی طور پر اپنا رشتہ تاجدارانِ بنی اُمیّہ کے ان افراد سے رکھتے ہیں جو مکمّل طور پر رسُول کی دشمنی کے جذبات کے شکار تھے۔ تو پھر انھیں سرکارِ دو عالم کی نورانیت و روحانیت سمجھ میں آئے تو کیسے آئے ؂

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا ؎ کہاں سے آئے صدا لاالٰہ اِلّا اللہ

پروردگارِ عالم فرماتا ہے کہ اے رسُول جب تک ان کے درمیان آپؐ موجود ہیں تو ہم ان کو عذاب میں مبتلا نہیں کریں گے، چنانچہ ملاحظہ فرمائیں۔

"اے رسُول جب تک ان کے درمیان آپؐ موجود ہیں، خدا ان پر عذاب نہیں کرے گا اور جبکہ یہ استغفار بھی کرتے ہیں۔" (سورۂ انفال آیت نمبر ۳۳)۔ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ کافروں نے عذاب کو طلب کیا جس پر پروردگارِ عالم نے عذاب کے نازل نہ ہونے کا سبب اس آیت میں بیان فرمایا ہے

"اگر یہ سچا قرآن ہے تو آسمان سے ہم پر پتھر کیوں نہیں برسا دیتے" جس پر یہ آیت اتری۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کا ذکر فرماتا ہے کہ جب تک یہ (کفار) استغفار کرتے ہیں اور آپؐ بھی ان کے درمیان موجود ہیں تو ہم ان پر آسمانی عذاب نہ کریں گے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ ان کو دو امانیں حاصل تھیں، ایک تو آنحضرتؐ کا وجود، دوسرے کفار کا استغفار۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۹۶)

یہ آیت بھی عام ہے منسوخ نہیں، اور اس کا اطلاق آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں تھا۔ اس لئے کہ آج بھی امتِ مسلمہ پر بالکلیہ عذاب نہیں آتا کہ امتِ مسلمہ کے تمام افراد معذب ہو جاتے جس طرح سے پچھلی امتیں ہلاک و فنا اور مسخ کر دی گئیں ہیں۔ ہمارا جبکہ یہ عالم ہے کہ ملت کی اکثریت اس امر کی معترف ہے کہ ہماری بد اعمالی اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہم عذابِ الٰہی کے مستحق ہو چکے ہیں۔ لیکن عذاب الٰہی صرف اس وجہ سے رکا ہوا ہے کہ اس عالم میں ذات رحمۃ للعالمینؐ موجود ہے اور یہ وجود ہمارے اور پروردگار کے درمیان وسیلۂ رحمت بنی ہوئی ہے۔ حیرت تو اس امر میں ہے کہ آیا قرآن مجید کی آیات ان ناصبی، خارجی اور وہابی عقائد کے حامل افراد کی نگاہوں سے نہیں گزرتیں یا آیاتِ قرآنیہ کی نورانیت ان کی عقل و فہم سے بالا ہو جاتیں ہیں یا ان کے اذہان و افکار کے ساتھ قلوب بھی اس حد تک دشمنیٔ رسولؐ اور آلِ رسولؐ میں مردہ ہو چکے ہیں کہ آنحضرتؐ کی صحیح معرفت اور محبت ان کے قلوب قبول کرنے کی بالکل صلاحیتیں کھو چکے ہیں۔ جبھی تو بتوں اور کافروں کے مردہ پیکر (بے معرفت قلب و نظر) کیلئے جو آیتیں کلام پاک میں مذکور ہوئیں ہیں۔ وہ ان خارجیوں کو رسولؐ اکرم کے حق میں دکھائی دے رہی ہیں۔ اور اپنے بے معرفت دل و دماغ، بے علم و فکر اذہان سے اس کی تاویل اور مصداق سرکارِ دو عالمؐ کو دے رہے ہیں۔ دوسری طرف جن آیاتِ قرآنیہ سے "حیاتِ پیغمبرؐ کی وضاحت اور ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس کی تاویل، تفسیر اور مصداق و معنی و مطالب ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے" اور سمجھ میں آئے بھی تو کیوں؟ اور کیونکر؟ جبکہ سرکارِ دو عالمؐ کی حیثیت، منزلت، عظمت اور وقار ان خارجی اذہان کے حامل افراد کی نگاہوں میں، محض

ایک "نامہ بر" سے زیادہ نہیں ہے، جبکہ پروردگار مومنوں کو یہ حکم فرما رہا ہے کہ تم رسُول کی آواز پر لبیک کہو تاکہ وہ تمہیں زندگی "یحیِیکُم" عطا کرے۔ یہ زندگی صرف سانس لینے اور غذا کھانے والی زندگی تک محدود نہیں۔ معرفتِ دین و دیانت میں زندگی، حق عبادت و بندگی میں زندگی کارِ خیر میں حیات۔ چوپاؤں جیسی موت سے بلند حیات جس کا تمہیں شعور بھی حاصل نہیں۔ اب یہ کون سی اور کتنی حیاتیں ہوئیں جن سے صاحبانِ ایمان گزر رہے ہیں۔ اب اگر کسی کی بدبختی اسے فہرست دے، اور وہ ان ذواتِ مقدسہ کے دامن سے خود کو وابستہ کرلے کہ جن کی حضوری میں "شاہد" عالمِ تکوین اپنے وجود و خلقت سے آشنا ہوتی تو دکھائی دیتا کہ خلقت کائنات کا ماحصل فنا نہیں حیات ہی حیات ہے۔ اور پھر انھیں "عالمِ برزخ" کی معرفت ہوتی کہ وہ حضور کے دائرۂ حیات میں سدِّ راہ اور رکاوٹ ہے کہ نہیں؟

چھپا لے گا کسی دن عرش تک کو اپنے دامن میں
دِکھا دے گا تماشہ پھیل کر مُشتِ غُبار اپنا
(شادؔ عظیم آبادی)

اِس غبار "پیکر بشری" کی رفعت و عظمت کے ساتھ اختیار و تصرّف کی حیثیت و منزلت تو دیکھئے کہ عرش و کرسی کی منزلوں سے گزرتا ہوا وجوب و امکان کی اس حدِّ آخر پر پہونچا جہاں جبرئیلؑ جیسا ملک مقرّب یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گیا کہ اب اس کے امکان سے باہر ہے کہ ایک قدم بھی آگے بڑھائے۔ لیکن اس پیکرِ بشر میں نظر آنے والا وجود جو عالمِ خلقت میں پروردگار عالم کا ایک یگانہ و منفرد مقام و منزلت کا حامل ہے جبرئیلؑ سے یہ نہیں پوچھتا کہ آئندہ مجھے کیا کرنا ہے؟ اور کس راہ سے گزر کر جانا ہے یا جانا ہوگا؟ اور آئندہ آنے والی اب کون سی منزل ہے؟ اب بھی یہ بات سمجھ میں آئی یا نہیں کہ کائنات کی خلقت کا شاہد کون ہے اور آسمانوں کی راہوں سے واقف و آگاہ کون لوگ ہیں؟ کائنات تو تمام قدموں کے نیچے رہ گئی، اب چاہے عرش و کرسی ہوں یا منزلِ قیامِ سالک، اب کس سے معلوم کیا جائے کہ وہ فرشتے جو موت و حیات پر مامور ہیں، وہ کہاں اور کس منزل پر رہ گئے۔ اور پردۂ برزخ کتنا پیچھے رہ گیا؟ اور یہ کون سی حیات

"یوم یُبعثون" کی منزل ہے جو قیامت سے پہلے ہی جنّت اور اس کے تمام مناظر کو نظروں کے سامنے پیش کر رہی ہے؟ ڈاکٹر عثمانی صاحب حیرت و استعجاب کے عالم میں مسلم شریف کی اس حدیث کا انکار کرتے ہیں جس میں آنحضرتؐ نے معراج پر جاتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کو ان کی قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب اپنی بے اعتباری کا اظہار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "اب اگر یہ دریافت کیا جائے کہ بیت المقدّس میں نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انبیاءؑ کے امام بن کر نماز پڑھائی اور حضرات ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السّلام کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا بھی، پھر جب یہاں سے فارغ ہو کر آسمانوں پر گئے اور انبیاء سے ملاقات ہوئی تو ان کو "پہچان سے کیوں نہ پائے" اور ہر مرتبہ جبرئیلؑ سے یہ کیوں پوچھنا پڑا کہ مَن ھٰذا یا جبرئیلؑ (یہ کون ہے اے جبرئیل؟) اور جبرئیلؑ نے فرمایا کہ یہ آدمؑ ہیں، یہ موسیٰؑ ہیں یہ عیسیٰؑ ہیں اور یہ ابراہیمؑ ہیں، تو جواب میں چپ سادھ لی جاتی ہے ــــ (عذابِ قبر صنہ۲۰، ۲۱ از ڈاکٹر عثمانی صاحب توحید روڈ کیماڑی کراچی)

ہو سکتا ہے کہ جواب نہ دینے اور چپ سادھ لینے والے لوگ کم علم رہے ہوں جنھیں ڈاکٹر صاحب نے مخاطب فرمایا ہو۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے سوالات جس میں عقل و فہم اور معرفتِ دینی کا فقدان ہوتا ہے، علماء بھی ایسے سوالات کے جواب میں خاموش ہی رہنے میں مصلحت اور عافیت سمجھتے ہیں اور چپ سادھ لیتے ہیں۔ اور ان کی خاموشی ہی اہلِ معرفت کے لئے جواب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب! بعض تعارف کا مطلب یہ قطعی نہیں ہوتا کہ متعارف کرائی جانے والی شخصیت گمنام یا غیر متعارف ہوتی ہے۔ تمام ملکوں میں اصول و قاعدہ ہے کہ جب بھی سربراہِ مملکت دورے پر آتا ہے تو ملک کے گورنروں، وزراء، عمائدینِ ملک اور معزّزینِ شہر سے اس کا تعارف کرایا جاتا ہے اور اکثر یہ تعارف کرانے والے حکومت کے معمولی کارندے ہوتے ہیں جو اس فریضہ کو ادا کرتے ہیں، ان میں بعض شخصیتیں تو وہ ہوتی ہیں جو حاکمِ اعلیٰ کی نیابت میں عمل کرنے کا پہلے حلف اٹھا چکی ہوتی ہیں اور خود اسی حاکمِ اعلیٰ نے اسے اُسکے موجودہ یا سابقہ عہدے پر مامور کیا ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی تعارف ہوتا ہے یہ رسمِ دُنیا بھی ہے،

اور اولیاء اللہ کی سیرت بھی اس میں بعض کی عظمت و بزرگی اور اہم شخصیتوں کی امتیازی حیثیت، و منزلت اور اہمیت کا اظہار ہوتا ہے کہ عامۃ النّاس جو اس امر میں ناواقف ہیں انھیں صحیح معرفت ہوجائے۔ سرکارِ دو عالم کائنات (عالمین) کے لئے شرعی حیثیت میں "نذیر" اور وجودی حیثیت میں "رحمت" بن کر شاہد ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کی نبوّت کا اقرار حضرت ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السّلام کے ساتھ تمام انبیاء سے اِس منزلِ میثاق پر لیا جا چکا ہے۔ اب رسُول پھر دوبارہ اسی منزل پر تشریف لائے، اور جبرئیل نے ان تمام ذواتِ مقدّسہ کا تعارف کرایا اور روزِ میثاق کی یاد کو تازہ کیا گیا اور حضورِ اکرم کے حدود و اختیار کے دائرہ کار کی عملاً تشریح ہوئی کہ ان انبیاء کی شریعتیں زمانی و مکانی ایک مخصوص مدّت تک کے لئے تھیں جبکہ سرکارِ دو عالم کی شریعت قیامت تک کے لئے معتبر اور قابلِ عمل ہے۔ اب یہ پروردگارِ عالم کے مخصوص بندوں سے عبدِ خاص سرکارِ دو عالم کا تعارف دوبارہ کیا گیا تو اس میں گھبراہٹ اور پریشانی کا کیا مقام ہے، اور اس تین قوّت۔ خدا اولد روح القدس، ابن اللہ کی، خدا کی حکومت و اختیار میں شرکت کی نفی اس امر سے (تعارف کے بعد) اور بھی واضح ہوگئی کہ حضرت عیسیٰ، جو تھے آسمان پر رُک گئے اور اپنی حدِ تصرّف کو ظاہر کر دیا کہ مجھے یہیں تک اختیار و قدرت حاصل ہے۔ اسی طرح حضرت جبرئیل نے بھی ایک حد پر رُک کر اپنی عاجزی کا اعلان کر دیا اور پیچھے ہٹ گئے۔ اور رسُول چونکہ اپنی قلمرو میں تھے اور حدودِ ممکن تک آپ کی نبوّت و رسالت کی حکمرانی ہے اس لئے آپ آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ پروردگار نے حجّت ختم کردی اور واضح کر دیا کہ جب انبیاء و رسل آپ کے ہمسر اور مساوی نہ ہوسکے اور ملائکہ باوجود نورانی مخلوق ہونے کے اس عالمِ انوار کے متحمّل نہ ہوسکے جس منزل سے آپ معہ پیکرِ بشری کے گزرے جس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ آپکا پیکرِ بشری باوجود مادّی ہونیکے کس حد تک لطیف و اعلیٰ جنس کا حامل ہے جو نورانیت و مادّیت کے ماحول میں متاثّر نہیں ہوا۔ جبکہ انبیاء کے لئے خیر البشر کا درجہ، خطاب پروردگارِ عالم نے پسند نہیں کیا تو

کسی غیر معصوم کو "خیر البشر" کا اعزاز بغیر کسی استحقاق اور سند کے بخش دینا سرکارؐ دوعالم کی توہین اور پروردگار عالم کی نافرمانی اور اس سے سرکشی کے مترادف ہے، اس لئے کہ ربّ العزّت نے یہ لقب صرف سرکارؐ دوعالم کے لئے مخصوص فرمایا ہے کسی اُمّتی پر یہ لقب اُسی وقت زیب دے سکتا ہے جبکہ وہ کم از کم حضرت عیسٰیؑ ہی طرح اپنے اس پیکر بشری کو لے کر آسمان کی چوتھی منزل ہی تک پہونچا ہو۔

جہاں تک بحث تعارف کی ہے تو بعض تعارف علم و معرفت اور شناسائی ہونے کے بعد بھی روبہ عمل لایا جاتا ہے مثلاً خداوند عالم سے کائنات کی کون سی چیز پوشیدہ اور اس کے علم و قدرت سے باہر ہے۔ یہ اُمر یقینی ہے کہ پروردگار عالم کا علم کائنات کی تمام اشیاء پر محیط ہے، کوئی بھی شئے چاہے وہ ادنیٰ ہو یا عظیم اس کے علم و قدرت سے باہر نہیں۔ تو پھر کیا وجہ تھی کہ پروردگار عالم نے حضرت مُوسٰیؑ سے دریافت فرمایا کہ موسٰیؑ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ کیا پروردگار کے علم میں نہ تھا کہ مُوسٰیؑ کے ہاتھ میں کیا چیز ہے؟ ظاہر ہے کہ پروردگار کو علم تھا اور باوجود علم اور شناسا ہونے کے اس علیم و خبیر نے حضرت مُوسٰیؑ سے عصاء کی وضاحت کیوں چاہی جبکہ اس کے علم میں تھا۔ اور پھر حضرت مُوسٰیؑ اپنے ربّ سے اس عصاء کا مکمّل تعارف اور اس کا استعمال اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے کسی لاعلم سے کسی غیر معروف ہستی کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے "اے موسٰیؑ یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ حضرت مُوسٰیؑ نے جواب میں کہا، یہ میرا عصاء ہے جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں، اپنے بکریوں کے لئے (درخت سے) پتّے جھاڑتا ہوں، اور بھی بہت سے کام فائدے کے لیتا ہوں"۔ (سورۂ طٰہٰ آیات ۱۶ تا ۱۸)۔ عصائے مُوسٰیؑ کیا پروردگار عالم بے علم تھا؟ پھر اس نے حضرت مُوسٰیؑ سے یہ کیوں دریافت کیا کہ اے مُوسٰیؑ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس کے بعد حضرت مُوسٰیؑ کا اپنے ربّ سے جو علیم و خبیر اور ہر شئے پر قادر ہے، عصا کا تعارف کرایا، تو کیا یہ اس اَمر کی دلیل ہے کہ اس تعارف سے قبل پروردگار عالم حضرت مُوسٰیؑ کے عصاء سے ناواقف تھا؟ ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کے علم میں ہے۔ تو کیا پروردگار عالم نے باوجود علیم و خبیر ہونے کے یہ فعل عبث کیا جو واقف و شناسا

ہونے کے بعد بھی حضرت موسیٰ سے ان کے عصا کے تعارف کو پسند فرمایا۔ تو ڈاکٹر عثمانی صاحب مزاجِ مشیّت کو سمجھنے کے لئے با معرفت عقل اور طاہر دل و دماغ کی ضرورت ہے جس کے ساتھ معصوم عقل کی رہبری بھی حاصل ہو۔ یہ رموزِ مشیّت اور اُمورِ شریعت ہر کس و ناکس کا کام نہیں، جب سرکارِ دو عالم کی روحانیت و نورانیت اور بشریت، حیات و موت اب تک سمجھ میں نہ آسکی تو متشابہاتِ قرآن اور مصلحتِ پروردگار کیسے سمجھ میں آئے۔ جس طرح قرآن مجید کی آیتیں بعض منزلوں پر متشابہ ہیں، اسی طرح اولیا ءاللہ اور ان کی سیرت، کردار و عمل اور رشد و ہدایت کی منزلیں بعض جگہ محکم و واضح اور بعض جگہ متشابہ ہو جاتی ہیں، انھیں آپ اپنی رائے اور قیاس کی میزان پر تولنے کی کوشش نہ کریں۔ جو جواب آپ عصائے حضرت موسیٰ کے اس تعارف کے ضمن میں ارشاد فرمانا چاہیں، وہی جواب میری طرف سے شبِ معراج انبیاء و رسل اور سرکار دو عالم کے مابین تعارف کے باب میں شامل کر لیں۔

حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدّث دہلوی، عظمتِ رسول کے ضمن میں آپ کے اسماء میں سے ایک اسم مبارک "قیّم" بھی فرماتے ہیں "اور یہ نام وہ ہے جسے اہلبیتِ نبوّت ہی جانتے ہیں (یعنی اس کے صحیح معنی و مطالب کو) لیکن "قیّم" بھی اسی معنی کے قریب ہے۔ اور انبیاء علیہم السّلام کی کتابوں میں آیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السّلام نے فرمایا "خداوندا ہم پر مبعوث فرما جو محمدؐ مقیم سنّت ہے لہٰذا "قیّم" بہ معنی قائم کرنے والے کے ہو سکتا ہے۔" (مدارج النّبوۃ جلد ا، ص ۴۹۵) پروردگار عالم کی ایک صفت "قیّوم" ہے، جس کے معنی بہت بڑا نگاہ رکھنے والا اور بہت بڑا قائم ہونے والا۔ اور یہ صفت خدا کی ہے جو بذات خود قائم اور نگاہ قدرت رکھنے والا ہے۔ آنحضرتؐ "قیّم" ہیں جس کے معنی نگاہ رکھنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ اور اسی نسبت ~~سے دین~~ اسلام کو دینِ قیّم بھی کہا جاتا ہے جو قیامت تک قائم ہے۔ اور دین کا قیام اور اس کو قائم رکھنے والا تو بہر طور خداوند تعالیٰ ہے لیکن اسی پروردگار عالم نے آپؐ کی ذاتِ اقدس کو قیّم فرمایا ہے اور دینِ اسلام کا تعارف اور قیام آپؐ ہی کے ذریعہ اور وسیلہ سے قائم ہے۔ تو اب یہ کتنی بڑی بد عقلی ہے۔ یہ کہنا کہ دین تو قائم ہے مگر دین کو رائج

کرنے والا جس کی بدولت یہ دین قائم ہے اور جسے خداوند عالم "قیّم" یعنی قائم، برقرار اور نگاہ رکھنے والا، فرما رہا ہے، اُسے یہ کج فہم لوگ مردہ اور فانی قرار دے رہے ہیں۔

قرآن مجید کی متعدد آیات اور احادیث جو "حیاتِ پیغمبرؐ کے حق میں" معتبر کتب میں مذکور ہوئی ہیں اگر وہ تمام نہ بھی ہوتیں تو سورۂ الحجر کی صرف یہ ایک آیت "حیاتِ پیغمبرؐ کے" اثبات کے لئے کافی ہے۔ لیکن جبکہ کوئی دیدۂ بینا، قلبِ منوّر کے ساتھ صحیح طور پر منزلت و عظمتِ رسُول کی معرفت بھی رکھتا ہو۔ چنانچہ ارشاد ربّ العزّت ہے "تیری حیات کی قسم وہ اپنی بدمستی میں مبتلا ہیں" (سورۂ الحجر آیت ۷۲) حضرت ابنِ عباس فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جتنی مخلوق پیدا کی ہے ان میں حضورؐ سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی حیات کے سوا کسی کے حیات کی قسم نہیں کھائی" (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صـــ) پرورد گار عالم تو بار بار قرآن میں حیاتِ پیغمبرؐ کا ذکر فرما رہا ہے، کبھی آپؐ کی حیات کی قسم کھاتا ہے، کبھی آپؐ کو عالمین پر حاضر و ناظر" شاہد" (گواہ قرار دے رہا ہے) یہ تصدیق وہ فرما رہا ہے جو خود حیّ یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ وہ رسُول کو "قیّم" قائم اور قائم رکھنے والا فرماتا ہے۔ اب یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ وہ حیات جو صرف ۶۳ سال کے لئے رہی ہو، اور وہ وجود جو صرف ۶۳ سال میں (معاذ اللہ) فنا ہو گیا ہو اُسے پروردگار عالم اتنی اہمیت وعظمت، تکرار و شدّت کے ساتھ بیان فرمائے۔ آپؐ کے علاوہ کسی بھی نبیؑ۔ ولی اور رسُول کے حیات کی قسم ربّ العزّت نے نہیں کھائی۔ جبکہ حضرت الیاس، حضرت خضر اور حضرت عیسیٰ علیہم السّلام اب تک زندہ اور پیکرِ بشری میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی جن چیزوں کی پروردگار عالم نے قسم، کھائی ہے ان کا وجود آج بھی دُنیا میں موجود ہے۔ تو پھر سرکارِ دوعالم کے وجود کے فنا ہو جانے کی کیا دلیل قائم ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس تو ہے ان خود ساختہ مفسّرین و مورّخین اور اسکالرز پر جو اپنی بدعقلی، کج فہمی کے ساتھ دشمنی رسُول کے جذبات کو آسودہ کرنے کی خاطر بتوں کے حق میں نازل شدہ آیات کو کسی حوالہ اور معتبر سند کے بغیر پیغمبر اکرم کو اس کا مصداق قرار دینے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ یہ جیسا کہ

پہلے بھی عرض کر چکا ہوں یہ دشمنیٔ رسولؐ و آلِ رسولؐ کے جذبات آج کوئی نئے نہیں ہیں اسکی ساکھ اِسلام کے ابتدائی دَور ہی سے قائم ہے اور اُس وقت سے اب تک سرکارؐ دو عالم کی عظمت و شان کو مجروح و سبک کرنے کی خاطر یہ ناپاک کوششیں جاری ہیں اور شیطان مختلف گلوں سے مختلف قِسم کی آوازیں پیدا کر کے دیندار لوگوں کو گمراہ کرنے کی سعیٔ ناکام کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

ستیزہ کار رہا ہے اَزل سے تا اِمروز ؛ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اب اگر پروردگار کی قسم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صرف ۶۳ سالہ حیاتِ دنیاوی ہے تو خداوند عالم کو حضرت نوحؑ کے حیات کی قسم کا ذکر کرنا چاہیے تھا جو کہ دو ہزار پانچسو سال تھی۔ یا پھر حضرت خضرؑ، حضرت الیاسؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے حیات کی قسم کھائی ہوتی۔ تو پروردگار کے اس قسم سے واضح ہے کہ جس حیات و موت کا گمان ان خارجی حضرات کو لاحق ہے۔ درحقیقت اس موت سے آنحضرتؐ کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ نظریہ "مرگِ پیغمبرؐ" ان لوگونکی بصیرت عقل و فہم اور معرفتِ دین کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ آنحضرتؐ کا فرمان ہے کہ "زمانے کو بُرا مت کہو اس لئے کہ زمانہ مَیں خود ہوں" (مدارج النبوۃ جلد "۱") اور پروردگار عالم نے بھی زمانے کی قسم کھا کر اپنے حبیبؐ کے اس فرمان کی تصدیق کر دی کہ "قسم ہے زمانے کی یقیناً انسان خسارے میں ہے" (سورۂ العصر آیات "۱، ۲")۔ اِس طرح متعدد مقامات پر مختلف حیثیتوں، مختلف عظمتوں کے ساتھ خداوند عالم نے سرکارؐ دو عالم کی قسم کا ذکر فرمایا ہے۔ جس سے آپؐ کی حیثیت و وجود اور منزلت کی شان ہویدا ہے۔ آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "ہم اور قیامت ساتھ ساتھ ہیں" اس کے علاوہ آپؐ کو آفتاب و ماہتاب سے بھی پروردگار نے قرآن مجید میں تشبیہ فرمائی ہے۔ اور آفتاب و ماہتاب کے لئے کم از کم قیامت سے پہلے تو فنا ثابت نہیں، جبکہ آفتاب و ماہتاب مختلف اوقات میں مختلف اُفق پر صرف طلوع و غروب ہوتے ہیں، فنا نہیں ہوتے۔ تو آفتاب و ماہتاب کے اس غروب و طلوع سے کوئی بدعقل ان کے "بِالکلیّۃ فنا" کا یقین کر لے تو اس کی بدعقلی، کج فہمی اور بے معرفتی پر حیف ہے۔ اس سے آفتاب کا وجود اور

اُس کی حقیقت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔

قرآن مجید میں پروردگارِ عالم نے حضرت ختمی مرتبت کو اس طرح سے بھی متعدد مقامات پر مخاطب فرمایا ہے "یاد کرو اُس وقت کو جب ابراہیم اور اسمٰعیل میرے گھر کی دیواروں کو بلند کر رہے تھے۔ یاد کرو اُس وقت کو جب یعقوب نے اپنی موت کو قریب پایا۔" اِس طرح کی متعدد آیات، قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اب اگر سرکارِ دو عالم کا وجود ان انبیاءِ کرام کے وقت موجود نہیں تھا اور آپ ان پر حاضر و ناظر "شاہد" گواہ نہیں تھے تو خداوند عالم نے یہ (معاذ اللہ) عبث کیا؟ جو یہ فرمایا۔ "یاد کرو" جب آپ تھے ہی نہیں تو یاد کیونکر دلایا جا سکتا ہے جس سے یہ اَمر واضح ہے کہ آپ پیکرِ بشری میں منتقل ہونے سے قبل کائنات پر شاہد تھے۔ تو آج پیکرِ بشری سے منتقل ہو جانے کے بعد بھی بعینہٖ اُسی طرح شاہد ہیں جس طرح قبل تھے۔ اب یہ اَور بات ہے کہ ہماری عقل، فکر اَور شعور اس کا اَدراک نہ کر سکیں لیکن حقیقتِ محمدیہ یعنی خلقتِ کائنات کا ماحصل اب بھی قائم و دائم ہے۔ اور اس حقیقتِ وجودِ محمدیہ کے حیات کی نفی کے لئے ہمارے پاس کوئی صحت مند نظریہ اَور نصِّ صریح موجود نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فکر و فہم میں کجروی قرآن مجید کی اس آیت کے سمجھ میں نہ آنے کا باعث ہے۔ "ہر نفس موت کا مزہ چکھے گا۔" (اٰلِ عمران آیت ۱۸۴)۔ تو عرض ہے کہ برادرِ محترم "موت کا مزہ چکھنا اَور ہے اور فنا ہو جانا اَور ہے۔" اس کے علاوہ موت مومن کے لئے صرف اِنتقال کی منزل ہے۔

آپ کی ۶۳ سالہ حیاتِ دنیاوی کو بھی پاک و پاکیزہ اَور شکوک و شبہات سے مبرّا رہنے نہ دیا گیا۔ بلکہ اسے بھی مشکوک و مشتبہ اور مشکوک کرنے کی ناپاک کوششیں کی گئیں۔ آپ کی حیثیتِ نبویؐ کو مشکوک کرنے کی خاطر یہ روایت وضع کی گئی کہ آپ کے ایک فرزند کا نام "عبد العزیٰ" تھا، جو بُتوں کے ناموں میں ایک نام ہے اور اس غلط خیال کو تقویّت دینے کی خاطر یہ تک لکھ دیا کہ خدیجہ (زوجۂ آنحضرت) چونکہ بت پرست (معاذ اللہ) تھیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے عقیدے کے تحت یہ نام رکھا ہوگا اور آپ چونکہ اُس وقت نورِ نبوّت سے آشنا نہ تھے (معاذ اللہ)

اس لئے آپؐ بھی معترض نہ ہوئے ہوں گے۔ دیکھئے ایک جھوٹ کو نباہنے کے لئے کتنے جھوٹ بولنے کی ضرورت پڑی، چنانچہ ملاحظہ فرمائیں :۔" یہ روایت خود امام بخاری کی "تاریخ صغیر" میں موجود ہے، لیکن اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس سے آنحضرت کی نسبت کیونکر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ اسلام سے پہلے بت پرست تھیں، انھوں نے یہ نام رکھا ہوگا، آنحضرت ابھی تک منصب ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے، آپؐ نے تعرض نہیں فرمایا ہوگا۔" (سیرۃ النبیؐ جلد ا صفحہ ۱۴۹) اس روایت کے تحت آنحضرت چالیس سال تک منصب رشد و ہدایت سے الگ تھے۔ اور جناب خدیجہؓ کے بت پرست ہونے کے ضمن میں شبلی صاحب صرف قیاسی گھوڑے ہی دوڑاتے رہے کوئی واقعہ، کوئی روایت اس ضمن میں پیش نہ کر سکے۔ اور نہ ہی احقر کی نگاہوں سے کوئی ایسی روایت یا کوئی ایسا واقعہ گزرا ہے جس سے حضرت خدیجہؓ کا قبل اسلام بت پرست ہونا ثابت ہوتا ہو۔ اگر تاریخ اسلام کو دیانتداری سے لکھا گیا ہوتا تو اعلان اسلام کرنیوالوں میں حضرت خدیجہؓ کے بعد پہلا نام ان کے چچا ورقہ بن نوفل کا ہوتا۔ بہر طور پروردگار عالم نے تو آنحضرتؐ کے آباؤ اجداد کی بیویوں میں سے کسی کو کافرہ یا مشرکہ نہ ہونے دیا۔ لیکن اب یہ ملت کی معرفت رسولؐ اور منزلت رسولؐ سے آگاہی ملاحظہ فرمائی کہ آپؐ کی شریک کار، شریک حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جیسی پاک و ایماندار زوجہ کو جسے دور جاہلیت عرب میں بھی "طاہرہ اور ملیکۃ العرب" کہا جاتا تھا، اب انھیں بھی کافرہ اور مشرکہ کی حیثیت دیجا رہی ہے اور یہ صرف اس وجہ سے کیا جا رہا ہے کہ جناب خدیجہؓ کا وہ احسان ہے آنحضرت اور اسلام پر کہ قیامت تک مسلمان اس احسان کا بدلہ نہیں دے سکتے۔ چونکہ جناب خدیجہؓ نے خلوص دل سے آنحضرت اور اسلام کی خدمت کی ہے، اس لئے وہ بت پرست تھیں حیف ہے اس جذبۂ ایمانی اور دعوئے الفت رسولؐ پر۔ حضرت خدیجہؓ کو بت پرست ثابت کرنے کی کوشش کیوں کی جارہی ہے اس لئے کہ آنحضرتؐ کی نسل پاک جناب خدیجہؓ سے آگے بڑھی اور اولیاء اہلبیت اطہار حضرت خدیجہؓ ہی کی اولاد سے پیدا ہوئے اسلئے کوشش یہ کی جارہی ہے کہ جناب خدیجہؓ کی عظمتوں اور کرامتوں کے ساتھ انکی حیثیت و منزلت کو مشتبہ کر دیا جائے تاکہ رسول اکرمؐ کی نسل یعنی بنی ہاشم کو بنی امیہ پر جو عظمت و بزرگی حاصل ہے وہ نہ صرف

یہ کہ مشکوک ہو جائے بلکہ ناقابلِ ذکر فضیلت قرار پائے جو ایک عمومی سطح سے بلند نہ دکھائی دے۔
لیکن قدرت نے جن بزرگوں کو عظمت و بلندی دی ہے وہ آج بھی سربلند ہیں اور مسلمانوں کی گردنیں
ان عظیم شخصیتوں کی بارگاہ میں آج بھی عظمت و احترام کیساتھ خم ہیں۔ اور جب بھی ان کے نام لبوں پر آتے
ہیں مومنین کے ساتھ ملائکہ بھی ان ہستیوں پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ)۔

اب اس روایت کی روشنی میں آنحضرتؐ چالیسؔ سال تک منصبِ رُشد و ہدایت سے
ناآشنا تھے (معاذ اللہ) اسطرح آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک بڑا حصّہ تو "دَورِ جاہلیت" کی نذر ہوگیا، اب
بچے آپؐ کی رسالت و نبوت کے ۲۳ سالہ دَورِ حیات تو اس دَورِ حیات کے بارے میں بھی دشمنی کے
جذبات ملاحظہ ہوں، علامہ شبلی نعمانی صاحب فرماتے ہیں "وہ آنحضرتؐ سے جو افعال و اقوال
مروی ہیں اُنکی ۲ دو قسمیں ہیں۔ ایکؔ وہ جو منصبِ نبوّت سے تعلق رکھتے ہیں انکی نسبت خدا کا
ارشاد ہے کہ پیغمبرؐ جو کچھ تمہیں دیں لے لو۔ اور جس چیز سے روکیں اُس سے باز رہو۔ دوسریؔ وہ جسکو
منصبِ نبوّت سے تعلّق نہیں، چنانچہ ان کے متعلق آنحضرتؐ نے خود ہی ارشاد فرمایا "مَیں بشر ہوں
اِسلئے جب مَیں دین کی بابت حکم دُوں تو اسکو لو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو مَیں ایک
بشر ہوں"۔ (الفاروق حصّہ دوم صفحہ ۳۵) اور ازالۃ الخفاء حصّہ دوم صفحہ ۸۴) مسلمان بتلائیں کہ اَب
اسے عظمتِ نبوّت و رسالت کا کونسا درجہ اور غلامی و محبّتِ مصطفٰےؐ کی کونسی منزل قرار دیجائے ؟
پہلے آپؐ کی حیاتِ طیبہ کی ایک طویل مدّت (چالیسؔ سالہ حیات) کو دَورِ جاہلیت کا شکار قرار دیکر
منصبِ نبوّت سے الگ کر دیا باقی بچے ۲۳ سال مگر اس ۲۳ سال کو بھی نبوی حیثیت سے دل و دماغ
اور قلب و نظر نے قبول نہیں کیا۔ اسے بھی ۲ دو حیثیتوں پر منقسم کر دیا۔ (۱) نبوی حیثیت (۲) بشری حیثیت
اور بشری حیثیت جس میں امّت اتّباع و اطاعتِ رسُولؐ سے باہر ہے اس کیلئے علامہ شبلی نعمانی صاحب
کوئی قرآنی استدلال پیش نہ کر سکے۔ اور آپؐ کی بشری حیثیت کیلئے ایک حدیث پیش کرتے ہیں جبکہ حضورؐ کا
فرمان ہے کہ قرآن کی مخالفت میں اگر کوئی حدیث تم تک پہونچے تو اُسے رد کر دو چاہے اسکا راوی
کوئی بھی ہو۔ اطاعتِ رسُولؐ اور آپؐ کی عصمتِ نبوّت قرآن سے ثابت ہے۔ ان لوگوں کی ان

قلابازیوں کا مقصد یہ ہے کہ جن اُمور میں مُختلف مقامات پر منافقین نے جو آپؐ کے احکام اور اطاعت و اِتّباع سے یکسر اِنحراف و مخالفت کی ہے تو ان منافقین کے ان بے دین جذبات و عمل (اطاعتِ رسُول سے اِنحراف) کو تحفّظ فراہم کرنیکی خاطر رسُول اکرم کی حیثیت و منزلت اور آپکے منصب نبوّت میں ہی اِشتباہ پیدا کر دیا جائے۔ اِسلئے آپکی حیاتِ طیّبہ کو دو حصّوں پر منقسم کر دیا گیا۔ بحیثیت نبوّت اور بحیثیت بشر۔ کیا آپؐ کی وہ حیثیت جسے خارجی حضرات بحیثیت نبوّت کے قبول کرتے ہیں، اسوقت آپکی بشری حیثیت سے علیٰحدہ ہونے کی کوئی دلیل ہے کہ اُسوقت آپکی یہ حیثیت رخصت ہو جاتی تھی؟ جب آپکی شرعی (نبوی) حیثیت میں وجود بشری کی نفی ممکن نہیں تو بشری حیثیت میں آپکی صفتِ نبوّت کیونکر رخصت ہو سکتی ہے؟ میں سمجھتا ہوں جسطرح آپکی نبوی حیثیت سے صفتِ مخلوق اور بشریت کو جدا نہیں کیا جا سکتا، اسیطرح آپکی بشری حیثیت سے نبوّت اور رُشد و ہدایت کے منصب کو بھی آنِ واحد کیلئے علیٰحدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ذکر ہوا کہ "محمدؐ کچھ نہیں ہیں مگر رسول"، تو یہ رسالت و نبوّت ہمہ وقت آپؐ کیساتھ ہے۔ یہ آپکو منصبِ نبوّت سے بلا دلیل بغیر سند اور بغیر کسی حکم کے علیٰحدہ کر کے اور خواہ مخواہ میں بشری حیثیت کی لاحاصل بحث چھیڑ کر ملّت کو گمراہ کرنیکی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے اِن لوگوں کا مقصد صرف توہینِ رسُول اور اپنے جذبۂ منافقت کی آسودگی اور آئینِ خداوندی سے اِنحراف کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ رسُول ہر حالت میں اور ہر عالَم میں رسُول ہیں اور واجب الاطاعت ہیں۔ اب چاہے آپؐ میدانِ جنگ میں ہوں یا اپنے دولتکدہ میں۔ آپؐ محرابِ مسجد میں ہوں یا سفر میں، آپؐ حالتِ صحت میں ہوں یا عالَمِ مرض میں کسی وقت اور کسی بھی عالَم میں ملّت کی کسی بھی فرد کو آپؐ کے کسی بھی حکم سے اِنحراف کی رخصت و اجازت حاصل نہیں۔ اگر کسی نے بھی آپؐ کے احکام کی اطاعت سے آنِ واحد کیلئے بھی اِنحراف کیا تو اُسکے تمام اعمال حبط ہو جائیں گے جسکا شعور خود اُسے بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔

اِسلام میں یہ چاروں فقہی ائمّہ کرام یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے بارے میں کوئی جھوٹی سے جھوٹی روایت بھی احقر کے

نظروں سے نہیں گزری جس میں ان بزرگوں میں سے کسی ایک نے بھی یہ کہا ہو کہ "میں اسوقت امام ہوں جب تک مدرسے میں یا مسجد میں قیام پذیر ہوں، اسکے بعد جب میں اپنے گھر میں بیوی بچوں کے پاس چلا جاؤں تو ایک بشر ہوں، اب اسوقت کے میرے حکم کو چاہے تم مانو یا نہ مانو جو میری رائے اور قیاس پر مبنی ہو۔ اس لئے کہ میں ایک بشر ہوں"۔ لطف کی بات تو دیکھئے کہ اُمّت کے مجتہدین اور ائمۂ فقہ و حدیث تو ہر وقت اور ہر حالت میں امام ہیں، انکی رائے اور اجتہاد قیاسی تو مِلّت کیلئے قابلِ اتّباع و پیروی ہے اور اسے نصِّ قطعی کی حیثیت حاصل ہے۔ اور انکی حیثیت بشری مانع اطاعت نہیں یہ ہر وقت لائق تقلید و اتّباع ہیں۔ لیکن سرکارِ دو عالم کے احکام کو ایک مفروضہ اور خود ساختہ نظریہ "بشری رائے" قرار دیکر آپؐ کی اطاعت و اتّباع سے انحراف کرنے کا نام "اجتہاد" رکھا جائے۔ جبکہ پروردگارِ عالم کا حکم صریح ہے کہ "رسُول اپنی ہوس (رائے) سے گفتگو نہیں کرتے جو کچھ وہ کہتے ہیں "وحیِ الٰہی" سے کہتے ہیں"۔ ایسے معصوم اور تابع مرضئ مولا رسُول کے متعلّق یہ "بشری رائے" کا نظریہ کہاں تک درست قرار دیا جا سکتا ہے اگر بفرضِ محال کسی امر میں آپکا ارشاد صرف آپؐ ہی کی ذات اور صوابدید پر منحصر ہو تب بھی مِلّت کی کسی فرد کو آپکے کسی فرمان سے سرتابی کی اجازت حاصل نہیں تاوقتیکہ وہ اسلام سے خارج نہ ہو جائے۔ اسکے علاوہ تاجدارانِ بنی عبّاس و بنی اُمیّہ میں سے کسی ایک حکمران کے بارے میں ذکر نہیں ملتا کہ جب تک وہ مسندِ حکومت پر رہیں تو وہ تاجدار ہیں اور ان کے تمام احکام فرامین لائقِ اطاعت ہیں۔ اور جب محل میں محفل رقص و سرود میں ہوں تو انکے احکام کی پابندی رعایا پر نہیں اسلئے کہ وہ بھی تمہاری طرح کے ایک بشر ہیں۔ مُختلف ممالک کے سفراء ہمارے ملک میں موجود ہیں جو اپنے ملکوں کی ہمارے یہاں نمائندگی کر رہے ہیں۔ اب اگر یہ اپنے دفتروں سے باہر اپنی نجی محفلوں میں (بیوی بچّوں کیساتھ) ہوں تو کیا اسوقت یہ اپنی حکومتوں کے نمائندے اور سفیر شمار نہیں کئے جائیں گے؟ تو کیا ایسی حالت میں انکے احکام، معاہدے تسلیم نہیں کئے جائینگے؟ اور یہ کہکر ناقابلِ اعتناء قرار دیا جائیگا کہ یہ معاہدہ انھوں نے ایک بشری حیثیت سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابھی

تک تو ایسا نہیں ہوا۔ تمام ملکوں کے سفیر ہر وقت اور ہر حالت میں اپنے ملک اور سربراہِ مملکت کے نمائندے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہر قول و فعل میں اپنی حکومت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اب چاہے وہ کسی بھی مجلس میں معاہدہ کرے یا کہ دفتر میں یا اپنے گھر میں اسکی حیثیت اپنے ملک و مِلّت کے نمائندے کی ہوگی اور اسکے لئے یہ نظریہ "بشری رائے" بے معنی و بے مقصد، لاحاصل، اور بے بنیاد قرار دیا جائے گا۔ لیکن کتنے افسوس اور بدعقلی کی ہے یہ بات کہ جو خالق حقیقی اور مالک کائنات کا نمائندہ ہے اور اسکا یہ عالم ہے کہ ایک وقت تو وہ خالق کا نمائندہ ہے۔ اور دوسرے وقت وہ عام بشری حیثیت میں تبدیل ہو جاتا ہے (معاذ اللہ) جبکہ آپکی وجودی حیثیت "ہادی" کیلئے مُہرِ نبوّت ہر وقت آپکے ساتھ ہے۔ اب وہ لوگ جو بعض احکام میں آنحضرت کو منصبِ نبوّت سے علٰحدہ قرار دیکر آپ کی مرعی "نبوی حیثیت" کی نفی کرنا چاہتے ہیں تو اُنکے پاس اس توہینِ رسُول کی ببدین جسارت کیلئے دلیل محکم اور نصِّ قطعی کیا ہے؟

والیانِ ریاست، رہبرانِ سیاسی، ائمۂ حدیث و فقہ یہاں تک کہ مسجد و مدرسہ کے امام استاد تو ہر حالت میں اور ہر وقت اپنے اپنے عہدوں پر قائم رہتے ہیں اور ان کے احکام و فرامین اور ہدایات بھی ہر حالت میں لائقِ اتّباع و پیروی ہوتے ہیں۔ لیکن کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ یہ باطل نظریہ "سرکارِ دو عالم جو عالمین کیلئے رحمت و نذیر اور کائنات پر شاہد ہیں اور آپکی رسالت و نبوّت آفرینشِ کائنات سے لیکر تا قیام قیامت قائم اور واجب الاطاعت ہے وہ کبھی تو بشر ہو جاتے ہیں کبھی رسول (نمائندۂ خالق) رہتے ہیں، اور پھر کچھ دیر کے بعد یہ عہدۂ نبوّت آپ سے (معاذ اللہ) رخصت ہو جاتا ہے اور پھر آپکی حیثیت ایک عام اُستاد یعنی بشر سے بھی (معاذ اللہ) پست ہو جاتی ہے کہ اُمّت اپنی غیر معصوم رائے اور فکر پر اعتماد کرکے عمل تو کر سکتی ہے لیکن رسُول کی بشری فکر یعنی رائے اس حد تک ناقابلِ اعتماد و عمل ہو جاتی ہے کہ امّت کو اُسکی رائے پر عمل کرنیکی بجائے اپنی فکر و رائے پر عمل کرنا چاہیئے اور رسُول کی فکر و رائے کو ناقابلِ اعتنا سمجھنا چاہیئے (معاذ اللہ) اور یہ کہ اُمّت کی نگاہوں میں اگر رسُول کی رائے اور فکر صحیح دکھائی دے تو وہ اُس پر عمل کرے۔

ورنہ اپنی رائے اور اجتہاد پر عمل کرے۔ یعنی رسول کی فکر و رائے عام بشری فکر و رائے سے بھی پست ہے (معاذ اللہ) اس لئے امت اپنی فکر و رائے پر عمل کرے اس منزل پر نہ اسے اطاعت و رسول سے کوئی غرض ہے نہ اتباع کی۔ بہت خیریت ہوئی کہ یہ نہ لکھا کہ ایسی حالت میں (یعنی بشری رائے) رسول کو خود امت کی اطاعت و پیروی کرنی چاہیئے تھی۔ ع

"تمہیں کہو کہ انداز گفتگو کیا ہے۔"

کیا اسی کا نام اطاعت مصطفےٰ اور غلامی رسول ہے ؟

ملبوس کی نورانیت

تمام مورخین اور محدثین اس امر پر متفق ہیں کہ آنحضرت کے پیکر بشری کا سایہ نہ تھا آپکا پیکر بشری اتنا لطیف تھا کہ مادی[1] نورانیت اس پر اثر پذیر نہیں ہوتی تھی۔ اور پاک و شفاف ایسا کہ اس پر مکھیاں بھی نہ بیٹھتی تھیں۔ اس کے علاوہ آپؐ جن راستوں سے گزر جاتے ایک مدت تک وہ تمام راستے خوشبو سے معطر رہتے۔ رات کی تاریکیوں میں آپکا یہ پیکر بشری اتنا منور رہتا تھا کہ حضرت عائشہؓ اپنی کھوئی ہوئی سوئی اس کی نورانیت میں تلاش کر لیتی تھیں۔ آپؐ اپنے عقب کی چیزوں کو بھی اسی طرح سے دیکھتے تھے جسطرح نظروں کے سامنے کی اشیاء کو دیکھتے تھے اور جبکہ ہم عقب کی چیزوں کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آپکا ارشاد ہے کہ "ہماری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں جبکہ قلب جاگتا ہی رہتا ہے" یعنی آپؐ پر غنودگی یا بیخبری کا غلبہ نہیں ہوتا۔ خداوند عالم کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ نہ اسے نیند آتی ہے نہ غنودگی۔ تو پروردگار نے اپنی صفت کا بھی مظہر اپنے اس عبد خاص کو باوجود بشر کے حامل قرار دیا۔ اس کے علاوہ آپؐ اس پیکر بشری کے ساتھ حدود ممکن کی اس حد آخر تک گئے جہاں تک نورانی پیکر رکھنے والے فرشتے بھی اس حد تک نہیں جا سکتے۔ کیا اس وضاحت کے بعد بھی امت مسلمہ میں کوئی فرد ایسی ہے کہ جسے بشریت محمدؐ کے مماثل یا خیر البشر کہا جا سکے؟ اور اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھیئے کہ انبیاء کرام باوجود معصوم ہونے کے "خیر البشر" نہیں تو پھر غیر معصوم شخصیتیں کیونکر خیر البشر ہو سکتی ہیں۔ نبی اکرمؐ کا پیکر بشری بھی کس حد تک لطیف و اعلیٰ ہے کہ جس کی برابری ملائکہ باوجود نورانی جسم رکھنے کے

نہیں کر سکتے۔ اسکے علاوہ یہ مثال بھی قابلِ غور ہے کہ اگر کسی بیمار کو نصف شب میں طبیب کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تو وہ حکیم کو اسکے اہل وعیال کے درمیان سے اٹھوا کر نصف شب کو بلوا لیتا ہے اور حکیم کے تمام حکم ومشوروں پر عمل کرتا ہے' لیکن کبھی بھی کسی طبیب نے یہ نہیں کہا کہ میں مطب کے باہر ایک بشر ہوں۔ اگر میری رائے تابع حکمت اور سود مند نظر آئے تو اُس پر عمل کیا جائے ورنہ میں ایک بشر ہوں اور مریض اپنی رائے اپنی صوابدید پر عمل کرے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی مثال یا کوئی واقعہ ایسا گزرا ہے؟ پھر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ دین ودنیا کی وہ عظیم ہستی جسے خلّاقِ عالم اور حکیمِ مطلق نے اپنا نائب' صاحبِ حکمت اور طبیبِ روحانی قرار دیا ہے۔ اسے یہ اُمّت کبھی تو نبی مانتی ہے اور کبھی بشری قوّت سے اس حد تک مغلوب قرار دیتی ہے کہ اسکی فکر وشعور اتنی پست ہو جاتی ہے کہ اسکی رائے بھی اُمّت کیلئے قابلِ اتباع نہیں رہتی۔ اُمّت اپنی تو صوابدید پر بھروسہ کر سکتی ہے لیکن نبی صائبُ الرّائے بشری حالت میں نہیں رہتا اور نہ ہی اسکی صوابدید پر عمل اُمّت کیلئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ اُمّت چاہے تو نبی کے بشری احکام پر عمل کرے یا اپنی رائے' پسند اور صوابدید پر عمل کرے مگر جس وقت کہ نبی کو اس عام اور پست بشری حیثیت میں گمان کیا گیا ہے اُس وقت اُمّت کی بشری تقاضے اور حیثیتیں کیا نبیؐ اکرم سے اعلیٰ وارفع منزلت پر فائز تھیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ سرکارِ دوعالم کی بشری رائے باوجود نبی ورسول ہونے کے ناقابلِ عمل اور لائقِ توجّہ نہیں؟ اور اُمّت باوجود نبی نہ ہونیکے صرف "بشر محض" کی حیثیت میں اتنی صائبُ الرّائے اور فکر وشعور میں اتنی ارفع اور اعلیٰ قرار دی گئی کہ نبی کی رائے باوجود نبی ہونے کے قابلِ رد ہے اور اُمّت جو ہر آن وہر لمحہ محتاج ہدایت ہے۔ اسکی رائے کو نبیؐ اکرم کی رائے پر فوقیت دیدی گئی۔ (استغفر اللہ ربّی واتوبُ الیہ) ؎

کعبہ کس مُنھ سے جاؤ گے غالبؔ ؎ شرم تم کو مگر نہیں آتی

اب شبلی صاحب کا یہ عقیدہ کہ "جب میں دین کا حکم دوں تو لے لو اور جب اپنی رائے سے کہوں تو ایک بشر ہوں" کیا حیثیت و وقعت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے؟ حقیقتِ امر تو یہی ہے کہ اس قسم کی روائتیں بنی اُمیّہ نے اپنے دورِ اقتدار میں وضع کروا کر مشہور کروائیں جس سے

ان کا مقصد ایک طرف تو بنی ہاشم یعنی سرکارؐ دو عالم کی دشمنی کے جذبات اور آتشِ حسد کی آسودگی تھی اور دوسری طرف اپنی غیر اسلامی معاشرت اور بے دین جذبات و کردار کی پردہ پوشی تھی کہ جب پیغمبرِ خاتمؐ باوجود نبی ہونے کے بشری تقاضوں سے متاثرؒ تھے اور آپؐ کے بعض احکام صرف بشری جذبات کے زیرِ اثر تھے (معاذ اللہ) تو فرمانروائے مملکت بھی تو آخر بشر ہی تو ہیں اگر یہ اسلام کے منافی جذبات و کردار کے حامل ہیں تو کیا ہوا بشر آخر بشر ہے کوئی فرشتہ تو نہیں جو خطا و جرم کا مرتکب نہ ہو یعنی سرکارؐ دو عالم کی نبوی سطح اور ملوکیت کی سیاسی سطح کو متوازن اور مساوی قرار دینے کی خاطر اس نظریہ اور بے بنیاد عقیدے کو ہوا دی گئی۔ لیکن پروردگار عالم نے رسولؐ اکرم کی اس بشری حیثیت ہی کو قابلِ اطاعت، لائقِ پیروی قرار دے کر ایمان و کفر کے مابین ایک امتیازی حدِّ فاصل قرار دے دیا ہے کہ "رسولؐ جو کچھ تمہیں دیدے اسے لے لو، اور جس امر سے تم کو منع کرے رُک جاؤ۔" اس میں اب رسولؐ کے احکام شرعی ہوں یا بشری، ہر حکم قابلِ اتباع و اطاعت ہے ورنہ اسکے خلاف یقین و عمل خدا و رسولؐ کے خلاف بغاوت قرار دی جائیگی اور جس کے نتیجہ میں اعمالِ صالحہ بھی حبط کر لئے جائیں گے۔ اسلئے فرمانِ رسولؐ سے یہ کہکر انحراف کرنا کہ "بشری رائے" ہے اِنتہائی غلط اور بے دین فیصلہ ہے جسکی قرآن میں کہیں بھی حمایت نہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالےٰ ہے کہ رسولؐ ہوا و ہوس سے گفتگو نہیں کرتے۔ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی آیت کے اس حصّے نے رسولؐ اکرم کی حیثیتِ بشری کو واضح اور معیّن کر دیا ہے کہ ہوا و ہوس جو حیوانی اور بشری فطرت ہے رسولؐ اکرم اس حیوانی و بشری فطرت و جذبے سے بھی مغلوب نہیں جس سے یہ امر واضح ہوا کہ آپؐ کو عام بشری درجہ پر گمان نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ آیت کے بعد کا حصّہ نہ صرف یہ کہ عالم بشریت میں بھی آپؐ کو ممتاز منزلت و مقام اور ارفع و اعلیٰ مدارج پر فائز قرار دیتا ہے بلکہ آیت کے اس حصّے نے آپؐ کی فکر و شعور اور "بشری حیثیت" پر بھی حصار قائم کر دیئے ہیں کہ آپؐ بحیثیتِ بشر کے بھی ہر امکانی خطا، فکر و شعور میں ہر قسم کی لغزش سے پاک و منزّہ ہیں۔ "آپؐ وحیِ الٰہی کے بغیر گفتگو تک نہیں کرتے"۔ اس سے یہ امر کہ رسولؐ بحیثیت بشر کے بھی واجب الاتّباع و اطاعت ہیں۔

ثابت ہے اور اس آیت نے آپکی بشریت کو تابع مرضئ معبود قرار دے کر آپکی حیاتِ طیبّہ کے ہر آن و ہر لمحہ کو دائرۂ عصمت میں محصور کر دیا ہے جس کے بعد رسُول اکرم کے کسی حکم اور کسی فرمان کو بشری رائے کہنے کی اُمّت مجاز نہیں، جس آیت سے آنحضرت کی بشری حیثیت پر مُوشگافیاں کیجا رہی ہیں، وہ سورۂ کہف کی یہ آیت ہے "قُل اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُم یُوحیٰ اِلَیَّ" ترجمہ:- کہد یجئے میں تمہارے مثل بشر ہوں (مگر) صاحب وحی ہوں۔ (سورۂ کہف آیت نمبر ۱۱۰) اس آیت سے صرف اس حصّے "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُم" کو اختیار کرنا اور اس سے آنحضرت کی بشریّت پر حرف گیری کرنا، فکر و شعور اور معرفت دینی میں کج فہمی کا نتیجہ ہے حقیقتِ امر تو یہی ہے کہ اس آیت نے بھی آپکو عام زمرۂ بشری سے مُبرّا اور مُنزّہ قرار دے رکھا ہے اور یہ آیت آپ کی اطاعتِ مطلقا پر دلیل ہے۔ اس لئے کہ پروردگار عالم آپکو بحیثیت بشر تابعِ وحی قرار دے رہا ہے یعنی آپ بحیثیت بشر ہی تو تابع وحی ہیں۔ آپکی بشری حیثیت ہی تو منزلتِ نبوّت و رسالت پر فائز ہے اور تابعِ وحی ہے تو پھر آپ بحیثیت بشر نبوّت و رسالت سے باہر کب ہیں؟ کہ جس کے بعد کسی کو دریدہ دہنی کا موقع حاصل ہوا کہ "جب میں دین کی بابت حکم دوں تو لیلو اور جب اپنی رائے سے کہوں تو ایک بشر ہوں" ان آیات کی روشنی میں یہ قول بے بنیاد قرار پاتا ہے اور خود آنحضرت کا ارشاد ہے جو" قول قرآن کے مخالف ہو اُسے دیوار پر دے مارد جاہے اُسکا راوی کوئی بھی ہو" تو یہ قول" بشری رائے" بھی دیوار پر دے مارنے کے لائق ہے اس لئے کہ یہ منشائے الہٰی اور آیاتِ قرآنیہ کے مخالف ہے۔ در اصل افکار میں لرزش کی وجہ یہ ہے کہ اُمّت اپنے نفوس کے آئینے میں نفسِ پیغمبرؐ کو بھی دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی۔ اور اب بھی ہے جسکے اصلاح کی ذمّہ داری علمائے کرام پر عائد ہوتی ہے۔

جہاں تک نفس کا تعلّق ہے تو" آلعمران" میں ارشاد ہوا کہ " ہر نفس موت کا مزا چکھے گا" تو عزیزانِ محترم موت کا مزا چکھنا اور ہے اور فنا ہو جانا نفسوں کا اور ہے اگر ہر نفس فنا ہو جاتا ہے تو پھر شہدا کیلئے جو یہ ارشاد ہوا کہ "اَحیاءٌ" زندہ ہیں کیا مقام اور حیثیت باقی رہتی ہے؟

نفوس کی حیات کو بھی، آیئے قرآن میں تلاش کریں لیکن پہلے حضرت عبدالحق محدث دہلوی کا بھی عقیدہ و نظریہ ملاحظہ فرمائیں "اور اگر کوئی کہے کہ قرآن کریم حضور اکرم کی موت پر ناطق ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا " اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ ۔ (بیشک تمہیں انتقال فرمانا ہے اور انکو بھی مرنا ہے) اور حضور سیّد عالم نے فرمایا " میں انتقال فرما جانے والا شخص ہوں " اور صدیق اکبرؓ نے فرمایا بلاشبہ محمد مصطفےٰ یقیناً انتقال فرما چکے ہیں اور اس رحلت و موت پر اُمّت کا اجماع ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ حضور انور سیّد عالم نے یقیناً موت کا درد و الم اور اُسکا ذائقہ چکھا اور رحلت فرما گئے لیکن بعد ازاں حق تعالیٰ نے آپکو زندہ فرما دیا ۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ میں خدا کے نزدیک اس سے زیادہ مکرّم ہوں کہ وہ مجھے قبر میں چالیس دن سے زیادہ رکھے ۔ نیز حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے ۔ لہٰذا حضور اکرم حیات جسمانی، دنیاوی اور بدنی حیات کے ساتھ زندہ ہیں جو آپؐ رکھتے تھے ۔ یہ حیات شہداء کی حیات سے زیادہ کامل ہے کیونکہ شہداء کی حیاتِ روحانی اور اُخروی ہے اور یہ روح کیلئے ثابت ہے، اور حق تعالیٰ قادر ہے کہ انکی روحوں کے لئے اجسام مثالیہ اس عالم میں پیدا فرمائے یا انھیں بدنوں میں رکھے جو ان کیلئے ظروف کا حکم رکھتے ہیں

انھیں خصائص میں ہے کہ نبیؐ کریم اپنی قبرِ انور میں زندہ ہیں اسیطرح تمام انبیاءِ کرام بھی حضور انور اذان و اقامت کیساتھ نماز ادا کرتے ہیں ۔ ابنِ زبالہ اور ابنِ نجار بیان کرتے ہیں کہ ایّامِ حرّہٗ مدینہ (یہ وہ زمانہ ہے کہ یزیدی لشکر نے مدینۂ منوّرہ پر حملہ کرکے صدہا صحابہ کو شہید کیا۔ عورتوں کی عصمت دری کیں ۔ اور مسجدِ نبویؐ میں گدھے اور گھوڑے باندھے (العیاذاً باللہ تعالیٰ) کے موقع پر مسجدِ نبویؐ شریف میں تین ۳ دن تک اذان نہ ہوئی اور لوگ مدینہ چھوڑ کر باہر نکل گئے تھے ۔ اسوقت حضرت سعید ابنِ مسیّبؓ مسجدِ نبوی شریف میں رہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب ظہر کا وقت آیا تو میں متوحّش و پریشان ہوگیا اور قبر انور کے پاس چلا گیا اور اذان کی آواز میں نے سُنی اور نمازِ ظہر ادا کی ۔ اس کے بعد ہر نماز کے وقت قبر شریف سے اذان و اقامت کی آواز سنتا رہا یہاں تک کہ تین ۳ راتیں گزر گئیں ۔ پھر جب لوگ واپس آئے تو انھوں نے بھی ویسی ہی اذانیں سُنی، جیسی کہ میں سُنتا رہا،

(مدارج النبوۃ جلد" ۱" صفحہ ۲۵۶ تا ۲۵۸) -

آپ تاریخ وسیرت اور حدیثوں کی تمام کتابیں دیکھ جائیں کسی میں بھی یہ مذکور نہیں ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے انتقال کے بارے میں موت (فنا) کا ذکر فرمایا ہو۔ آپؐ نے جو اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں ارشاد فرمایا وہ یہ ہے کہ پروردگار عالم نے مجھے اختیار دیا ہے کہ مَیں چاہوں تو اسی دُنیا میں رہوں یا چاہوں تو لقائے رَب کو اختیار کروں۔ لیکن مَیں اِس دُنیا پر اپنے رَب کی مرضی ومنشاء کو ترجیح دیتا ہوں۔ وَیسے تو تمام مورخین، محدّثین اور سیرت پر لکھنے والوں نے اِسے لکھا اور یہ تمام اکابرینِ ملّت اس اَمر میں متفّق اور متحد ہیں لیکن مَیں اِسے عبدالحق صاحب دہلوی کی تحریر کی روشنی میں لکھتا ہوں " مواہب میں سہیلی سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا کہ مَیں نے واقدی کی بعض کتابوں میں دیکھا ہے کہ سب سے پہلا کلمہ جو حضوؐر اکرم نے حلیمہ سعدیہؓ کے یہاں زمانۂ رضاعت میں فرمایا وہ " اللہ اکبر" ہے۔ اور آخری کلمہ جو حضوؐر اکرم نے ارشاد فرمایا وہ " وَالرَّفِیْقُ الْاَعْلیٰ " تھا۔ (مدارج النبوۃ جلد" ۲" صہ ۴۲۸) ان وضاحتوں اور تذکروں کی موجودگی میں بھی کسی کا یہ کہنا کہ نبیؐ وفات پاگئے اور وَفات سے فنا مُراد لینا کس حد تک عقل وفہم میں کجی ہے اِسے قارئین خود غور فرمائیں کہ نبیؐ کریم کے فنا یعنی موت کا عقیدہ کہاں تک صحیح قرار دیا جاسکتا ہے، اَب جہاں تک نفوس کے موت کا مزہ چکھنے کا ذکر ہے تو مَیں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ موت کا مزہ چکھنا اور ہے اور فنا ہو جانا اور ہے۔ موت کا مزہ چکھنے کے بعد یہ کوئی لازمی نہیں کہ تمام نفوس فنا ہو جائیں، جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مَیں نے اپنے " الرَّفِیْقُ الْاَعْلیٰ " کی قربت کو پسند فرمایا ہے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ مَیں نے موت (فنا) کو لبّیک کہی ہے۔ اَب قربتِ الٰہی کو حضوؐر کا پسند فرمانے سے یہ مطلب نہیں کہ پروردگار عالم عرش وکرسی یا کسی اور دوسرے مکان میں سکونت پذیر ہے اور آپؐ اس سے قریب ہوگئے ہیں۔ " رَفیقِ اعلیٰ " کی قربت سے مراد لقائے رب ہے کہ آپؐ نے اپنے وجود، اپنی مرضی کو تابع مولا کر رکھا ہے۔ اور اسکی منشاء کے سپرد کردیا ہے۔ اَب اگر ربّ العزّت کی مرضی یہ ہے کہ آپؐ اس دُنیا سے اور پیکرِ بشری سے منتقل ہو کر جہاں خالقِ اکبر آپؐ کو لیجانا چاہتا ہے، آپؐ اسکی مرضی کے تابع ہیں اور آپکا اِس دُنیا

سے سفر فرمانا بھی ضروری تھا اسلئے کہ آپؐ اس زمین اور صرف اس عالم ہی کیلئے تو مبعوث نہیں ہوئے۔ آپؐ عالمین کیلئے نذیر و رحمت ہیں تو اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسے کتنے عالم اُسنے خلق فرمائے ہیں اور آپؐ کو اُن کیلئے وسیلۂ رحمت قرار دیا ہے۔ حدیثِ قدسی میں آیا ہے کہ "میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو ایک مخلوق کو خلق کیا" حضورِ اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ سب سے پہلے خدا نے میرے نور کو خلق کیا اور میرے نور سے میرے اہلبیتؑ خلق ہوئے۔ ہماری عبادتوں کو دیکھ کر ملائکہ نے عبادت کے طریقے سیکھے"۔ یعنی پروردگارِ عالم کی معرفت، اسکی عبادت و بندگی کے قائم ہونے کا سبب اور ذریعہ آپکی ذاتِ اقدس بنی۔ تو جب تک کائناتؑ میں ہدایت و معرفت کی ضرورت ہے سرکارِ دو عالم کا وجود لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قرآن اشیاءِ عالم کے فنا کا کلّی طور پر ذکر کرتا ہے تو اس میں استثنیٰ کو برقرار رکھتا ہے مثلاً "کُلُّ شَیءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجْہَہٗ" الخ ترجمہ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اسکا چہرہ، اسی کیلئے فرمانروائی ہے اور تم اسی کیطرف لوٹائے جاؤ گے۔ (سورۂ قصص آیت ۸۸) اسمیں ہر چیز کے فنا کے اعلان کے ساتھ بھی استثنیٰ موجود ہے۔ "اِلَّا وَجْہَہٗ" اسکا چہرہ۔ جسکا مطلب یہ ہی ہوا کہ ہر چیز تو فنا ہو جائیگی لیکن اسکا چہرہ باقی رہ جائیگا۔ سورۂ الرحمٰن میں ارشاد ہوا کہ، ہر ایک فنا ہونے والا ہے صرف تیرے رب کا چہرہ جو صاحبِ عظمت و اکرام ہے، باقی رہ جائیگا۔ (سورۂ الرحمٰن آیت ۲۶/۲۷)۔ اس آیت میں بھی استثنیٰ "وَیَبْقیٰ وَجْہُ رَبِّکَ" موجود ہے۔ اب اگر "وجہ" کا ترجمہ یہاں پر بھی "چہرہ" کیا جائے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ پروردگارِ عالم صاحبِ جسم ہے۔ اور اسکے اعضاء و جوارح بھی ہیں۔ جس میں سے صرف "چہرہ" باقی رہ جائیگا۔ تو گیا خدا کے ہاتھ، پاؤں، سینہ، پنڈلیاں، پیٹھ اور گردن وغیرہ (معاذ اللہ) فنا ہو جائیں گے اور صرف چہرہ ہی باقی رہ جائیگا؟ تو یہ توحید باری تعالیٰ کی معرفت ہے یا توہین۔ اسکا صرف چہرہ تو باقی رہ جائیگا اور اس کے دیگر اعضاء (جسکا عقیدہ رکھنا کفر ہے) فنا ہو جائیں گے۔ اور آیت میں ہر چیز کے فنا کے ذکر میں استثنیٰ " اسکا چہرہ" وجہ باقی رہ جائیگا تو آیئے، دیکھتے ہیں کہ تفسیرِ اہلبیتؑ میں "وجہ" کے کیا معنی بیان ہوئے ہیں۔

"عبدالسّلام بن صالح ہروی نے حضرت امام رضا علیہ السّلام سے عرض کیا کہ اُے فرزندِ رسُول اِس حدیث کا کیا مطلب ہے جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کے پڑھنے کا ثواب "وَجہُ اللّٰہ" کی زیارت کے برابر ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا، اُے ابو الصّلت! جو شخص لوگوں کیطرح اَللّٰہ کا چہرہ ثابت کرے وہ کافر ہے۔ ہاں اللّٰہ کے نبی و رسُول اور اسکے حجج علیہم السّلام، اللّٰہ کے "وجہ" ہیں۔ کیونکہ یہ وہی ہیں جنکی بدولت اللّٰہ کے دین اور اسکی معرفت کی توفیقات حاصل ہوتی ہیں۔ اور آیت میں اَللّٰہ کا "وجہ" باقی رہیگا۔ اس سے یہی مراد ہے (اَنوار النجف جلد ۱۳ ص ۱۸۳)

تو اس سے یہ اَمر وَاضح ہوا کہ "وجہ" کے معنی سبب کے نکلیں اور اَنبیاء و رسل، اَولیاء اللّٰہ اُسکی معرفت و بندگی کا خلق میں ذریعہ اور سبب بنے۔ تو "وَجہُ اللّٰہ" کے معنی خدا کا چہرہ نہیں ہوسکتا اِسلئے کہ خداوند عالم جسم نہیں رکھتا لہٰذا "وجہ اللّٰہ" کے معنی خدا کی معرفت و بندگی کا سبب، اور ظاہر ہے کہ ان اُمور کے اظہار کے اَسباب انبیاء و رسل اَور اَولیاء اللّٰہ ہی ہیں۔ اَور یہ بیان مذکورہ کلام کے بھی منافی ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم تمام اشیاء کے فنا کے ذکر میں اپنی ذات کا استثنیٰ فرما رہا ہے جبکہ حاکم کے حکم و فرمان کا اِطلاق اس کے محکوم پر ہی ہوتا ہے اُسے اپنی ذات کیلئے اِستثنیٰ قرار دینے کی حاجت نہیں رکھتا البتہ محکوموں میں سے کسی گروہ، کسی فرد کو علٰحدہ کرنا مقصود ہو تو پھر استثنیٰ کا ذکر لازم ہوتا ہے۔ مزید توضیح اور بھی ملاحظہ فرمائیں "۔ امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا کہ "اِلَّا وَجہُ" سے مراد دینِ خدا، رسولِ خدا صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ وَسلّم اور اَولیاء اللّٰہ، اور اہلبیتِ کرام ہیں۔ جو "وَجہُ اللّٰہ" عَینُ اللّٰہ اور لِسانُ اللّٰہ ہیں"۔ وجہ اللّٰہ اِس سبب سے کہ انکے ذریعے سے ہی خدا تک رسائی ہوتی ہے"۔ (مجمع الآیات ص ۶۳) اِن وَضاحتوں کے بعد بھی اگر یہی ضِد ہے کہ "وجہ" کا ترجمہ چہرہ ہی کیا جائے تو میں اِسے بھی قبول کرنے کو تیار ہوں۔ جیسا کہ ابتدائی اَوراق میں یہ حدیث مذکور ہوئی ہے کہ "جب بندہ مستحبات کے ذریعے مجھ سے قریب ہوتا ہے تو میں اسکے ہاتھ، پاؤں، زبان، آنکھ اَور کان بن جاتا ہوں۔ اَلخ۔ (حدیث) یہ عام اَفرادِ اُمّت کیلئے ارشاد ہوا، لیکن پیغمبرؐ کیواسطے ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ آپؐ

لسان اللہ، عین اللہ، اذن اللہ اور ید اللہ ہیں اور یہ تمام اعضاءِ انسانی، انسان کی شناخت و معرفت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور چہرے سے ہی انسان کی شناخت ہوتی ہے۔ اب پروردگار عالم کا یہ ارشاد کہ "تمام اشیاء فنا ہو جائیں گی لیکن اسکا چہرہ باقی رہ جائیگا تو اِسکے یہی معنی ہوئے کہ جن ہستیوں کیوجہ سے خدا پہچانا گیا وہ باقی رہ جائیں گے اور چہرہ پر آنکھ، کان اور زبان ہی ہوتی ہے اور ان سب کے مجموعہ کو چہرہ کہا جاتا ہے تو اب پیغمبرِ اکرمؐ بہ نصِّ قرآنی ید اللہ، لسان اللہ، عین اللہ اور اِذن اللہ ہیں اور ان مذکورہ صفات کو یکجا کیا گیا تو "وجہ اللہ" ہونے کی حیثیت ثابت ہوئی تو آپؐ ہی "وجہ اللہ" ہیں جبکہ آیت میں "وجہ" کیلئے فنا کی نفی ہے یعنی اِستثنار ہی جس سے آپکیؐ حیات بحیثیت وجہ نصِّ قرآنی سے ثابت ہے۔ اور تمام اشیاء کے فنا میں آپؐ کیلئے بحیثیت وجہ فنا ممکن نہیں۔ اِسلئے امّت کے تمام نفوس کی بقا اور فنا کیساتھ نہ تو سرکارِ دو عالم کو شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان لوگوں کیساتھ آپکا ذکر کوئی مستحسن فعل قرار دیا جا سکتا ہے۔

جیساکہ آنحضرتؐ نے اپنی حیات و موت کے ضمن میں فرمایا کہ میں نے لقائے رب کو پسند فرمایا یعنی مرضی و منشاءِ الٰہی کی قربت میں خود کو سپرد کر دیا اِسکی مزید وضاحت سورۂ الفجر کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔ "یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً الخ (سورۂ فجر آیت ۲۷ تا ۳۰) ترجمہ:۔ اے نفسِ مطمئن پروردگار کیطرف واپس لوٹ آ، اِس شان سے کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ (یعنی پروردگار) تجھ سے راضی ہے، پس میرے (خاص بندوں) میں شامل ہو جا اور میری جنّت میں داخل ہو جا"۔ عالمِ اہلسنّت زمخشری نے تفسیرِ کشاف میں روایت کی ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہؓ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اور امام سیوطی نے تفسیرِ درِ منثور میں حضرت بریدہؓ سے یہی روایت کی ہے اور بعض مفسّرین نے حضرت علیؑ اور حسین ابنِ علی علیہ السّلام کو بھی اس کا مصداق قرار دیا ہے اور اس میں اچنبھے اور گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں، اس لئے کہ پروردگار عالم نے حضرت علیؑ کو قرآن مجید میں نفسِ رسولؐ فرمایا ہے۔ اور حضرت امام حسین علیہ السّلام کو رسُولؐ کا فرزند قرار دیا ہے۔ جب یہ ذواتِ مقدّسہ پروردگارِ عالم

کے فرمان "نفسِ مطمئنّہ" کے مصداق ہیں تو رسُولِ اکرم اس آیت کے اَرفع و اَعلیٰ مصداق ہیں اسلیئے کہ آپؐ ہی کی بدولت اور آپ ہی کی اِتّباع و پَیروی کیوجہ سے یہ حضرات اس منزلِ رَفیع پر فائز ہوئے۔ تو ثابت ہوا کہ آپؐ کا نفس باحیات ہے۔ اور جنّت میں داخل ہوجانے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ معاذ اللہ آپؐ جنّت میں مقیّد کردیئے گئے ہیں اور کائنات کے دوسرے حصّے سے آپکا تعلّق منقطع ہوگیا ہے۔ آپؐ عالمین کے لئے رَحمت و نَذیر ہیں۔ اِس لئے آپؐ کا اِسس کائینات میں کسی نہ کسی حیثیت سے وجود لازم ہے۔ چنانچہ اِبنِ کثیر نے جہاں اس آیت کے مُختلف مصداق بیان فرمائے ہیں، یہ واقعہ بھی ذکر کرتے ہیں۔" اِبنِ اَبی حاتم میں یہ روایت بھی ہے کہ جب عبداللہ ابنِ عباسؓ کے چچازاد بھائی کا طائف میں اِنتقال ہوا تو ایک ایسا پرندہ آیا کہ اس جیسا پرندہ زمین پر دیکھا نہیں گیا۔ وہ نعش میں چلا گیا پھر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ جب آپ کو دفن کردیا گیا تو قبر کے کونے سے اسی آیت کے تلاوت کی آواز آئی اور یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کون پڑھ رہا ہے۔ اَبو ہاشمؒ قباث بن رزین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنگِ روم میں ہم دشمنوں کے ہاتھوں قید ہوگئے۔ شاہِ رُوم نے ہمیں اپنے سامنے بلایا اور کہا! یا تو تم اس دین کو چھوڑ دو یا قتل ہونا منظور کرلو۔ ایک ایک کو وہ یہی کہتا کہ ہمارا دین قبول کرو، ورنہ جلّاد کو حکم دیتا ہوں کہ تمہاری گرد نیں مار دے۔ تین اَفراد مُرتد ہوگئے۔ جب چوتھا شخص آیا تو اُس نے صاف اِنکار کردیا۔ بادشاہ کے حکم سے اسکی گردن ماردی گئی اور اس کے سر کو نہر میں ڈال دیا گیا۔ وہ نیچے ڈوب گیا اور پھر ذرا سی دیر کے بعد پانی کے اوپر آگیا اور ان تینوں (مرتدین) اَفراد کیطرف دیکھ کر کہنے لگا، اَے فلاں، اَے فلاں اُنکے نام لیکر انھیں آوازیں دیں جب یہ متوجّہ ہوئے اور درباری لوگ بھی اُسے دیکھ رہے تھے اور خود بادشاہ بھی تعجّب کیساتھ سُن رہا تھا۔ اس مسلمان شہید کے سر نے کہا سُنو! خدائے تعالےٰ فرماتا ہے "اَے نفسِ مطمئن تُو اپنے رَبّ کی طرف لَوٹ چل، اِسطرح کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے خوش۔ پس میرے خاص بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنّت میں چلا جا" اتنا کہہ کر وہ سَر پھر پانی میں غوطہ لگا گیا۔ اس واقعہ کا اتنا اچّھا اثر ہوا کہ قریب تھا کہ تمام نصرانی اسی وقت مسلمان ہوجاتے،

لیکن بادشاہ نے اسی وقت دربار برخاست کرا دیا اور تینوں افراد پھر مسلمان ہوگئے۔ اور ہم سب یونہی قید میں رہے۔ آخر خلیفہ ابو جعفر منصور کیطرف سے ہمارا فدیہ آگیا اور ہم نے نجات پائی۔" (تفسیر کثیر جلد ۵ ص۵۹۵) .... جب اُمّت محمدیہ میں عام شہداء کے حیات کی یہ منزل ہے کہ سر بدن سے جدا ہو جانے کے بعد بھی ڈوب کے اُبھر سکتا ہے۔ اور کلام بھی کرسکتا ہے تو پھر آپکے اہلبیت تو بہر طور اُمّت سے ارفع و اعلیٰ ہیں اگر امام عالیمقام حضرت حسین ابن علی علیہ السّلام کے کٹے ہوئے سر نے سورۂ کہف کی تلاوت کی تو اس میں حیرانی و پریشانی کا کیا مقام ہے یہی تو وہ حیاتِ جاوید ہے جو پروردگار عالم نے شہیدوں کو عطا کی ہے۔ تو جب حیاتِ شہداء ثابت ہے اور روح کا ایک بدن سے نکل جانے کے بعد کٹے ہوئے اور ڈوبے ہوئے سر نے سطح آب پر اُبھر کر تلاوتِ قرآن مجید کیا۔ تو اب اس موت وحیات کی کتنی قسمیں ہوئیں ؟ اور جب ایک اُمّتی (شہید) کا مرنے کے بعد بھی اپنے جسم پر اختیار و تصرّف، اور اس دُنیا سے تعلق برقرار ہے تو کیا رسُول اکرم کی حیثیت و اختیار اس شہید کے اختیار و تصرّف سے بھی (معاذ اللہ) کم تر ہے کہ آپؐ انتقال کے بعد فنا ہو گئے اور اس عالم سے آپکا کوئی تعلق باقی نہ رہا۔ چنانچہ حیاتِ پیغمبرؐ کی نصّ سورۂ احزاب کی اس آیت میں بھی موجود ہے " یقیناً خدا اور اس کے ملائکہ، پیغمبرؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے صاحبانِ ایمان تم بھی درود بھیجتے رہو اور اچھی طرح سلام بھی بھیجتے رہو۔" (سورۂ احزاب) " سَلِّمُوا تَسلِیمًا " کا ترجمہ اچھی طرح سلام کرتے رہو۔ یا برابر سلام بھیجتے رہو۔ اس سے بہتر تو اُردو ترجمہ یہ ہونا چاہیئے کہ تم بھی درود بھیجتے رہو اور سلامتی چاہو جو (حق ہے) سلامتی کا۔ بہرطور جو بھی ترجمہ کیا جائے نبیؐ پر درود بھی بھیجا جائے۔ اور آپ کو سلام بھی کیا جائے۔ اب اگر اس باطل نظریے کے تحت اس آیت پر غور کیا جائے کہ رسُول (معاذ اللہ) فنا ہو چکے ہیں تو پروردگار عالم اپنے ملائکہ سے کیا فعلِ عبث کی فرمائش کر رہا ہے کہ تم سب اپنے نبیؐ پر درود و سلام بھیجو جو کہ وفات یافتہ ہے اور مومنین سے بھی اسکی فرمائش ہی نہیں بلکہ حکم ہے۔ تو کیا پروردگار عالم، اُسکے ملائکہ اور مومنین یہ فعلِ عبث کر رہے ہیں کہ ایک ایسے وجود کے لئے جو ۱۱ھ میں (معاذ اللہ) فنا ہو چکا ہے اسپر درود بھیج رہے ہیں، اور پھر خداوند عالم

باوجود علیم وحکیم ہونے کے اِس فعلِ عبث میں شامل ہے ؟ تولا محالہ یہ ماننا پڑیگا یہ ذاتِ مقدّس باحیات ہے جس پر درود وسلام بھیجا جارہا ہے۔ اور اگر واقعی کسی فانی وجود پر اسی طرح خداوند عالم اس کے ملائکہ اور مومنین درود وسلام بھیجنے لگیں تو یقیناً وہ وجود اگر فانی بھی ہو تو بقائے دوام سے ہمکنار ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ ان خارجیوں نے اپنی عادت وفطرت کے تحت اس آیۂ درود کے معنی ومطالب اور مصداق میں بھی تحریف سے گریز نہیں کیا۔ لیکن انکی تحریف کے باوجود علمائے حق نے جو اس کی تفسیر ومصداق بیان فرمائیں ہیں ان میں سے چند روائتیں بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مواہب لدنیہ میں ہے کہ آنحضرتؐ نماز میں یوں فرماتے تھے' اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ ط صواعقِ محرقہ میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا! مجھ پر ناقص درود نہ بھیجا کرو۔ لوگوں نے عرض کیا' ناقص درود کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا' اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ ـــــــــ کہہ کر رک مت جایا کرو کیونکہ یہ ناقص ہے بلکہ یوں کہو' اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ' اور امام شافعی کا یہ ارشاد اسکے مصداق کیلئے کافی ہے' آپ فرماتے ہیں "اے اہلبیتِ رسولؐ' خدا نے تمہاری محبت قرآن میں فرض کردی ہے۔ تمہاری عظمت وبزرگی کے لئے یہی کافی ہے کہ نماز میں جو شخص تم پر درود نہ بھیجے اُس کی نماز ہی صحیح نہیں۔" (درمنثور جلد ۵ صفحہ ۲۱۶)۔

عماد الدین ابنِ کثیر نے اِس آیت کی تفسیر سات صفحات میں بیان کیں ہیں۔ لیکن اپنی عادت کے بموجب روایات پر بلاوجہ یا تو تنقید کی ہے یا پھر اسے قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اور بعض مقامات پر تو علماء کے قول پر بھی بے اعتباری کا اظہار فرمایا ہے۔ مگر جن اقوال کو انھوں نے قبول کیا ہے وہی میری اس مدّعا کے اثبات کے لئے کافی ہیں۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:- "الغرض درود کا نماز میں واجب ہونے کا قول بہت ظاہر ہے اور حدیث میں اسکی دلیل بھی موجود ہے اور سلف وخلف میں امام شافعی کے علاوہ اور ائمہ بھی اس کے قائل رہے ہیں پس یہ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں کہ امام صاحب موصوف ہی کا یہ قول ہے' اور یہ خلاف اجماع ہو۔

اِسکی تائید اس صحیح حدیث سے بھی ہوتی ہے جو مسند احمد، ترمذی، اُبو داؤد، نسائی، ابن خزیمہ اور ابنِ عباس وغیرہ میں ہے کہ حضور سُن رہے تھے، ایک شخص نے بغیر خدا کی حمد وثناء کے اور بغیر حضوؐر پر دُرود پڑھے اپنی نماز میں دُعا کی تو آپؐ نے فرمایا، اس نے بہت جلدی کی یا کسی اور کو فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو پہلے اللہ کی تعریف کرے پھر دُرود پڑھے۔ پھر جو چاہے دُعا مانگے۔ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں اور خدا کے ذکر اور دُرود کے بغیر اُٹھ کھڑے ہوں وہ مجلس قیامت کے دِن ان پر وبال ہو جائیگی اگر خدا چاہے تو ان پر عذاب کرے چاہے معاف کر دے۔" (تفسیر ابنِ کثیر جلد ۴ صد ۱۳۱) ۔ اَب خارجیت کی اَفراط و تفریط بھی ملاحظہ فرمائیے۔ کہ آیت دُرود میں پہلے تو آنحضرتؐ اور انکی آلؑ کے ساتھ، اَزواج و اَصحاب اور تمام اُمّت کو لفظ اَجمعین کہہ کر شامل کر دیا۔ اور یہ اصحاب و اَزواج یعنی ان ذاتِ مقدّسہ کی دُرود میں شمولیت، ان کی اُمّہات المومنین اور اصحابِ پیغمبر رضوان اللہ تعالیٰ اَجمعین سے کسی مخلصانہ عقیدت و محبّت کی بناء پر نہیں تھا بلکہ امّت میں پیغمبرؐ اکرم کی ایک مخصوص فضیلت اور اِمتیازی شان میں دوسروں کو شریک کر کے ان فضیلتوں کو سُبک اور عام کر کے اسکی عظمتوں کو پامال کرنا تھا، جس کی سب سے بڑی دَلیل یہ ہے کہ اَب جو مواد خارجی مکتبِ فکر سے چھپ کر آرہا ہے اسمیں آنحضرتؐ کیساتھ نہ تو آپکی صلعم آلؑ کا ذکر ملتا ہے اور نہ ہی ازواج و اَصحاب کا۔ اَب صرف یہ جملہ لکھا جارہا ہے آنحضرت "سلّم" اسکے بعد بھی توہینِ رسُول کے جذبات انکے آسودہ نہیں ہوئے بلکہ اَب تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ساتھ "صلّے اللہ علیہ وسلّم کی عبارت کو بھی حذف کر کے اتنا مخفّف کر دیا گیا ہے کہ اس کے معنی میَں تو نہیں سمجھ سکتا۔ قارئین کرام سمجھنے کی کوشس کریں۔ صائم چشتی صاحب حنفی رقمطراز ہیں "یہ واقعہ اسوقت پیش آیا جب میں پہلی مرتبہ حرمین شریفین زاد اللہ شرفہا کی زیارت سے ۱۹۷۴ء میں مشرّف ہوا۔ حکومت سعودیہ پاکستانی حجاج پر خاص طور پر مہربان ہے۔ انھیں دیگر مراعات کے ساتھ اپنے عقائد کی دولت سے مالامال کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے مبلّغین وہابیہ کے لئے صحنِ حرم میں کرسیاں

بچھا دی جاتی ہیں اور حجاج کرام کو طوافِ حرم کی زحمت سے بچانے کیلئے سلسلۂ وعظ و تبلیغ شروع کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مبلّغین حضرات جو باتیں ارضِ پاکستان میں اپنی زبان پر لانے کی جرأت و جسارت سے محروم ہیں وہاں بلا خوف و خطر بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور سامعین حضرات یا تو انکے دامِ تبلیغ میں مکمل طور پر گرفتار ہو جاتے ہیں یا پھر دل مسوس کر رہ جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
مبلّغین حضرات وہاں کیا کیا گل افشانیاں کرتے ہیں تفصیل کے لئے یہ کتاب متحمّل نہیں ہو سکتی۔ صرف ایک ہی واقعہ نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے جو جناب سیّدۃ النّساء العالمین فاطمۃ الزہراؑ کی ذات والاصفات سے وابستہ ہے۔ ایک مُبلّغ صاحب نے دورانِ تبلیغ قبر کی سختیوں سے ڈراتے دھمکاتے ہوئے حجاج کرام کو بتایا کہ جب پیغمبر "صلاّسلّم" (ان لوگوں نے صلّی اللہ وعلیہ وآلہ وسلّم، کا مخفّف "صلاّسلّم" بنا رکھا ہے۔ خدا جانے اس کے کیا معنی بنتے ؟) کی بیٹی فاطمہؑ کو قبر میں اُتارا گیا تو قبر سے آواز آئی، فاطمہؑ میں قبر ہوں، یہاں یہ مان گمان لیکر نہ آنا کہ میں نبیؐ کی بیٹی ہوں اگر تیرے عمل اچھےؐ ہوئے تو فبہا ورنہ میں یہ نہیں دیکھا کرتی کہ مجھ میں داخل ہونے والا کون ہے، وغیرہ وغیرہ۔ میرے ایک ساتھی جو میرے ساتھ کھڑے تھے متحیّر ہو کر مجھ سے پوچھنے لگے کیا یہ واقعہ درست ہے جو مولوی صاحب نے بیان کیا ہے ؟ میں نے کہا آؤ اسی سے پوچھ لیں، جب وہ تقریر کر کے باہر آیا تو اسے روک کر ہم نے اس سے متذکرہ بالا روایت کے بارے میں سوال کیا۔ قارئین یاد رکریں کہ اسکا رنگ یوں فق ہو گیا تھا جیسے چہرے پر پھٹکار برس رہی ہو حالانکہ میں نے اس سے صرف یہ سوال کیا تھا کہ تمہارے عقیدے کے مطابق تاجدارِ انبیاء صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نہ تو حیات ہیں اور نہ ہی کسی کو جانتے پہچانتے ہیں اور نہ ہی کسی کی فریاد سنتے ہیں، اور معاذ اللہ مر کر مٹّی میں مل چکے ہیں۔ اور تم یہ بتا رہے ہو کہ سیّدۃ النّساءؑ العالمین کے قبر کی مٹّی یہ آواز دے رہی ہے یا دے رہی تھی کہ فاطمہؑ ہوش سے آنا میں قبر ہوں، ہمیں صرف یہ بتا دو کہ جناب فاطمہؑ نے بھی قبر کی یہ آواز سنی تھی یا نہیں۔ اور دوسری بات یہ بتا دو کہ جس صحابی نے قبر کی یہ آواز اپنے کانوں سے سُن کر یہ روایت بیان کی ہے وہ اسوقت جنابِ سیّدہؑ کے جنازے میں شریک تھا یا نہیں

اور اگر وہ شریک تھے تو کوئی ایسی روایت دکھا دو جس میں جناب سیدہؑ کے جنازے کے شرکائیں ان کا نام بھی آیا ہو۔ اور یہ بھی بتا دینا کہ قبر کی اس آواز کو صرف انھوں نے ہی سنا تھا یا دیگر لوگوں نے بھی۔ اس نے انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں پہلے تو کانپتے ہوئے یہ کہا کہ اس وقت میرے پاس کتابیں موجود نہیں ہیں۔ کل مغرب اور عشاء کی نماز کے درمیان حوالہ پیش کر دونگا۔ ہم نے کہا حضرت کتابیں ہم خود تلاش کریں گے آپ صرف یہ بتا دیں کہ ہمارے سوالوں کے جوابات کس کس کتاب میں موجود ہے۔ مگر اس نے پھر بھی یہی جواب دیا، کہ میں یہ سب کچھ کل ہی بتا سکوں گا۔ اس کے اس جواب لاجواب نے ہمیں واقعی لاجواب کر دیا۔ ہم اس واقعہ کے بعد تقریباً دو مہینے مکہ معظمہ زاد اللہ شرفہا میں مقیم رہے لیکن اس عرصے میں وہ شخص کرسی وعظ پر تو کیا نظر آتا پورے حرم میں کہیں نظر نہ آیا۔ ایسی بے سروپا اور خود ساختہ غلط سلط روایتوں سے جناب سیدہؑ معصومہ کی شانِ اقدس میں کی جانیوالی گستاخیاں سوائے نامرادی اور محرومئ ایمان کے اور کچھ نہیں دے سکتیں۔ اہلِ اسلام کو چاہیئے کہ اس مقدس ہستی کا احترام واکرام کرنا سیکھیں جس طیب و طاہر اور پاک ہستی کے اکرام کیلئے تمام انبیاء و مرسلین کے سرتاج کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔" (البتول ص۲۴۴ از صائم چشتی) تو قارئین نے غور فرمایا کہ آنحضرت کے نام کیساتھ صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھنا ان خارجیوں کو گوارہ نہ ہو سکا اور اسکی جگہ پر ایک بے معنی لفظ "صلاسلم" اختراع کیا گیا پھر ان لوگوں کی منافقانہ فطرت و طبیعت حیاتِ سرکارِ دو عالم کے عقیدے کی کیونکر قائل ہو سکتی ہے جبکہ جناب ختمی مرتبت کا ذکرِ خیر بھی انھیں گوارہ نہیں تو پھر انکی منافقانہ روش اور بگڑی ہوئی طبیعت سے کسطرح حضور اکرم کی اولاد کے حق میں حقیقت پسندی اور احترام کی توقع کیجا سکتی ہے چنانچہ درود و سلام کے بارے میں آپکی سنت جناب فاطمۃ الزہراءؑ بیان فرماتی ہیں کہ "جب آنحضرتؐ مسجد میں جاتے تو درود و سلام پڑھ کر "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ" پڑھتے اور جب مسجد سے نکلتے تو درود و سلام کے بعد "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ فَضْلِکَ" پڑھتے، حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ جب مسجد میں جاؤ تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھا کرو۔" (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص۳۲)۔ پاکستان جیسے اسلام کا قلعہ کہا

جاتا ہے اور جبکا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ پاکستان میں جو مسجدوں سے اذان کے قبل اور بعد نبیؐ پر
دُرود و سلام پڑھا جاتا ہے' ایک گروہ اسے بھی بند کروانے کیلئے کوشاں ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر
یہ گروہ مسلم امّت میں شامل ہیں تو اسے سیرتِ صحابہ، سنّتِ نبویؐ سے بُغض کیوں ہیں اور ذکرِ رسُولؐ انکے افکار و
اذہان اور طبیعتوں پر بارِ گراں کیوں ہے؟ جہانتک توحید پرستی کا تعلق ہیں تو پروردگارِ عالم نے اذان و نماز،
تشہد تک میں پیغمبرِ اکرمؐ کے نامِ نامی کو شامل کر رکھا ہیں۔ اور دُرود و سلام ہی صرف ایک ایسی عبادت ہے جس
میں پروردگارِ عالم بھی معہ اپنے فرشتوں اور مومنین کے شامل ہے پھر یہ کیسے توحید پرست اور مسلمان ہیں جو حضورؐ
اکرم پر دُرود و سلام کے مخالف ہیں چنانچہ سورۂ الضحیٰ میں ارشاد ہوتا ہے "قسم ہے دِن کے گرم وقت کی
اور قسم رات کی جب چھا جائے۔ نہ تو تیرے رب نے تجھے (تنہا) چھوڑا ہیں اور نہ ہی وہ (تجھ سے) ناراض
ہے" (سورۂ الضحیٰ آیات ۱ تا ۳) اس سورہ میں حیاتِ پیغمبرؐ کے ساتھ عصمتِ پیغمبرؐ کی وضاحت موجود ہے،
کہ جب حضورؐ اکرم کبھی بھی خدا کی معیت سے دُور نہیں ہمہ وقت آپکا پروردگار آپکے ساتھ ہیں تو پھر جو
ذات ہر وقت اپنے رب کی نگاہوں میں ہو تو اسیر نہ ہی ہوا و ہوس، اور نہ ہی بشری فطرت و تقاضے کا غلبہ
ہو سکتا۔ جتنے امور اور ارشادات ایسے بشر سے صادر ہونگے وہ تمام کے تمام منشاءِ الٰہی کے تحت ہونگے
جسمیں نسیان و خطا کی بھی قطعی گنجائش نہیں، ان محکم آیات کی موجودگی میں اگر روایتیں اس کیخلاف پائی
جائیں تو وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں بلکہ انکار کر دینا ہی اسلام و ایمان کا تقاضہ ہے۔

دوسرے یہ کہ پروردگارِ عالم کا روزِ روشن اور شبِ تار کی قسم کھا کر یہ فرمانا کہ تیرے رب نے
کبھی نہ تو تجھے تنہا چھوڑا ہیں اور نہ ہی وہ آپ سے کبھی ناراض ہوا۔ اس فرمان کی روشنی میں یہ امر واضح
ہے کہ جب سے رات دِن کا وجود ہوا، پروردگارِ عالم آپ کے ساتھ ہیں۔ اور آپؐ پروردگارِ عالم
کی نگاہِ قدرت میں ہمہ وقت محفوظ ہیں، یعنی رات اور دِن کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس سے
پروردگارِ عالم کی معیّت کی نفی ہو سکتی ہو۔ تو اب اگر انتقالِ پیغمبرؐ کو بھی عام موت (فنا) پر گمان
کیا جائے تو پھر "نہ تو تیرے رب نے تجھے چھوڑا ہے اور نہ ہی ناراض ہوا ہے" یہ نظریہ کے موت کے
بعد مٹی ہو کر فنا ہو گئے (معاذ اللہ) تو پروردگار کی معیّت کا کیا بنا؟ اب بھی آپؐ کا پروردگار

آپ کے ساتھ ہے یا نہیں ؟ اگر پروردگارِ عالم کی ہمراہی میں آپ کی موت، جلاوطنی کا سبب بنگئی ہو
اور آپ اب قبر کی تاریکی میں تنہا ہیں تو پھر خدا کا یہ کہنا کہ "میں نے آپ کو چھوڑا نہیں"، اِسکی کیا
تاویل ہے یا ہوگی ؟ اور آج بھی خدا آپ کے ساتھ ہے یا نہیں ؟ اگر نہیں ہے تو ماضی کے ذکر
کے بعد مستقبل کے لئے اِستثنیٰ نہیں ہے جس کے معنی ہوئے کہ آج بھی آپ کے وجود کیساتھ
وجودِ قدرت ساتھ ساتھ ہے۔ اور یہ فانی وجود کے لئے ممکن نہیں۔ اس کے معنی یہی ہوئے کہ آپ
جہاں بھی ہیں اپنے وجود کے ساتھ ہیں۔ اور نگاہِ قدرت یا وجودِ باری تعالیٰ آپکے وجود پر شاہد ہے۔
اور اس کائنات میں جہاں تک ربّ العزت کی خدائی "ربّ العالمین" کی حیثیت سے ہے،
سرکارِ دوعالم کا وجود بھی بحیثیت "رحمۃ اللعالمین" کے موجود ہے صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم و اللّٰھم صلِّ
علیٰ محمّدٍ وّ آلِ محمّد ۔

وما علینا الّا البلاغ

مورخہ ۱۸ رمئی ۱۹۸۶ء
مطابق ۸ ررمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

احقر العباد
محمد مجتبیٰ طاہر کراچی

(تمّت بالخیر)